خیابانِ فاروقی

شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی کے مجلے

خیابان کا

طاہر فاروقی نمبر

ترتیب

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی
ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری

شمارہ ———————— ۱۰

اپریل ———————— ۱۹۸۰ء

شعبۂ اُردو ———————— پشاور یونیورسٹی

حمیدیہ برقی پریس — پشاور شہر

Rs. 40-00 60/-

ترتیب

۱	پیش لفظ	مرتبین	
۲	پیغام	جناب صاحبزادہ محمد زبیر، وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی	۷
۳	محمد طاہر فاروقی بقلم طاہر فاروقی (خود نوشت)	پروفیسر محمد طاہر فاروقی	۹
۴	فاضل بزرگ	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	۵۷
۵	طاہر فاروقی مرحوم	حکیم محمد سعید	۶۹
۶	طاہر فاروقی	پروفیسر نظیر صدیقی	۷۱
۷	پروفیسر طاہر فاروقی (معروف اقبال شناس)	پروفیسر صدیق جاوید	۸۰
۸	بزم ادب کا ایک روشن چراغ	پروفیسر حشمت جہاں ناز	۸۷
۹	اُستاد طاہر فاروقی (یادیں اور تاثرات)	پروفیسر محمد نذیر اشک	۹۰
۱۰	پروفیسر طاہر فاروقی کے علمی و ادبی کارنامے	کیپٹن سید واصف علی واصف	۹۷
۱۱	ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی (چند یادیں چند تاثرات)	پروفیسر عبدالعلیم صدیقی	۱۰۳
۱۲	شفیق و مہربان اُستاد	مولانا فضل معبود	۱۰۶
۱۳	یادِ رفتگان	پروفیسر ظہور احمد اعوان	۱۱۱
۱۴	مخزن اُردو	پروفیسر بیگم منور رؤف	۱۱۸
۱۵	جناب طاہر فاروقی کے ساتھ ایک شام	پروفیسر بشیر الدین	۱۲۴
۱۶	والدِ محترم	پروفیسر اطہر فاروقی	۱۳۰
۱۷	پروفیسر محمد طاہر فاروقی (چند یادیں)	پروفیسر نسیم حسین اختر	۱۴۵
۱۸	نقش کا رنگ ثبات	پروفیسر حسین اختر	۱۵۱
۱۹	استاد بزرگ پروفیسر محمد طاہر فاروقی	پروفیسر صادق زاہد	۱۵۹

۲۰	بیتے ہوئے کچھ دن	بیگم ارجمند انور فاروقی	۱۶۸
۲۱	کچھ یادیں کچھ باتیں	پروفیسر محمد انور فاروقی	۱۷۲
۲۲	آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔	پروفیسر سہیلہ فاروقی	۱۷۷
۲۳	محترم مہربان	پروفیسر افضل حسین اظہر	۱۸۳
۲۴	طاہر فاروقی کی سوانح نگاری	ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی	۱۹۳
۲۵	طاہر فاروقی کی شاعری	ڈاکٹر سید مرتضیٰ اختر جعفری	۲۰۲
۲۶	محمد طاہر فاروقی اور مکتوب نگاری	پروفیسر خاطر غزنوی	۲۰۹
۲۷	تنقید کا روشن مینار	پروفیسر عبدالستار جوہر پراچہ	۲۲۴
۲۸	سفر ترکی	پروفیسر محمد طاہر فاروقی	۲۴۱
۲۹	کلام طاہر	پروفیسر محمد طاہر فاروقی	۲۸۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

شعبۂ اُردو کے مجلّے "خیابان" کا طاہر فاروقی نمبر آپ کے سامنے ہے اس شمارے کو شعبے کے قدیم استاد اور سابق صدر جناب پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب مرحوم کی یاد کو تازہ اور جاوداں کرنے کے لیے ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ طاہر فاروقی صاحب نے اپنی پوری زندگی اُردو زبان و ادب کی خدمت کرتے گذاری وہ ایک منجھے ہوئے اُستاد، ایک شعلہ بیان مقرر۔ ایک عاشقِ رسول اقبال شناس ایک پُرمغز مقالہ نگار اور ایک اچھے شاعر تھے۔

۱۹۵۶ء میں جب پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کا آغاز ہوا تو وہ ایک اُستاد کی حیثیت سے شعبے کے ساتھ منسلک ہوگئے اور بعد میں ۱۹۶۲ء میں صدرِ شعبہ بنا دئے گئے۔ اور ۱۹۶۸ء یعنی پنشن تک اِس عہدے پر فائز رہے۔

طاہر فاروقی صاحب کا شمار مجلّۂ "خیابان" کے بانیوں میں ہوتا ہے اور "خیابان" کے چار شمارے اُن کی زیرِ نگرانی شائع ہوئے جن میں "اقبال نمبر" اور "پاکستانی ادب نمبر" علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئے اور بعد میں کتابی شکل میں شائع کئے گئے۔

فاروقی صاحب کا تعلق اِس شعبے کے ساتھ تاحیات قائم رہا۔ شعبے کو جب بھی اُن کے مفید مشوروں کی ضرورت پڑی وہ بہ نفسِ نفیس خود شعبے تشریف لاتے اور ہمارے مسائل کو سلجھانے کے لئے مشورے دیتے۔ اقبالیات کے سلسلے میں جب بھی ہم نے شعبے میں کوئی محفل سجائی تو فاروقی صاحب کبھی میرِ مجلس کی حیثیت سے اور کبھی مقالہ نگار کی حیثیت سے ضرور شریک ہوئے۔

فاروقی صاحب کی زندگی اور فن پر ملک کے سربرآوردہ ادیبوں نے مقالات لکھکر ہمیشہ کی طرح اس بار پھر ہمیں نوازا جس کے لئے ہم ان کے بے حد سپاس گزار ہیں۔

امید ہے آئندہ بھی وہ اسی محبت کا ثبوت دیکر ہمیں نوازتے رہیں گے۔ خیابانِ فاروقی کی اشاعت کو ممکن بنانے میں جن دوستوں اور کرم فرماؤں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہم اُنکے بے حد ممنون ہیں۔

فاروقی صاحب کے فکر وفن، شخصیت اور علمی کارناموں کو اُجاگر کرنے میں خیابان کا یہ شمارہ کس حد تک کامیاب ہوسکا، اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ خدا کرے آپ کو ہماری یہ سعی و کوشش پسند آئے۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی
ڈاکٹر سید مرتضیٰ اختر جعفری

شعبۂ اُردو
۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء

پیغام

محترمی مدیرِ خیابان، شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی

مجھے یہ جان کر بڑی مسرّت ہوئی ہے کہ آپ شعبۂ اُردو کے مجلے خیابان کا ایک مکمل شمارہ پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم سابق صدرِ شعبہ کی شخصیت اور کارناموں کے لئے مخصوص کر رہے ہیں، اور اس میں پاکستان کے علماء دانشوروں اور پروفیسر مرحوم کے دوستوں، رفیقوں، عزیزوں اور طالب علموں کے مقالات شامل کر رہے ہیں۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایک ایسی علمی اور ادبی شخصیت تھے جنکے خاندان نے صوبہ سرحد میں علم و ادب کے چراغ روشن کئے۔ ان کے والد اسلامیہ کالج پشاور کے ابتدائی دنوں میں کالج سے منسلک ہوئے اور اپنی شرافت اور علمیت کے باعث مقبول و معروف ہوئے۔ پروفیسر طاہر فاروقی مرحوم بھی اسلامیہ کالج میں درس دیتے رہے۔ پشاور یونیورسٹی کی انتظامیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ اور شعبہ اُردو کے قیام کے ساتھ ہی اس سے منسلک ہو گئے، گویا شعبہ اُردو کے قیام اور پیش رفت انہیں کی مرہونِ منت ہے۔

وہ لسانیات کے ماہر تھے۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر دسترس رکھتے تھے۔ اُردو میں کئی تالیفات و تصنیفات ان سے یادگار ہیں۔ مجلہ خیابان بھی ان ہی کے دور کی یادگار ہے۔

وہ عاشق رسول تھے اور انہوں نے سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

پر اپنے پاکیزہ جذبات پر مبنی ایک کتاب لکھ کر ایک عمدہ کام کیا۔ اقبالیات ان کا خصوصی میدان تھا۔ اور انہوں نے علامہ کی سیرت اور کارناموں پر "سیرتِ اقبال" کے نام سے اُس زمانے میں کتاب لکھی جب اقبالیات پر صرف دو ایک ادبی رسالوں نے نمبر ہی شائع کئے تھے۔ اور کتابیات کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا۔

وہ نصاب تعلیم کے ماہرین میں سے تھے۔ اور سرحد کے تعلیمی اداروں نے ان کی تالیفات سے بہت فائدہ اٹھایا۔

یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ایسی شخصیات کی زندگی اور کارناموں کو اہلِ علم کے سامنے پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ لائیں، جنہوں نے اپنی علمی صلاحیتوں سے کام لیکر معاشرے کی خدمت کی ہو۔

آپ کا یہ اقدام قابل ستائش ہے اور میں چاہتا ہوں کہ خیابان کا یہ شمارہ ایک قابل فخر دستاویز بنے اور لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ خدا آپ کے کام میں برکت دے۔

آپ کا

ص۔م۔ زبیر

(صاحبزادہ محمد زبیر)

وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

۲۵-۵-۸۰ء

محمد طاہر فاروقی

بقلم

پروفیسر محمد طاہر فاروقی۔ مرتبہ پشاور

در ماہِ فروری سنہ ۱۹۷۲ء

پیدائش، مقام اور تاریخ | رام پور (ریاست۔ یو پی) جمعرات کے دن ۱۴ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۹۰۵ء (صحیح تاریخ یہی ہے) جانے کس اتفاق سے امتحان کامل الٰہ آباد کی سند پر یہی ۱۴۔۱۹۰۴ء درج ہے۔ اس لئے بعد کو ملازمتوں میں یہی تاریخ رہی۔ لیکن بہرحال صحیح تاریخ وہی ہے جو میں نے شروع میں لکھی۔

وطن | آبائی واجدادی وطن بچھرایوں ضلع مرادآباد۔ یو پی ہے۔ میرا وطنِ پیدائش رام پور ہوا۔ بچھرایوں کو بھی شرعاً وطن کی حیثیت حاصل رہی۔ اور قیام کے لحاظ سے شرعاً اور قانوناً وطنِ ثانی کی شق میں ۱۹۴۸ء تک آگرہ اور اس کے بعد پشاور رہا۔ پاکستان کے دور میں پاکستان کی قومیت اور پشاور کی وطنیت حاصل ہیں۔

تعلیم | ۶؍ سات سال کا تھا کہ والد مرحوم (مولوی محمد محسن صاحب فاروقی پروفیسر عربی۔ اسلامیہ کالج پشاور ۱۹۱۳ تا ۱۹۳۰۔ وفات آگرہ ستمبر ۱۹۳۰) اپنے ساتھ اندور لے گئے، جہاں وہ کینیڈین مشن کالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس زمانے کی کوئی بات یاد نہیں سوا اس کے کہ کوڑیا گنج میں مکان تھا۔ رزیڈنس اسکول بھی کبھی شام کو کھیل دیکھنے جانا ہوا۔ ڈیلی کالج اور ہلکر کالج کی عمارتیں بھی دیکھیں۔ یاد ہے کہ شاندار تھیں۔ پولو کا میچ سب سے پہلے اندور ہی میں دیکھا اور بہت اچھا لگا۔ اور ہمیشہ دوبارہ دیکھنے کا ارادہ رہا۔

پروفیسر سید صغیر علی شاہ صاحب مرحوم ہلکر کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ والد سے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے گھر جانا خوب یاد ہے۔ بھائی صاحب مرحوم مولانا حامد حسن قادری انہی دنوں مہو چھاؤنی میں ملازم تھے۔ تو والد کے ساتھ وہاں جانا بھی یاد ہے۔ طاعون کی وجہ سے مہو کی زیادہ آبادی کیمپ میں تھی۔ اس کا حال قادری صاحب

لے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ ان دنوں میں والد ہی سے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھتا رہا ہوں گا۔ اور کیا!!

۲۔ ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج پشاور قائم ہوا تو پہلے ہی سال کے آغاز سے والد مرحوم وہاں پروفیسر عربی بن کر چلے گئے۔ ہم سب کو پھلواری میں آبائی گھر بھیج دیا۔ یہاں رہے۔ انہی دنوں والد نے چند احباب کے ساتھ مل کر پھلواری میں مسلم اسکول بنایا تھا۔ ابتدا میں تو میں نے گھر میں ایک حافظ صاحب سے پڑھا۔ تفصیل یاد نہیں۔ بعد میں اس اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ تیسری چوتھی اور پانچویں جماعت میں یہاں پڑھا۔ کلاس میں اچھے طالب علموں میں شمار کیا گیا۔ اُستادوں میں صرف اتنا یاد ہے کہ امام الدین صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ ایک ماسٹر اسمٰعیل صاحب تھے اور منشی ہربنس چند (؟) اُردو پڑھاتے تھے۔

۳۔ ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۷ء میں بھائی صاحبان (برادران عم زاد) عابد حسن فریدی اور حامد حسن صاحبان ہیڈ ماسٹر اور اُردو ٹیچر بن کر حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور گئے تو والد نے مجھے ان کے پاس بھیج دیا۔ دو سال کے قریب یہاں قیام رہا۔ اس دوران مدرسۂ الٰہیات اور مدرسہ دار العلوم میں تعلیم حاصل کی۔ الٰہیات میں مولانا آزاد سبحانی مرحوم اور مولانا عبد الحلیم صدیقی مرحوم سے استفادہ کیا۔ مجھ سے آگے اور کچھ بڑے تھے۔ مولانا عبد الماجد بدایونی مرحوم مگر الٰہیات میں ان کا بھی ساتھ رہا۔ ایک طالب علم ابو محمد تھے۔ میرے ہم سبق تھے۔ عمر میں بھی زیادہ تفاوت نہ تھا۔ اس لئے ان سے بے تکلفی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں میں اُردو ٹیچر بنکر حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور آیا ہوں تو حضرت ثاقب کانپوری سے نیاز حاصل ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ ابو محمد تھے۔ بڑا لطف آیا۔ ثاقب کا حسن اخلاق بالکل برادرانہ تھا۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں بڑی محبت سے میرا تذکرہ کیا ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

مدرسہ دار العلوم میں حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب مرحوم سے استفادہ کیا۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ملازم تھے۔ تعطیل میں آئے ہوئے تھے۔ جانے لگے تو اُن کے بھائی مولانا نثار احمد صاحب مرحوم وہی سبق پڑھانے لگے۔ ان دنوں مستقل درس الٰہیات میں ہوتے تھے۔ اور سہ پہر کو ایک سبق کے لئے یہاں آتا تھا۔ بعد میں مستقل مدرسہ دار العلوم کا طالب علم بن گیا۔ تو اساتذہ میں مولانا نثار احمد مرحوم کے علاوہ مولانا محمد سلیمان صاحب اور مولانا حبیب اللہ خان صاحب کا اضافہ ہو۔ اس زمانے کی نمایاں بات یہ یاد ہے کہ

مولانا حبیب اللہ صاحب نے شرح تہذیب اس طرح پڑھائی تھی کہ منطق کے سارے مسائل یوں مستحضر ہوگئے تھے کہ بعد میں قطبی وغیرہ پڑھیں تو پانی معلوم ہوئیں۔

۴۔ ۱۹۱۸ء میں والد مرحوم اپنے ساتھ پشاور لے آئے۔ دو سال یہاں رہا۔ ۱۹۲۰ء میں مولوی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے دیا۔ مولوی کا درس مختلف اساتذہ سے والد کی ہدایت کے مطابق حاصل کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے امتحان میں "مولوی" میں فرسٹ آیا۔ فرسٹ ڈویژن فرسٹ۔ بڑی حوصلہ بڑھانے والی بات تھی۔ مسٹر ہیٹنگ اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے خود آکر مبارکباد دی۔ اور کوٹھی پر میم صاحب سے ملانے کے لئے بلایا۔ میم صاحب نے انگریزی فرمائی۔ مجھے اس وقت انگریزی کی معمولی شد بد تھی۔ بعد میں والد مرحوم نے اپنے ساتھ کے پروفیسران کو بتایا تو پتہ چلا کہ میم صاحب کے سوالوں کے جواب میں نے اٹکل سے دیے مگر سب صحیح تھے۔

پرنسپل ہیٹنگ نے مسٹر گرانٹ چیف کمشنر پشاور کو راضی کیا کہ وہ مجھے فرسٹ آنے پر خصوصی انعام دیں۔ چنانچہ بہت سی عربی کی کتابیں خوب صورت جلدوں میں مجلد مسٹر گرانٹ کے ہاتھوں انعام پائیں۔ اسلامیہ کالج کے اورینٹل ہوسٹل کے باہر جو گراؤنڈ ہے (نئے گراؤنڈ عرصہ ہوا کالج کی عمارت کے سامنے بن گئے ہیں۔ اسی لئے یہ فٹ بال گراؤنڈ اور اس کے بعد نشیب میں واقع ہاکی گراؤنڈ بیکار پڑے ہیں۔ اب ۱۹۷۲ء کے ماہِ مارچ میں اس فٹ بال گراؤنڈ میں ایک قبائلی ہوسٹل بنانا تجویز ہوا ہے۔ سنگ بنیاد حال ہی میں رکھا گیا ہے) اسی میں کوئی میچ تھا۔ اس میچ کے انعامات کے ساتھ ہی مجھے یہ کتابیں انعام میں دی گئیں۔ یہ بات یاد ہے کہ کتابوں کا یہ پشتارہ مجھ سے اٹھتا نہ تھا تو کالج کے کسی طالب علم نے مدد کی اور کتابیں گھر پہنچائیں۔

پشاور کے اساتذہ کے نام یہ ہیں:-

(۱) مولانا قطب شاہ عباسی مرحوم ناظم دینیات۔ اسلامیہ کالج (ڈین صاحب)
(۲) مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم سابق ناظم کتب خانہ۔ اسلامیہ کالج پشاور
(۳) مولانا عبداللہ غزنوی صاحب مرحوم۔ اسلامیہ کالجیٹ اسکول پشاور
(۴) مولانا عبدالمجید افغانی صاحب مرحوم پروفیسر ایڈورڈس کالج پشاور
(۵) مولانا میاں عبدالعزیز صاحب مرحوم پروفیسر ایڈورڈس کالج پشاور

لطیفے کی بات یہ ہے کہ آخرالذکر دونوں بزرگوں سے پڑھنے کیلئے ریل میں صدر آنا ہوتا تھا۔ لڑکپن میں یہ خیر مستقل تفریح کا ذریعہ تھی۔ عبدالعزیز میمن صاحب عربی ادب کے ان جلیل القدر اکابر میں سے ہیں، جن کو عالمِ عرب میں بھی مستند گردانا جاتا ہے۔ دیگر اصحاب بھی جلیل القدر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ یہ لطف کی بات بھی یادگار ہے کہ ڈین صاحب قبلہ (مولانا قطب شاہ عباسی مرحوم) نے "سراجی" اتنی اچھی طرح پڑھائی تھی کہ پچاس سال گذرنے پر بھی اہم مسائل یاد ہیں۔ اور بارہ سال گذرنے پر تو یہ اچھی طرح یاد ہے کہ آگرہ کے بعض قانون کے طالب علم دوستوں نے کہا کہ وراثت کے یہ چند مسائل ہماری سمجھ میں نہیں آتے، بتادو۔ میں نے کچھ تامل کے بعد ان کو سمجھا دئے۔ چالیس سال سے زیادہ گزر گئے تھے کہ ایک اسلامی رسالے میں سوالات کے ذیل میں ایک توریث کا مسئلہ درج تھا۔ جواب میں مفتی صاحب سے سہو ہوا تھا۔ ایک محجوب الارث کو انہوں نے وارث قرار دیا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ان کو توجہ دلائی۔ ان کو اپنی بھول پر افسوس ہوا۔ اور انہوں نے رسالے میں میرا خط ہی چھاپ دیا۔ میں نادم ہوا مگر کیا کرتا۔ بہرحال یہ ڈین صاحب مرحوم کی تدریس کا کمال ہے۔ ان ہی دنوں مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم سے پڑھنے کے دوران مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ مولانا عبدالقادر صاحب مرحوم میرے ہم سبق رہے۔ وہ اسلامیہ کالجیٹ سکول میں اُس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ لیکن نجی طور پر عربی کا سلسلہ بھی تھا۔ مولانا عبدالقادر عمر میں مجھ سے شاید چند مہینے بڑے تھے۔ ۱۹۲۱۔ ۱۹۲۰ء کے اس زمانے کے بعد ان سے علی گڑھ میں ۱۹۳۰ء میں اوائلِ سرما میں مختصر ملاقات ہوئی۔ بڑی محبّت سے ملے۔ اب پاکستان میں اسلامیہ کالج پشاور میں اوائل ۱۹۵۰ء میں ملے اور بڑی خصوصیت ظاہر کی تو دیکھنے والوں کو تعجب ہوا کہ یہ کہاں کے پرانے مُلاقاتی نکلے؟

۵ ـ ۱۹۲۱ء میں تعطیل کلاں میں پشاور سے لوٹے تو سنبھل گئے۔ والدہ صاحبہ ماموں صاحب مرحوم کے پاس اُن دنوں سنبھل میں تھیں۔ پھر کچھ دن میں نے یہیں تعلیم حاصل کی۔ میاں سرائے جاتے ہیں یہ مدرسہ ہے۔ نام یاد نہیں رہا۔ شاید ہلالی سرائے کہتے تھے۔ مولانا جمیل احمد صاحب سے استفادہ کیا۔ مولانا خلیل احمد صاحب جن کے نام کو علی گڑھ کے تعلق سے شہرت حاصل ہوئی۔ اِن کے بڑے بھائی تھے۔ اسی

مدرسہ میں ۱۹۲۲ کے موسم گرما میں مولانا مشیت اللہ صاحب بدیوبندی سے جامع ترمذی کا درس لیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں آگرہ آگیا اور حضرت مولانا سعادت اللہ صاحب سے دورۂ حدیث میں شامل ہو کر تکمیل کی۔

۶۔ آخر میں تکمیل کے لئے آگرہ بھیجا گیا۔ بھائی صاحب یعنی عابد حسن فریدی صاحب مرحوم ۱۹۲۰ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں فارسی کے پروفیسر بن کر آگئے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں مجھے ان کی نگرانی میں پڑھنے کے لئے آگرہ بھیجا گیا۔ مدرسہ عالیہ آگرہ میں داخل ہوا۔ مولانا سعادت اللہ صاحب مرحوم مولانا حبیب اللہ خان مرحوم (پہلے ان سے کانپور میں شرف تلمذ حاصل ہوا تھا) اور مولانا فضل کریم صاحب بہاری استاد تھے۔ درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد دورۂ حدیث یہیں ہوتا لیکن مدرسہ محمدیہ میں مولوی سعید احمد مارہروی صاحب نے دورۂ حدیث جاری کیا۔ اور مولانا سعادت اللہ صاحب مرحوم کو وہاں بلایا۔ مجھے انہیں سے دورہ کرنا تھا۔ اسلئے میں بھی وہیں جا داخل ہوا۔ اسی طرح ہمارے بعض اور ساتھی بھی اسی درجے پر پڑھنے آگئے۔ ۱۹۲۴ء میں دورۂ حدیث مکمل کیا۔

۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر قاضی رحیم الدین صاحب مرحوم نے آگرہ میں اورینٹل ہومیو پیتھک اسکول قائم کیا۔

فریدی صاحب نے والد مرحوم کو لکھا تو انہوں نے حکم دیا کہ ضرور داخلہ کرادو چنانچہ میں اسکول میں داخل ہوگیا۔ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۵ء یہاں رہ کر HLMP اور HLMS دونوں امتحان پاس کئے۔ دونوں امتحانات میں فرسٹ آیا اور طلائی تمغے پائے۔ بعد میں غالباً اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اسکول کا شاندار کانووکیشن سینٹ جانس ہائی سکول کے میدان میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں دونوں برس کی سندیں اور انعامات حاصل کئے۔

اس جلسے میں میں نے ایک نظم بھی پڑھی تھی، جو بے حد پسند کی گئی تھی۔ یہ نظم میری "بیاض اشعار" میں شامل ہے۔

اس اجمالی تفصیل سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گھر کے اساتذہ یعنی والد ماجد پروفیسر محمد محسن فاروقی اور بھائی صاحبان (برادران عم زاد) پروفیسر حامد حسن قادری اور پروفیسر عابد حسن فریدی کو میری تعلیم و تربیت میں جو دخل رہا۔ وہ تو ظاہر ہے۔ مجھے

ان سے استفادہ اور بنیادی تعلیم کا بالخصوص زیادہ سے زیادہ موقع ملا۔ مگر ان حضرات کے علاوہ کیسے کیسے مشہور زمانہ اور جلیل القدر علماء سے درس لینے کا موقع ہاتھ آیا۔ کاش ان کے بحرِ علم کے چند قطرے ہی پی سکا ہوتا۔ اب بھی جو کچھ ہے انہی ہستیوں کی جلالتِ شان اور فیضانِ علم کا صدقہ ہے۔ پھر بھی تنگیٔ داماں کا گلہ خود اپنی ذات سے ہے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

خطا شعار سزاوار درگذر بھی نہ تھا
کہ سرفراز گراں باری عطاہوں میں (فاروقی)

امتحانات بعد میں جو امتحان پاس کئے ان کی مختصراً تفصیل یہ ہے۔

۱۹۲۱ء، پنجاب یونیورسٹی دہلی سنٹر سے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا اور سکنڈ ڈویژن پائی۔

۱۹۲۳ء، سررشتہ تعلیم یو پی آلہ آباد سے عالم (عربی) کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۲۴ء (i) سررشتہ تعلیم یو پی آلہ آباد سے فاضل (عربی) کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

(ii) دورۂ حدیث ختم کیا۔ اور دستار بندی ہوئی اور عبا پائی۔ میں فرسٹ رہا

(iii) ہومیوپیتھک کا پہلا امتحان MP کا H پاس کیا اور فرسٹ آیا۔

۱۹۲۵ء میں ہومیوپیتھک کا دوسرا امتحان HLMS پاس کیا اور فرسٹ آیا۔

۱۹۲۶ء (i) پنجاب یونیورسٹی دہلی سنٹر سے صرف انگریزی میں میٹرک کیا۔

(ii) پنجاب یونیورسٹی لاہور سنٹر سے آنرز ان اُردو کا امتحان پاس کیا۔ فرسٹ ڈویژن اور دوسری پوزیشن آئی۔ صرف ۱۲ فیصد امیدوار کامیاب ہوئے۔

۱۹۲۷ء، پنجاب یونیورسٹی پشاور سنٹر سے صرف انگریزی میں ایف اے پاس کیا۔

۱۹۲۸ء سررشتہ تعلیم یو پی (آلہ آباد) میں اُردو کا صرف ایک امتحان تھا جس کا نام ہی کدورت کیلئے کافی تھا یعنی Language Examination in Advanced Urdu
مجبوراً اس بھدّے نام کے امتحان میں آگرہ سنٹر سے شرکت کی۔ فرسٹ ڈویژن پائی اور صوبہ بھر میں اوّل رہا۔

۱۹۲۹ء سررشتہ تعلیم یو پی الہ آباد کا فارسی کا امتحان کامل پاس کیا۔ سیکنڈ ڈویژن پائی
(۲) لکھنؤ یونیورسٹی کا فارسی کا اعلیٰ امتحان "دبیر کامل" لکھنؤ سنٹر سے پاس کیا۔ فرسٹ ڈویژن پائی اور یونیورسٹی میں اول رہا۔

۱۹۳۲ء آگرہ یونیورسٹی سے صرف انگریزی میں بی اے پاس کیا۔

۱۹۳۳ء آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے پریویس فارسی کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔

۱۹۳۴ء آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے فائنل فارسی کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن پائی۔ اس سال تک پریویس فائنل کے نمبر الگ الگ جمع کئے جاتے تھے۔ اور دونوں میں الگ الگ ڈویژن ملتی تھی۔ بعد میں دونوں سال کے نمبر جمع کرکے ڈویژن دیجانے لگی۔ بہرحال میں نے ایم اے فارسی اور ایم اے اُردو دونوں میں اتنے زیادہ نمبر خدا کے فضل سے حاصل کئے کہ آگرہ یونیورسٹی میں ریکارڈ بنے۔ بلکہ مجھے بتایا یہ گیا کہ تمام آرٹس ایم اے کے امتحانوں میں اتنے نمبر کبھی کسی نے نہ پائے۔ وہاں ایسا کوئی قاعدہ الہ آباد کی مانند نہ تھا کہ تمام ایم اے کے امتحانات میں ملاکر جو شخص سب سے زیادہ نمبر پائے اسے کوئی امتیاز دیا جائے۔ بہرحال ابتک دونوں امتحانوں میں میرے ہی سب سے زیادہ نمبر ہیں۔ اور یہ ریکارڈ قائم ہے۔

۱۹۴۳ء آگرہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے پریویس کیا اور فرسٹ کلاس نمبر آئے۔

۱۹۴۴ء آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے فائنل کیا۔ فرسٹ کلاس پایا اور دونوں برسوں میں (نیز مجموعی طور پر) یونیورسٹی میں فرسٹ رہا۔

<u>ملازمت</u> (۱) جولائی ۱۹۲۹ء سے آغاز اگست ۱۹۳۴ء تک حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں اُردو ٹیچر رہا۔ مجھ سے پہلے مولانا سعید انصاری اور بھائی صاحب یہاں رہ چکے تھے۔ اس لئے بہت ڈر تھا کہ ایسے عالموں کے بعد کیسے جموں گا۔ لیکن خدا نے مدد کی اور لاج رکھی۔ چودھری عبدالحمید خان صاحب مرحوم اسی سال ہیڈ ماسٹر ہوکر آئے تھے۔ انہوں نے کالج کے قاعدے سے تقسیم شعبہ جات کی عربی، فارسی اُردو اسلامیات کے شعبہ کا انچارج مجھے مقرر کیا۔ مولوی عبداللہ صاحب مدرس عربی اللہ لوگ تھے۔ مگر مولانا عبدالوالی صاحب اور مولانا زبیر روحی صاحب ایسے نہ تھے۔ اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ ابتدا میں لوگ جز بز ہوئے مگر پھر تو ایسے عمدہ محبانہ اور دوستانہ

تعلقات ہوگئے تھے کہ باید وشاید۔

۲۔ اگست ۱۹۳۴ میں آگرہ کالج آگرہ "پروفیسر فارسی اور صدر شعبہ فارسی واُردو" بنکر آگیا۔ اور آخر اپریل ۱۹۴۸ء تک رہا۔ خیال تھا کہ اب یہاں سے کہاں جانا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہماری قومی شمالی درسگاہ تھی۔ وہاں مراسم بھی تھے۔ فارسی اور اور اُردو کے شعبوں میں آسامیاں خالی ہوئیں۔ لوگوں نے کہا بھی۔ مگر آگرہ وطن بن چکا تھا۔ اور وہاں سے جانے کا خیال ہی عجب معلوم ہوتا تھا۔ آنے والے انقلابات کی کسے خبر تھی!

آگرہ کالج میں گریڈ ۲۰۰ روپیہ سے ۴۰۰ تک تھا۔ پھر بڑھکر ۵۰۰ تک ہوگیا۔ پھر اور بڑھا تو ساڑھے تین سو سے آٹھ سو ہوگیا۔ اس کے بعد جو گریڈ پر نظر ثانی ہوئی وہ میرے چلے آنے کے بعد ہوئی۔

۱۹۴۱ء میں میں نے آگرہ کالج میں سب سے پہلے ایم اے اُردو کی کلاس جاری کی۔ اس وقت ایک مددگار کا اور تقرر ہوا۔ میرٹھ کالج اور بریلی کالج میں ۱۹۴۲ء میں ایم اے اُردو کی تدریس نہ تھی۔ اور قاعدہ یہ تھا کہ جو مضمون کسی کالج میں پڑھایا نہ جاتا ہو، اس میں کوئی شخص پرائیویٹ بھی شرکت نہیں کرسکتا۔

پاکستان قائم ہوا تو میں نے تین مہینے کا نوٹس دے کر کالج سے سبکدوشی حاصل کی۔ میرے سامنے اول مسٹر میلڈن پرنسپل تھے۔ وہ پروفیسر انگریزی بنکر علی گڑھ چلے گئے۔ تو مسٹر کرال جو کیمسٹری کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے پرنسپل بنے۔

۱۹۴۴ء میں وہ گئے تو رائے بہادر کے سی مہتہ پرنسپل ہوئے۔

خدا کا فضل رہا کہ ہر ہیڈ ماسٹر اور ہر پرنسپل مجھ پر مہربان رہا۔ ڈاکٹر مہتہ ایسے کم آمیز، کم گو اور پابند ضوابط آدمی تھے کہ لوگ ان سے برگشتہ رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ اتنی مدت سے آگرہ کالج میں ہیں مگر ہم نے تو کبھی ان کے گھر کسی رشتہ دار اور دوست کو آتے اور ٹھہرتے نہیں دیکھا۔ میں نے استعفیٰ دیا تو ڈر تھا کہ شکوہ کریں گے۔ ایک دن سٹاف روم میں آگئے۔ اور کھڑے کھڑے چند منٹ میرے استعفے پر افسوس ظاہر کیا۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ چلو یہ مصیبت ختم ہوئی۔ مشکل یہ تھی کہ یہ کہنا کہ میں پاکستان جارہا ہوں گالی سے بدتر اور جرم جیسا عمل سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے میں

سوال وجواب سے بچنا چاہتا تھا۔ سمجھا کہ بلا ٹلی۔ مگر چند روز بعد ایک دن مہتہ صاحب
نے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اور فرمائش کی کہ استعفا واپس لے لو۔ تم جیسے معتمد اور
کارآمد آدمی کو میں نہیں چھوڑوں گا۔ میں جو دلیل پیش کرتا تھا وہ اسکی کاٹ کر دیتے تھے۔
پینتالیس منٹ ہوگئے۔ میں عاجز آ گیا۔ حلق خشک ہوگیا۔ آخر میں نے کہا آپ کا
سب فرمانا سر آنکھوں پر۔ لیکن اگر آپ کی کرسی پر بٹھا کر کہا جائے کہ تم خود
فارسی اُردو کی بابت فیصلہ کرو تو میں کہونگا۔ کہ فارسی تو اگلے سال بند کر دی جائے
اور اُردو کا حال چند سال دیکھ لیا جائے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ دو تین سال میں
اُردو بھی بند کرنی پڑے گی۔ ایسے میں آپ کے لئے دردسر کا سبب کیوں بنوں"
اس پر مہتہ صاحب کو چپ ہونا پڑا۔ میں چلا تو مطمئن تھا کہ اس آزمائش سے
نجات ملی۔ چار بجے تھے، کالج بند ہو گیا تھا۔ اسٹاف روم میں داخل ہوا تو دیکھا
کہ صدر شعبۂ سنسکرت اور ہندی پنڈت تیواری موجود ہیں۔ دیکھتے ہی بولے "استعفیٰ
واپس لے آیئے۔" میں نے کچھ کہنا چاہا تو مجھے پرنسپل کے کمرے کی طرف دھکیلنا
شروع کر دیا۔ برابر کہتے رہے کہ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں کیا فکر ہے۔ کسی کی کیا
مجال کہ اُردو کو یا تمہیں ہاتھ لگائے۔ میں برابر سمجھاتا رہا مگر وہ دھکیلتے دھکیلتے بالکل
پرنسپل کے دروازے تک لے آئے۔ میں پریشان کہ پرنسپل کے سامنے دوبارہ جاؤنگا
تو کیا جواب دونگا۔ غرض اس مرحلے پر میری خوشامد درآمد کام آئی اور پنڈت جگن ناتھ
تیواری نے جان چھوڑی۔

تو خدا کا شکر ہے کہ آگرہ کالج میں ایسی نیک نامی سے ملازمت کی۔ تیواری بھی
کٹر ہندو اور پنڈت تھے۔ اور میں سخت کٹر مسلمان۔ مگر بفضلہ تعالیٰ ایسے ہی اچھے تعلقات
تھے۔ اکثر احباب جو باہر کے کالجوں سے آتے کہتے کہ "سب جگہ پنڈت اور مولوی میں
سخت اختلافات ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ آگرہ کالج اور سینٹ جانس کالج میں یہ
دونوں گروہ کیوں شیر و شکر ہیں۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

۳۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اسی سال اُردو کلاسوں کا اجرا ہوا تھا۔ مجھے معلوم
ہوا تو میں نے عرضی بھیجدی۔ اور مئی ۱۹۴۸ء میں وہاں مقرر ہوگیا۔ پاکستان
آنا طے کر لینے کے بعد میرا آگرہ سے ہلنا آسان نہ تھا۔ کالج کی ملازمت سے باقاعدہ

سبکدوشی کے علاوہ مختلف ثقافتی ادارے مجھ سے متعلق تھے۔ ان سب سے علیحدگی حاصل کرنی تھی۔ چنانچہ بچوں کو ۶ نومبر ۱۹۴۷ء میں براہ بمبئی پاکستان بھیج دیا تھا۔ بیوی کے بھانجے ظریف الدین صدیقی سلمہ نے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ انہی دنوں آگرہ میں حبیب بنک کی شاخ کھلی تو اُس میں ملازم ہو گئے (ماشاء اللہ خوب ترقی کی اور اب مسلم کمرشل بینک میں سینئر وائس پریزیڈنٹ ہیں) تو ظریف سلمہ اپنے والدین اور اہلیہ کے ساتھ آگرہ سے تبادلے پر کراچی آنے والے تھے۔ تجویز ہوا کہ میرے بچے بھی انہی کے ساتھ کراچی آجائیں۔

آخر نومبر میں براہ بمبئی بذریعہ سمندری جہاز یہ لوگ کراچی پہنچے۔ اسوقت شدید افراتفری کا عالم تھا۔ برادر عزیز محمد احسن فاروقی اس سے قبل کراچی آچکے تھے۔ ان کی رہنمائی میں ایک سرکاری کوارٹر میں بلغیر اجازت کے مقیم ہوگئے — کراچی کی یہ آبادیاں جواب شدید گنجان آباد ہیں ان میں اکثر کا تو وجود ہی نہ تھا۔ جیکب لائن۔ مارٹن روڈ کوارٹرس۔ جمشید روڈ کوارٹرس وغیرہ آباد ہو رہے تھے۔ بازار اور پانی مفقود۔ غرض کچھ نہ تھا۔ بیوی پندرہ دن ہی میں گھبرا گئیں۔ اور پشاور کیلئے پر تولے۔

حسن میاں (ساجد حسن قادری) ۱۹۴۲ء میں بلوچستان ایجوکیشنل سروس میں لے لئے گئے تھے۔ اور کوئٹہ میں تھے۔ وہ ان لوگوں کی پیشوائی اور مدد کے لئے کراچی آگئے تھے۔ انہوں نے پشاور پہنچانے کی حامی بھری۔ ان دنوں ریلیں بھی واجبی تھیں اور بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ کراچی سے لاہور اور لاہور سے پسنجر میں پشاور گئے۔ یہ سفر بھی عجیب ہنگامے اور مصیبت کا تھا۔ غرض ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو بیوی بچے پشاور پہنچ گئے۔ پشاور کی خصوصیت ہمارے لئے یہ تھی کہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۰ء تک والد مرحوم اسلامیہ کالج پشاور میں عربی کے پروفیسر رہے تھے۔ میری بیوی کی سب سے بڑی بہن مولانا عبدالمجید افغانی کو بیاہی تھیں۔ اور اسی صدی کی دوسری دہائی کے وسط سے پشاور میں رہ رہی تھیں۔ میرے جذباتی تعلق کے علاوہ بیوی کو بھی یہ جذباتی وابستگی تھی۔ مولانا عبدالمجید افغانی مرحوم ایڈورڈس

کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ قیام پاکستان سے قبل ریٹائر ہو چکے تھے۔ پشاور کے سبھی پڑھے لکھے لوگ جو ۱۹۴۷ء سے قبل فارغ التحصیل ہیں ایڈورڈس کالج پشاور یا اسلامیہ کالج پشاور کے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک کے لوگ والد مرحوم کو بخوبی جانتے تھے اور تقریباً سبھی یا تو والد مرحوم کے شاگرد تھے یا عبدالمجید افغانی مرحوم کے۔ اس لحاظ سے بھی اور ہماری جذباتی وابستگی کے اعتبار سے بھی پشاور ہی ہمارے لئے "نیا وطن" ہونا چاہئے تھا۔ اسی لئے ہم نے ادھر کا رُخ کیا۔

سفر کے سارے مصائب اور ہجرت کی ساری تکلیفیں میری بیوی پر گذریں، اس زمانے کی ساری افراتفری کی یہ شکار ہوتی رہیں۔ ان ہی باتوں میں یہ بات بھی تھی کہ آگرہ سے چلنے سے قبل ان کے والد صاحب کا وصال ہوا۔ وہ حبیب بھائی کے پاس اجمیر میں تھے۔ ۱۷ر نومبر کو وہیں رحلت فرمائی۔ آگرہ سے یہ لوگ ۲۱ نومبر کو روانہ ہونے والے تھے۔ اسی دن حبیب بھائی کا خط ملا۔ اجمیر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسلئے کہ ریلوں میں مسلمانوں کو کاٹ ڈالا جاتا تھا۔ میرے لئے اطلاع دینے کا کام بھی مشکل تھا۔ غرض بتدریج میں نے بیوی کو مطلع کیا۔ پھر ان کی سنجھلی بہن کو بتایا۔ اس دن کا سفر ملتوی ہوا۔ اور پھر ۲۳ر نومبر کو ان لوگوں کو روانہ کیا۔

بیوی ۲۵ر دسمبر کو پشاور پہنچیں تو معلوم ہوا کہ ان کے بڑے بہنوئی مولانا عبدالمجید افغانی صاحب ۲۰ر دسمبر کو رحلت کر چکے تھے۔ بہر حال اپنی بڑی بہن کے ہاں انہوں نے قیام کیا۔ پھر اپنے بھانجے نور احمد خان (ڈائرکٹر اکسائز) کی مدد سے مکان حاصل کیا۔ کوئی پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میں تو ایک جگہ سے دوسری جگہ نوکریاں تلاش کرتا اور پاتا رہا۔ ہجرت کی ساری مصیبتیں اور تکلیفیں میری بیوی نے اٹھائیں۔ بچے تو پھر بھی چھوٹے تھے۔ بھول بھی گئے ہوں گے۔

بہت لمبا جملہ معترضہ درمیان میں آگیا۔ کہہ یہ رہا تھا۔ کہ میں مئی ۴۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ملازم ہو کر آگرہ سے سیدھا وہاں چلا گیا تھا۔ جولائی میں وہاں تعطیل ہوئی تو ریل کے ذریعے ہندوستان سے گزرتا ہوا پشاور آیا۔ (دہلی سے لاہور تک البتہ پرواز کی تھی۔ اس وقت اورینٹ ایرویز کا طیارہ دہلی سے

لاہور آتا جاتا تھا)۔ (اس وقت لاہور میں برادرم اشفاق احمد فاروقی آئے ہوئے تھے۔ وہ یونائیٹڈ کمرشل بینک میں جو برلا بینک کے نام سے معروف تھا، افسر تھے۔ اور بینک نے ان کو پاکستانی شاخوں کا کام دیکھنے لاہور بھیجا تھا۔ انہوں نے گاڑی میں پہلے سے میرے لئے سیٹ ریزرو کروا رکھی تھی۔ اسی رات کو خیبر میل سے پشاور چلا آیا تھا۔

پشاور آکر ان سب کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ پہلے بھی ڈاک سے بیوی حال لکھتی رہی تھیں۔ مگر تحریر و تقریر میں فرق ہوتا ہے۔ غرض یہاں آکر طے کرنا پڑا۔ کہ ڈھاکہ واپس جانا لغو بات ہے۔ بیوی بچوں سے اتنی دور نہیں رہا جا سکتا۔ سوا مہینے کی اس تعطیل کے بعد مہینہ سے کچھ اوپر یونیورسٹی کھلنی تھی۔ اور پھر چالیس دن کی "درگا پوجا" کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس درمیانی عرصے کی چھٹی بھیج دی۔ اور پشاور میں روزگار کی تلاش ہونے لگی۔ پشاور میں تو اسامی کا کیا امکان تھا۔ لاہور کے کئی سفر کئے۔ اور ملازمت کے لئے عرضیاں دیں۔

میں ۱۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو پشاور پہنچا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں اسی سال ایم اے اُردو جاری ہو گیا تھا۔ وہاں سے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں طلب کیا گیا۔ لیکن انہی دنوں منجھلے بیٹے اظہر میاں کی پتھری کے اپریشن کے سلسلے میں ہم لوگ ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں مقیم تھے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ان کا کامیاب آپریشن ہوا، مگر ڈاکٹر جوزف پال نے مجھے فوراً لاہور جانے کی اجازت نہ دی۔ اس لئے میں نے لاہور کو لکھ دیا کہ اس کام سے فارغ ہو کر آؤں گا۔ وسط اکتوبر میں ڈھاکہ یونیورسٹی کو معذرت اور استعفیٰ بھیج دیا تھا۔ یہاں ایک عجیب بات بھی لکھنے کے قابل ہے۔ میں جولائی ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ سے پشاور آیا تھا۔ چار مہینے نوکری کی تلاش رہی۔ پانچویں مہینے لاہور آیا۔ ستمبر اکتوبر کی بات ہے۔ اس وقت کہیں سے بلاوا نہیں آیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ "اللہ میاں کے ہاں تو تمہارا نام ملازمت یافتہ کے رجسٹر میں درج ہے۔ نئی نوکری کیوں ملے۔ جب unemployed کے رجسٹر میں اندراج ہوگا تبھی تو نئی نوکری مل سکے گی۔" یہ خیال اتنا پختہ ہوا کہ چند روز سوچنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کو استعفا بھیج دیا۔ دل کو اب ایک گونہ اطمینان تھا کہ اب [illegible] کوئی سلسلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ چند ہفتوں کے بعد ڈاکٹر عبداللہ صاحب صدر شعبہ

اردو و پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج کا خط ملا کہ مستقل آسامی تو سنڈیکیٹ کی منظوری کے بعد پُر کی جائیگی۔ لیکن ایم اے کلاس شروع ہو چکی ہے تم (فی لکچر معاوضہ پر) آنا پسند کرو تو آجاؤ۔

۴۔ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں ۱۵ ر نومبر ۱۹۴۸ء سے تدریس کے فرائض سنبھال لئے۔ معاوضہ فی لکچر کے حساب سے ملتا تھا جو تین ماہ بعد یکمشت ملا۔ سنڈیکیٹ نے دو آسامیاں منظور کیں تو اشتہار شائع ہوا۔ میں نے بھی عرضی دی۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ اس لئے کہ امیدواروں میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (علیگڑھ) ڈاکٹر مسعود حسین خاں (علی گڑھ) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (ناگپور) عبدالاحد خاں خلیل (لکھنؤ) قدرت اللہ فاطمی (راولپنڈی) سید وقار عظیم (کراچی) سید طاہر نقوی (کراچی) ڈاکٹر صفدر حسین (راولپنڈی) اور دوسرے اہل حضرات تھے۔ ۱۱ ر فروری ۱۹۴۹ء کو انٹرویو ہوا اور لیث صدیقی صاحب کو اور مجھے انتخاب کیا گیا۔ لیث صاحب سینئر لکچرر اور میں جونیئر لکچرر۔ سیلیکشن بورڈ (اور اس کی سفارش پر سنڈیکیٹ) نے انتہائی معقولیت کا ثبوت یہ دیا کہ ہم دونوں کی پچھلی تنخواہوں کا خیال کر کے تنخواہ متعین کی۔

لاہور مجھے پوری طرح پسند اور منظور تھا۔ مکان کی تلاش جاری رکھی کہ پشاور سے سب کو لے آؤں۔ لاہور میں دو مکان الاٹ ہوئے مگر قبضہ ایک کا بھی نہ ملا۔ ان کے الاٹمنٹ آرڈر میں نے بطور یادگار محفوظ کر رکھے ہیں۔

آخر تعطیل کلاں میں (جولائی تا ستمبر ۱۹۴۹ء) بچوں کے پاس پشاور آیا، تو انہی دنوں اسلامیہ کالج پشاور کی آسامی کا اشتہار نکلا۔ میں نے عرضی دی، انٹرویو میں انتخاب میں آگیا۔ اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء سے اسلامیہ کالج میں، اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔

لاہور سے سبکدوشی میں بڑی مشکل پیش آئی۔ بعد از خرابیٔ بصرہ وہاں سے سبکدوش ہو کر پشاور ہی گیا۔ پشاور میں انٹرویو بورڈ نے ذرا بنئے پن سے کام لیا اور لاہور سے کم تنخواہ کی پیشکش کی۔ لیکن یہ مالی خسارہ بھی منظور کرنا پڑا کہ ہم سب اس طرح یکجا تو ہو جائیں گے۔ اب پشاور ہی میں رہنے کا ارادہ تھا لیکن

کیا معلوم تھا کہ ابھی پاؤں کی گردش باقی ہے۔

۶۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں ریڈر (ایسوشیئٹ پروفیسر) کی آسامی نکلی۔ وہاں سے لوگوں نے لکھا کہ ضرور عرضی دو اور آجاؤ۔ پشاور اور ڈھاکہ کے گریڈ میں بڑا فرق تھا۔ پشاور کی ملازمتوں کا یہ لطیفہ بھی دلچسپ ہے کہ ۱۹۴۹ء میں اور پھر ۱۹۵۳ میں (جب میں دوبارہ اسلامیہ کالج پشاور آیا) ہر دفعہ فارسی کے لکچرر کی آسامی خالی تھی مگر دونوں دفعہ یہ ہوا کہ میرا تقرر ہوا تو مجھے اُردو کا کام دیا گیا۔ اور اُردو کا لکچرر قرار پایا۔ اور دوسرے صاحب کو جو میرے آنے سے قبل اُردو کا کام کر رہے تھے۔ فارسی کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

آخر نومبر ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے ریڈر کے عہدے کا پروانہ آگیا۔ اسلامیہ کالج کی نوکری پر میں دوبار ۱۹۴۹ء اور پھر ۱۹۵۳ء میں آیا۔ عجب اتفاق کہ ان دونوں اوقات میں یہ کالج سرکاری تحویل میں تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۵۱ میں میں نے طویل رخصت بلاتنخواہ کے لئے عرضی دی۔ تو دفتری چپقلشوں کی وجہ سے بمشکل ۱۳ر جنوری ۱۹۵۲ء سے جانے کی اجازت ملی۔ اور وہ بھی رخصت پر نہیں بلکہ استعفا دے کر۔ [redacted] یار لوگوں نے کسی طرح منظور نہ ہونے دیا۔

بہرحال میں وسطِ جنوری ۱۹۵۲ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں ریڈر بنکر گیا۔ وہاں ابتدا ہی سے میرے نام عظیم پورہ کالونی میں ایک فلیٹ محفوظ تھا۔ ضرورتاً اسی کو لے لیا گیا۔ ورنہ عزیزانِ گرامی قدر محمود احمد فاروقی اور التفات احمد فاروقی دونوں کے گھر ڈھاکہ میں تھے۔ اور وہ سخت ناراض تھے۔ کہ الگ مکان کا اتنا بڑا کرایہ بے سبب کیوں دیا جائے۔ مگر ہر کام کی کچھ مجبوری اور کچھ مصلحت ہوا کرتی ہے۔

جناب کریم اقبال صاحب اسلامیہ کالج پشاور میں انگریزی کے لکچرر تھے اور میرے رفیق کار۔ کچھ دن ہم ایک ہی کوٹھی میں شریک رہائش بھی رہے۔ بڑے ہی لائق، شریف اور اعلیٰ کردار کے آدمی ہیں۔ ۱۹۵۲ء کے اوائل میں وہ سول سروس اکیڈمی لاہور میں زیر تربیت تھے۔ میں ڈھاکہ جاتے ہوئے ایک دن

انہی کے پاس ٹھہرا۔ انہوں نے بتایا کہ جون میں ان کے دو چھوٹے بھائی مدراس سے تعلیم کی تکمیل کرکے پاکستان آئیں گے۔ چونکہ ان کو بھی اپنی تربیت کے آخری حصے میں ڈھاکہ آنا ہے، اس لئے ان کو انہوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ سیدھے ڈھاکہ آجائیں۔ کریم صاحب نے کہا کہ سنا ہے وہاں رہائش کے لئے مکان ملنا ناممکن ہے۔ میں نے کہا پھر یہ کام مشکل نہیں آسان ہے۔ میرے لئے ایک فلیٹ محفوظ ہے۔ میں اس پر ابھی سے قبضہ رکھ چنانچہ اس ضرورت کی وجہ سے اس فلیٹ پر قبضہ جمانا پڑا۔ ابتدا میں تو یقیناً کرایہ دیا گیا لیکن پھر اس نے کام بھی بہت دیا۔ جنوبی ہند سے کریم صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالقادر صاحب (مقبول) اور سلیم مفتی صاحب اور ان کے ساتھ اسلم احمد صاحب (محمد پاشا) آئے تو میرے ہی ساتھ اسی فلیٹ میں رہے اس بیان میں اتنی ترمیم کیجیے کہ نمبر ایک اور تین تو جون ۱۹۵۲ء میں مدراس سے آئے تھے۔ اور سلیم صاحب اس سے قبل پاکستان آچکے تھے۔ اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم ایس سی (باٹنی) مکمل کرکے ڈھاکہ ان دنوں کے بھی پہنچے تھے۔ بہرحال ان لوگوں کے آجانے کے بعد صرف یہی نہیں کہ فلیٹ آباد ہوگیا، بلکہ ان کی رفاقت کی وجہ سے وہاں کا قیام بے حد خوشگوار اور آرام بن گیا۔

ڈھاکہ کے قیام کے کچھ دن بعد یہ اندازہ ہوگیا کہ یہاں کی آب و ہوا کسی طرح سازگار نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے بیوی بچوں کے بلانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ اپنے دل میں طے کرلیا تھا کہ میری صحت کو جو نقصان پہنچے مجبوری ہے۔ بچوں کو یہاں لاکر ان کی صحتیں قربان کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ پھر بھی اس فکر میں بھی رہا کہ مغربی پاکستان میں کوئی آسامی (کیسی ہی کم کی ہو) مل جائے تو واپس چلا جاؤنگا۔

جون ۱۹۵۳ء میں حکومت پاکستان نے ایک "تعلیمی ثقافتی وفد" ایران بھیجا تھا جو چودہ افراد پر مشتمل تھا۔ مختلف سرکاری محکموں کے بعض افسران کے علاوہ اس وفد میں ہر یونیورسٹی سے ایک اُستاد اور ایک طالب علم انتخاب کیا گیا تھا۔ پنجاب، کراچی اور پشاور یونیورسٹیوں

تو ایسا ہی ہوا۔ لیکن سندھ اور ڈھاکہ یونیورسٹیوں سے دو دو اُستاد ہی بھیجے گئے۔ آخر جون میں یہ وفد کراچی سے پرواز کرکے تہران پہنچا۔ اور سیاحت کے بعد مشہد سے زاہدان بذریعہ ہوائی جہاز، اور وہاں سے ریل سے کوئٹہ آیا۔ میں نے پہلے ہی ڈھاکہ میں وائس چانسلر صاحب سے ذکر کردیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ شادانی صاحب (صدر شعبہ) تمہارے ساتھ ہیں۔ ان سے راستے میں رخصت کی بات طے کرلینا۔ چنانچہ میں شادانی صاحب سے اجازت لیکر کوئٹہ سے پشاور آگیا۔ یہاں پندرہ دن رہ کر پھر لاہور سے پرواز کرکے ڈھاکہ واپس آیا۔

اس میں پرلطف قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب میں نے کوئٹہ آتے ہوئے ریل میں شادانی صاحب سے یہ ذکر کیا اور عرضی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے کہا کہ اب تو تم جاؤ۔ ڈھاکہ واپس آنے کے بعد عرضی دے دی جائے گی۔

ڈھاکہ پہنچکر معلوم ہوا کہ شادانی صاحب۔ خود بھی کراچی میں رخصت گزار کر ابھی آئے ہیں۔ میں نے عرضی کا ذکر کیا تو فرمایا کہ جب رجسٹرار دریافت کرے گا تو عرضی دے دینا۔ چنانچہ کچھ دن بعد رجسٹرار کے دفتر سے استفسار کیا گیا کہ "تم کب گئے اور کب آئے۔ اس مدت کی کتنی اور کیسی رخصت دیجائے"۔ تو میں نے ایک صفحے کی طویل داستان لکھی۔ اور ڈیوٹی کی رخصت اور ذاتی رخصت الگ الگ مدت کی طلب کی۔ یہ بھی پُرلطف بات ہے کہ یہ رخصت منظور ہوکر اس وقت آئی ہے جب میں ڈھاکہ چھوڑ کر بھی چلا آیا تھا۔

ڈھاکہ کی ریڈری کے انتخاب کا قصہ بھی دلچسپ اور میرے لئے فخر و مسرّت کا باعث ہے۔ ڈھاکہ پہنچکر تفصیلات کا علم ہوا تھا۔ وہاں کی آسامی کا ایک بار اعلان ہوا۔ عرضیاں آئیں۔ تین ماہرین کو بھیجی گئیں۔ یہ ماہرین فضل کریم فضلی سیکرٹری تعلیم حکومت مشرقی پاکستان۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) اور ڈاکٹر زبیر صدیقی (کلکتہ یونیورسٹی) تھے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی، ماہرین سے یہ فرمائش کیا کرتی تھی کہ تین نام بالترتیب انتخاب کرکے لکھے جائیں۔ سنا ہے کہ ان کی رائیں آئیں تو اتنی مختلف تھیں کہ کسی ایک فرد پر اتفاق نہ سمجھا گیا۔ اس لئے آسامی دوبارہ مشتہر ہوئی۔

اب کے ماہرین دوسرے مقرر کئے گئے۔ یعنی علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور)۔

ان ایام میں ڈاکٹر معظم حسین صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے وہ عربی کے عالم تھے۔ اور اس سے قبل صدر شعبہ عربی اور اسلامیات رہ چکے تھے۔ ایگزیکیٹیو کونسل یعنی ڈھاکہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے سامنے ماہرین کی رائیں پیش ہوئیں۔ تو دو حضرات نے تو تین تین نام لکھے تھے اور ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ لیکن علامہ سلیمان ندوی نے صرف ایک میرا نام ہی تجویز کیا تھا۔ ڈاکٹر معظم عربی کے عالم اور علامہ سلیمان ندوی کے بڑے معتقد اور مدّاح تھے۔ انہوں نے انتظامیہ سے کہا، کہ پھر تو یہی ایک شخص قابل انتخاب ہے۔ ذٰلِکَ فضل اللہ

ڈھاکہ میں بڑا اچھا وقت گذرا مگر گھر سے دوری سوہانِ روح تھی۔ جس دن میں نے وہاں استعفیٰ دیا ہے، اسی دن شعبے سے چھٹی لے لی تھی۔ تاکہ فوری شکایات اور جرح سے تو بچا رہوں۔ شام کو ڈاکٹر ظفرالہدیٰ صاحب اور ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی صاحب آئے۔ کیسی محبت کے لوگ اور کیسے اعلیٰ کردار کے دوست ہیں۔ ان کی یہ محبت کبھی نہیں بھول سکتی۔ آفتاب صاحب آئے تو چک لئے ہوئے اور اصرار کہ "لو چیک میں کاٹتا ہوں سب کو بٹا دو اور سے فوراً بلا لو۔ بولو کتنے کا چیک کاٹوں؟" بمشکل اِن سے جان چھڑائی۔ ہدیٰ صاحب آئے تو بولے "ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ تم جا نہیں سکتے" سبحان اللہ! اس زمانے میں بھی ایسی محبت باقی ہے۔

کیا خدا کی کارسازی ہے۔ اگر میں ڈھاکہ میں ہوتا تو ۱۹۷۱ء کے اوائل اور اواخر کے حالات میں کیا گزرتی۔ اب بھارت کے قبضے کے بعد بعض اعزّہ کی خیریت تو معلوم ہوئی ہے جو ڈھاکہ میں تھے۔ مگر ابھی تک شعبے کے ان برادران محترم کا حال سننے میں نہیں آیا۔ آفتاب صاحب وہاں صدر شعبہ ہو گئے تھے۔ ہدیٰ صاحب نے کئی سال ہوئے ڈاکٹریٹ کر لی تھی۔ ان کو تو اب وہاں رہتے ہوئے تیس سال سے زیادہ ہو گئے ہوں گے۔ خدا ان سب کو اور دوسرے غیر بنگالیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

بعد میں تحقیق ہوا کہ ڈاکٹر بدری صاحب نے یونیورسٹی سے سبکدوشی حاصل کر لی اور وہیں مقیم ہیں۔ ست روضہ محلہ میں جس مکان میں تھے۔ اسی میں ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت چلے گئے تھے۔ پھر واپس آکر بنگلہ دیشی بن گئے۔ ان کی بیگم لیڈی ڈاکٹر اور سرکاری ملازم تھیں۔ اب بھی شاید ملازم ہوں۔ یا شاید نجی مطب کرتی ہوں گی۔ ان کی صرف ایک لڑکی تھی اب تعلیم سے فارغ ہو گئی ہو گی۔ سلمہم اللہ تعالی

ڈاکٹر آفتاب صدیقی صاحب کی خیریت بھی کراچی میں سنی۔ معلوم ہوا کہ وہیں رہے اور وہیں ہیں۔ ابتداء میں یونیورسٹی کھلی تو ان سے کہہ دیا گیا کہ ابھی یونیورسٹی نہ آئیں اور فیض احمد چودھری صاحب کو صدر شعبہ بنا دیا گیا۔ سنا تھا کہ آفتاب صاحب کی نوکری برقرار ہے۔ تازہ ترین کوائف معلوم نہیں۔ ان کی بچیاں اور لڑکا اب تو تعلیم سے فارغ ہو گئے ہوں گے۔ ۱۹۶۶ء میں دیکھا تھا تو بی۔اے، ایم۔اے میں تھے۔ خدا ان سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ترقیات دارین عطا کرے۔

(مابعد) نومبر ۱۹۷۵ء میں آفتاب صاحب کراچی آگئے اور اب ۱۹۷۶ء میں سنا کہ وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن میں ملازم ہو گئے ہیں۔ الحمد للہ

(۷) غرض اکتوبر ۱۹۵۳ء میں پھر ڈھاکہ چھوڑ کر پشاور آگیا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۳ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعطیل تھی۔ میں چلا تو استعفٰی دیکر اور احباب سے یہ کہہ کر کہ استعفٰی کا فیصلہ جو بھی ہو اور جب بھی ہو میں تو چل دیا۔ اسلامیہ کالج پشاور میں ڈھاکہ کی تنخواہ سے ۲۲۵ روپے کم کی ملازمت ملی تھی مگر یہ بھی گوارا تھی۔ دال روٹی ہی سہی مگر صحت کا نیز دوسرے مسائل کا حل تو بنے گا۔

میں ڈھاکہ سے کلکتہ ہوائی جہاز سے آیا۔ وہاں سے اول ریل سے فتح پور گیا وہاں ماموں جان (فرید عالم چشتی) ان دنوں سیشن جج تھے۔ پھر ان کیساتھ آگرہ آیا۔ بھائی (حامد حسن قادری) سینٹ جانس کالج سے ریٹائر ہو کر آگرہ میں مقیم تھے۔ اور پاکستان آنے کا ارادہ نہ تھا (ان کے منجھلے لڑکے خالد حسن قادری نے بمشکل ان کو ۱۹۵۵ء میں پاکستان آنے پر آمادہ کیا)۔ بھائی کے پاس آگرہ میں ہفتہ بھر رہا۔ تین دن باہر سے اٹھ کر اندر آنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ مسلسل ملنے والے آتے رہتے۔ اور رات تک یہ سلسلہ رہتا تھا۔ چوتھے دن مجھے بخار اس

شدت کا آیا کہ باقی قیام بے لطف ہو گیا۔

بخار میں کمی تو ہو گئی تھی۔ مگر طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہ تھی۔ پھر آگرہ سے بریلی آیا۔ دن بھر خانقاہِ نیازیہ میں گذار کر رات کی گاڑی سے مرادآباد گیا۔ وہاں دو دن رہ کر دہلی اور دہلی سے پرواز کر کے لاہور، لاہور سے ریل سے پشاور ۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء سے اسلامیہ کالج میں کام پر آ گیا۔ چار دن بعد مجھے لقوہ ہوا۔ اور چھٹی کا ارادہ کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ ایسی بیماری نہیں کہ چند روز میں نجات مل جائے تو چھٹی کا ارادہ ترک کیا۔ علاج معالجہ کے ساتھ کام بھی ہوتا رہا۔ تنخواہ البتہ غائب رہی گورنمنٹ کا کالج بنا ہوا تھا۔ اس لئے کام سنبھالنے کے ساتھ صحت کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرنا ضروری تھا۔ فروری میں معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے یہ معلوم کرنیکے بعد کہ میں برابر کام کر رہا ہوں، سرٹیفکیٹ دیدیا۔

خدا کا یہ بھی عجیب کرم و فضل تھا کہ باوجودیکہ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ یہ کیس Bell's palsy کا ہے۔ چہرے میں تھوڑی بہت کجی بھی تھی لیکن گویائی پر ذرا سا بھی اثر نہ تھا۔ بہر حال مارچ اپریل تک اتنا اچھا ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کو چہرے کی کجی کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ اور بعد کو جس کسی سے کہا اس نے یہی برجستہ کہا کہ "ہم تو آپ سے اتنی دیر سے بات کر رہے ہیں، ہمیں تو مطلق خیال نہیں آیا کہ آپ کے چہرے میں کوئی فرق ہے"۔

غرض اکتوبر ۱۹۵۲ء سے پھر اسلامیہ کالج پشاور میں اردو کی جماعتوں کی تدریس کا سلسلہ رہا۔ ۱۹۵۵ء کی تعطیلات گرما میں وائس چانسلر رضی الدین صدیقی صاحب نے فرمائش کی کہ میں دفتر میں آ جاؤں مگر میں نے عرض کیا کہ میں مدرس بنکر رہ گیا ہوں۔ دفتر سے معاف رکھیئے۔ فرمایا کہ اچھا تو عارضی طور پر آ جاؤ اور تدریس کا بھی کام کرتے رہو۔ چنانچہ تعطیلات کے زمانے ہی میں اگست سے میں نے دفتر کا کام کرنا شروع کر دیا۔ کوئی آسامی خالی نہ تھی۔ اس لئے ایک عہدہ ایجاد کیا گیا۔ آفیسر انچارج اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریشن سیکشن۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ عہدہ ڈپٹی رجسٹرار کے مساوی قرار دیا تھا (لطف یہ ہے کہ مجھے اس عہدے کا علیحدہ کوئی الاونس بھی نہ ملا۔ میں نے اپنے قاعدے کے مطابق کبھی طلب بھی نہیں کیا)۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ تھی کہ ایک آسامی اکیڈمک رجسٹرار کی

قائم کریں اور اس پر مجھے تعینات کریں۔ چنانچہ اس وقت جب یہ آسامی کاغذ پر ہونے کی بجائے ان کے ذہن میں تھی، کئی دفعہ فائل پر انہوں نے Academic Registrar لکھ کر میرے پاس بھیجا۔

ان دنوں بڑی طویل نوکری ہوگئی تھی۔ ابتداء میں دو پیرڈ تھرڈ ایئر فورتھ ایئر کے اسلامیہ کالج میں پڑھائے اور دس بجے دفتر آگیا۔ کہنے کو تو چار بجے چھٹی ہوتی تھی، مگر بس کی دقت کی وجہ سے کافی دیر سے ہی گھر آنا نصیب ہوتا تھا۔ فرسٹ ایر سیکنڈ ایر کو میری بجائے مرزا نذیر برلاس صاحب پڑھاتے تھے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ انکو ایران جانے کے لئے وظیفہ ملا۔ تو آخر ستمبر میں وہ تہران گئے اور مجھے فوراً دفتر سے سبکدوشی کرکے پوری طرح اسلامیہ کالج بھیج دیا گیا۔

اتنی پخ پھر بھی لگی رہی کہ میں نے پشاور یونیورسٹی کا کیلنڈر ترتیب دیکر طباعت کے لئے تیار کیا تھا تو حکم ملا کہ اس کی تکمیل کا کام بہرحال تم ہی انجام دوگے۔ یہ بات بھی خوب ہے کہ دفتر کے کام کی طرح اس کیلنڈر کی تیاری کے کام کا بھی کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ حالانکہ زبانی کہا گیا تھا کہ اس کا علیحدہ معاوضہ دیا جائے گا۔ "ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" کے مطابق میں نے لکھ کر مانگنا تو درکنار کبھی زبانی بھی فرمائش نہ کی۔

ستمبر ۱۹۵۶ء سے ایم۔اے اُردو کی پریویس کلاس جاری ہوئی تو مجھے اسلامیہ کالج کی چاروں کلاسوں کے ساتھ اسے بھی پڑھانا پڑا۔ جب اگلے سال ایم۔اے پریویس اور فائنل دونوں کلاسیں ہوگئیں تب کہیں سید افضل حسین اظہر صاحب کا تقرر اسلامیہ کالج میں ہوا۔ اور میں اکیلا پریویس اور فائنل پڑھاتا رہا۔

ان ابتدائی دو برس (۵۷-۱۹۵۶ اور ۵۸-۱۹۵۷) میں شعبہ کے اوقات میں ایم۔اے کا کام کیا پورا ہوتا۔ چنانچہ پہلے سال تین مہینے اور دوسرے سال چار مہینے گھر پر چار چار گھنٹے کلاس پڑھاتا تھا۔ دوسرے سال ایم۔اے پریویس میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکیوں کی وجہ سے یہ کلاس گھر پر بلانی ممکن نہ تھی اس لئے ان کا کام تو کسی نہ کسی طرح شعبے کے اوقات ہی میں ختم کرایا۔ اور دوسری کلاس کو گھر پر بلایا۔ پہلے پریویس اور اسی طرح اگلے سال کے فائنل میں دو طالب علم تھے۔ عزیزان گرامی سید مرتضیٰ جعفری اور خاطر غزنوی۔ یہ دونوں حضرات پریویس اور فائنل میں گھر کے

اس پرائیویٹ وقت میں کام پورا کرنے میں کامیاب ہو سکے اور اپنی محنت اور خدا کے فضل وکرم سے دونوں نے فائنل میں فرسٹ ڈویژن پائی۔

میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی ریڈرشپ چھوڑ کر اسلامیہ کالج میں جونیئر لکچرر کی آسامی پر لوٹ کر آیا تھا۔ اگست ۱۹۵۶ء میں مجھے سینئر لکچرر بنایا گیا۔ ابتدا میں اُردو اور فارسی کے ایم۔ اے ایک ہی شعبے میں تھے۔ اور ڈاکٹر مظہر علی خان صدر شعبہ قرار دئے گئے تھے۔ اگلے سال ہی وہ علیحدہ ہو گئے تو جناب مولانا عبدالقادر صاحب ڈائرکٹر پشتو اکیڈمی ہمارے مخلوط شعبے کے صدر قرار پائے۔ ۱۹۶۲ء میں دونوں شعبے الگ کئے گئے۔ مجھے اُردو شعبے کا صدر اور برادر نسبتی حبیب مفتی صاحب کو شعبہ فارسی کا صدر بنایا گیا۔ اسی سال مجھے ریڈر کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۱۹۶۷ء میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی پائی۔ خدا کا ہر حال میں شکر کیا۔ یہ ادا بہر حال باقی رہی کہ اپنے لئے کبھی ترقی کی فرمائش نہیں کی۔

ابتدائی دو سال میں ایم۔ اے کلاس گھر پر کئی کئی گھنٹے لیتا رہا۔ احباب نے بہت اصرار کیا مگر میں نے کبھی اس کا الگ معاوضہ طلب نہیں کیا۔ انہی دو سال میں میں انڈر گریجویٹ کلاسوں کے ساتھ ایم۔ اے لیتا رہا تھا۔ یار دوستوں نے بہت مجبور کیا۔ اور یونیورسٹی کے قواعد بتائے۔ تو میں نے ان قواعد کے تحت زائد کام کا معاوضہ طلب کیا، مگر رجسٹرار صاحب نے "کرم" یہ کیا کہ اُن دو سال میں سے صرف ایک کا معاوضہ دینا طے کرایا اور وہ بھی اس سال کا جس میں کچھ کم پیریڈ بنتے تھے۔

پشاور یونیورسٹی میں سبکدوشی کی عمر پچپن سال تھی مگر یونیورسٹی کو اختیار تھا کہ چاہے تو ساٹھ سال تک توسیع دے سکتی ہے۔ اس طرح ۱۹۶۱ء میں مجھے سبکدوش ہونا تھا۔ وقت آنے پر سخت ترین تردد اور پریشانی تھی۔ بڑے دونوں صاحبزادے تعلیم کے آخری مرحلوں میں تھے۔ اور سب چھوٹی جماعتوں میں اسکول اور کالج میں تھے۔ غرض سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ یونیورسٹی نے اول ایک سال اور پھر مزید ایک سال کی توسیع دی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اسی دوران یونیورسٹی کا قاعدہ بدل گیا، اور ریٹائرمنٹ کی عمر ساٹھ سال ہو گئی۔ مگر ۱۹۶۶ء جب ساٹھ سال کا ہونے آیا تو بحمدہٖ تعالیٰ کوئی پریشانی نہ تھی۔ بڑے تینوں لڑکے برسرکار ہو چکے تھے۔ دو لڑکیوں کی شادی سے فارغ ہو گیا تھا۔ اور وہ دونوں شاد آباد تھیں۔ دو لڑکے

اور ایک لڑکی زیرِ تعلیم تھے۔ مگر خدا کا شکر ہے اِس وقت اُس طرح کی کوئی پریشانی اور تشویش نہ تھی جیسی ۱۹۶۱ء میں ۵۵ سال کی عمر میں سبکدوشی کے خوف سے لاحق تھی۔

۱۹۶۶ء میں ساٹھ سال کا ہوگیا مگر یکے بعد دیگرے ایک ایک سال کی توسیعات ملیں اسی زمانے میں انقرہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو و پاکستان اسٹڈیز تقرر ہوگیا۔ اور وہاں جانے کے بعد پشاور یونیورسٹی کی ملازمت سے مئی ۱۹۶۸ء میں کامل سبکدوشی ہوگئی۔

ریڈری کے عہدے پر ترقی پانے کا واقعہ بھی دلچسپ اور عجیب ہے۔ میں دفتر جاکر کام کی ٹوہ میں لگے رہنے سے ہمیشہ دور رہا۔ کلرک چھوڑ چپڑاسیوں تک سے میری ملاقات، یاری اور دوستی کی رہی ہے۔ لیکن انتظامی امور کی درک میں لگے رہنے کا مزاج ہی میں نے نہیں پایا۔ مثلاً ۱۹۵۵ء میں میں دفتر کا انچارج تھا تو سنڈیکیٹ وغیرہ کی رودادیں میرے سامنے آتیں اور میں بطور فرض منصبی ان سے واقف ہوتا ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۸ء تک کے زمانے میں میں نے کبھی سنڈیکیٹ کی روداد پڑھنے کیلئے تگ ودو نہیں کی۔ حالانکہ دفتر سے لیکر یا کسی پروفیسر کے پاس جاکر پڑھ لینا میرے لئے آسان کام تھا۔ مگر اس قسم کے تجسّس کی طبیعت ہی نہیں۔ ہاں! اس دوران میں شاید تین یا چار دفعہ سنڈیکیٹ کی روداد کسی نے خود ہی دکھا دی ہے تو پڑھنے کو ملگئی ہے۔

کہنا یہ تھا کہ ۱۹۶۲ء میں ریڈری کے عہدے کے لئے سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہونے کا حکم ملا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ معاملہ درپیش ہے۔ یونیورسٹی سے گھر آیا تو اول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کا حیدرآباد سے خط اور پھر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا لاہور سے تار ملا کہ ہم فلاں فلاں گاڑی سے پہنچیں گے۔ ان کی آمد اور سلیکشن بورڈ کے جلسے کا دن یکم رمضان المبارک تھا۔ بہرحال اول ایک صاحب کو اور پھر دوسرے صاحب کو اسٹیشن جاکر لایا۔ اور پھر ہم سب بورڈ کے جلسے کے لئے یونیورسٹی آئے۔ یہاں پہنچکر پتہ چلا کہ بہت سے افراد کا انٹرویو ہے، سب ترقی ہی کے سلسلے میں تھے۔ میں نے ڈاکٹر عبداللہ صاحب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کو رجسٹرار صاحب کے دفتر میں بٹھادیا خود اندر باہر آتا جاتا رہا۔

سلیکشن بورڈ کا وقت آیا تو برآمدے میں عبدالحمید بٹ صاحب (ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم) سے ملاقات ہوئی جو جلسے کی شرکت کے لئے آئے تھے، مجھے دیکھکر تپاک

سے آگے بڑھے اور کہنے لگے" فاروقی صاحب! مجھے تو خیال تھا کہ اب آپ پروفیسر بننے والے ہوں گے مگر ابھی تو آپ ریڈر بھی نہیں ہوئے!" میں نے جواب دیا کہ میں نے کبھی اپنے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ بس اپنے کام سے کام رکھا ہے۔ ہمیں باتیں کرتے دیکھکر مولوی احمد حسن صاحب رجسٹرار آگے بڑھ آئے اور مجھ سے بولے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ (ان کو خیال ہو گا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے اپنے لئے کچھ کہہ رہا ہوں گا۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ فارسٹ کے افسر اعلیٰ ہیں اور وہ بھی سلیکشن بورڈ اور سنڈیکیٹ کے ممبر تھے) میں نے احمد حسن صاحب سے کہا کہ "میں بٹ صاحب کو یہ بتا رہا تھا کہ یہاں کام صرف اسی شخص کا ہوتا ہے جو خوشامد میں لگا رہے۔ اور ہم نے کام کرنا تو سیکھا ہے۔ خوشامد کبھی نہیں کی" میں اس کے بعد ارادتاً وہاں سے ہٹ آیا کہ بدمزگی کی کوئی بات نہ ہو۔

غرض چند اشخاص کے انٹرویو کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کو اندر کمرے میں طلب کیا گیا۔ وہ دونوں تھوڑی دیر کے بعد برآمد ہوئے اور بولے "چلئے" میں نے کہا مجھے تو آپ نے اندر انٹرویو کے لئے طلب کیا ہی نہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب بولے "آپ کو بلا کر کیا اپنی بے عزتی کرانی تھی" میں چپ ہو گیا اور ہم سب گھر لوٹ آئے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کو اس وقت کی بس سے راولپنڈی جانا تھا، فرمایا کہ میں وہاں کے لوگوں کو مطلع کر چکا ہوں۔ میں انہیں بس میں بٹھانے گیا تو فرمایا کہ تفصیل تو بہت ہے۔ مگر اتنا سن لیجئے کہ اول تو ایک رکن نے (ڈائرکٹر تعلیم) وائس چانسلر صاحب سے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ فاروقی صاحب پروفیسر ہوں گے انہیں تو ابھی ریڈر بھی نہیں بنایا گیا۔ یہ بڑی حق تلفی ہے" وائس چانسلر صاحب نے کہا میں نے اسی لئے آپ حضرات کو زحمت دی ہے۔ پھر انہوں نے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کیطرف دیکھا تو انہوں نے کہا " فاروقی صاحب ہم سب مدرسین اردو میں سینئر ہیں میں تو انہیں اپنے اُستاد کے درجے پر سمجھتا ہوں"۔ پھر وائس چانسلر صاحب نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی طرف توجہ کی تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا :۔ " فاروقی صاحب کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اس کے برعکس اگر ان سے میری

بعت استفسار ہوتا۔ تو کوئی بات بھی تھی۔ وہ اتنے پرانے اُستاد ہیں اب ان کی ریٹائر منٹ کا وقت قریب ہے۔ میں تو کہوں گا کہ ان کو زیادہ سے زیادہ انکریمنٹ دئے جائیں۔" سلیکشن بورڈ تو کئی انکریمنٹ منظور کرلیتا مگر احمد حسن صاحب رجسٹرار بیچ میں حائل ہوئے۔ اور انہوں نے دو انکریمنٹ منظور ہونے دئے۔ میں نے تفصیلات سُنیں تو دل سے کہا کہ مجھے ریڈری کی اتنی خوشی نہیں جتنی ان باتوں پر ہے جو میری بابت وہاں کہی گئیں۔ خدا کا شکر ادا کیا اور "تحدیث نعمت" ہی کے طور پر اسوقت لکھ رہا ہوں۔

۱۹۶۷ء کے اواخر میں جب پروفیسری کے عہدے پر ترقی کا اطلاع نامہ آیا ہے تو تعجب کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ میں نے اس بارے میں کسی اور سے بھی کچھ نہیں سُنا تھا۔ سوچا کہ وائس چانسلر صاحب کا شکریہ تو بہرحال ادا کرنا ضروری ہوگیا۔ یہاں بھی اپنی قلندرانہ وضع خدا نے قائم رکھی۔ اسی شام کو کانوکیشن ہال میں کوئی جلسہ تھا۔ میں وقت سے پہلے پہنچا۔ وائس چانسلر صاحب بھی کافی قبل از وقت آگئے تھے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور کہا کہ "آج ہی یہ پروانہ ملا ہے۔ آپ نے بڑا کرم کیا اور "بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے۔" فرمانے لگے "نہیں! آپ اب سے بہت پہلے اس اعزاز کے مستحق تھے۔ اب بھی دیر ہوئی۔" میں نے کہا کہ بہرحال آپ کے کرم اور نوازش کا نہایت شکر گزار ہوں۔ غرض شکریہ کا کام بھی قلندرانہ طور پر پورا ہوگیا۔

غرض خدا کے فضل وکرم سے پشاور کی ملازمت کے دوران شہرت، عزت اور نیکنامی ہر گونہ حاصل رہی۔ وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔ ایم۔ اے کا نتیجہ بھی ہر سال بہت اچھا نکلتا رہا۔ میرے سامنے دس امتحان (فائنل) ہوئے۔ ایک سال تو نہ شعبہ کا کوئی فرسٹ ڈویژن میں آیا تھا نہ پرائیویٹ۔ اس سال کو شامل کرکے چار سال یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدوار فرسٹ آئے۔ باقی چھ سال میں میرے ہی شعبے کے طالب علم فرسٹ پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ اس سے بھی شعبے کی مقبولیت بڑھی۔

(۸) انقرہ یونیورسٹی کی ملازمت کے لئے میں نے سب سے پہلے ۱۹۵۵ء میں عرضی دی تھی۔ چار چار سال بعد معاملہ ابھرتا اور ٹلتا رہا۔ ۱۹۵۹ء میں مرکزی وزارتِ تعلیم نے پھر پوچھا کہ تم جانے کو تیار ہو کہ نہیں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ادھر سے پھر خاموشی۔ ۱۹۶۳ء میں پھر استفسار آیا۔ میں نے پھر (بالواسطہ بتوسل یونیورسٹی) اثبات

میں جواب دیا۔ اس وقت رجسٹرار صاحب کو تو ایسا یقین تھا۔ کہ انہوں نے جون میں سنڈیکیٹ سے دو سال کی رخصت بوضع تنخواہ منظور کرا کے مجھے مطلع کر دیا تھا۔ مگر اس کے بعد پھر تعطّل۔

۱۹۶۷ء میں جنرل شیخ صاحب نے جو انقرہ میں ہمارے سفیر تھے۔ وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی حمید احمد خان صاحب کو نجی خط لکھا کہ انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے لئے کوئی موزوں آدمی تجویز کریں۔ خاں صاحب قبلہ نے میرا نام تجویز کیا۔ تب شیخ صاحب نے ہمارے وائس چانسلر صاحب کو لکھا۔ اب مجھے بھی کچھ یقین ہوا کہ شاید جانا ہو جائے۔ شاید جولائی یا اگست ۱۹۶۷ء کے دن تھے کہ ہمارے وائس چانسلر محمد علی صاحب نے مجھے بُلا کر اقراری جواب طلب کیا تھا۔ اس وقت سے پھر بات ٹلتی رہی۔ مئی ۱۹۶۸ء میں مجھے دوسری توسیع کے بعد پشاور یونیورسٹی سے سبکدوش ہو جانا تھا۔ اس لئے میں نے رخصت طلب کی جو ۱۵ر فروری سے تین ماہ کی منظور ہوئی۔

۵ر فروری کو رجسٹرار صاحب نے (اس وقت مکرمی ضیاء الدین صاحب رجسٹرار تھے) بُلا کر بتایا کہ لو یہ پروانۂ تقرری آگیا۔ اب جانے کی تیاری کرو۔ چنانچہ میں تیاری میں لگ گیا۔ مزید رخصت لینی ضروری نہ جانی۔ ۱۵ر فروری سے منظور ہو ہی چکی تھی۔ ۲۵ر فروری کو پشاور سے روانہ ہوا۔ سارا راستہ ہوائی جہاز سے طے کرنا تھا۔ چند گھنٹے لاہور میں رک کر شام کو حیدرآباد گیا۔ وہاں والدہ کے پاس دو دن رہا۔ حیدرآباد سے ۲۷ر فروری کی رات کو کراچی پہنچا۔ جہاں سے یکم مارچ کو چل کر شام کو انقرہ پہنچ گیا۔

ترک کیسے اچھے لوگ ہیں اور پاکستان سے کیسی محبت رکھتے ہیں۔ یوں تو اس کے سینکڑوں واقعات سُنا سکتا ہوں۔ مگر پہلی بات ہی سے اندازہ کیجیے۔ میں یکم مارچ کو شام چار بجے انقرہ پہنچا تھا۔ اگلے دن ۲ر مارچ کو فیکلٹی کے ڈین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ بعض اور پروفیسروں سے جو اس وقت ان کے کمرے میں ملنے آگئے تھے، بُلایا۔ اخلاق کیا۔ اور سیکرٹری کو بُلا کر حکم دیا کہ ان کو یکم مارچ سے حاضر گردانا جائے اور اسی

کے مطابق کا غذات مرتب کئے جائیں۔ میں نے عرض بھی کیا، کہ میں انقرہ ۸ بجے شام پہنچا تھا۔ بولے کیا مضائقہ ہے۔ ترکی میں داخل تو ہو گئے تھے نا!

اس طرح انقرہ یونیورسٹی کی ملازمت شروع ہوئی۔ انقرہ یونیورسٹی کی بہت سی فیکلٹیاں ہیں۔ گیارہ ہیں۔ ہر فیکلٹی دوسری سے بالکل الگ اور دوری پر ہے زراعت اور ویٹرنری فیکلٹیاں اور پولٹیکل سائنس اور قانون کی فیکلٹیاں البتہ باہم متصل اور ملحق ہیں۔ ہماری فیکلٹی کو سمجھنے کے لئے آپ ادبیات فیکلٹی کہہ لیجئے۔ (جیسا کہ انگریزی میں اس کا ترجمہ فیکلٹی آف لیٹرز کیا جاتا ہے) مگر یہ صحیح نہیں۔ اسلئے کہ پولٹیکل سائنس، اکنامکس اور صحافت کے علاوہ "آرٹس" کے تمام مضامین اسی فیکلٹی میں ہیں۔ سب سے پرانی بھی یہی فیکلٹی ہے۔ اور بالکل وسط شہر میں شاہراہ اتاترک پر واقع ہے۔ اسی کا اصل نام "دل تاریخ و جگرافیہ فاکلتی" (یعنی دل = زبان تاریخ = تاریخ۔ جگرافیہ = جغرافیہ)

ہماری یونیورسٹی میں مغربی زبانیں اضافی مضمون اور علیحدہ سند کے کورسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مگر انقرہ کا نظام بالکل جداگانہ ہے۔ زبان بھی یہاں ایک لازمی مضمون کے طور پر لی جاتی ہے۔ بہت سے مضامین ہیں۔ ان میں سے طالب علم (گروپ کے مطابق) خود انتخاب کرتا ہے۔ تو اُردو بھی یہاں اسی طرح تھی یعنی Main سبجکٹ کے طور پر لیجئے۔ یا کسی دوسرے Main سبجکٹ کے ساتھ سبسی ڈیری کے طور پر۔ میرے پاس سبھی طلبہ وہ تھے جنہوں نے اُردو کو بطور مین سبجکٹ لیا تھا۔

میرا عہدہ تھا "پروفیسر و صدر شعبہ اُردو و مطالعہ پاکستان۔ (پاکستان اسٹڈیز)" یہاں بڑی آزادی اور اختیارات ہیں۔ پروفیسری کا سچ مچ کا مزہ ہے تو انقرہ میں۔ پڑھانے میں مجھے تو کوئی محنت پڑتی نہ تھی۔ اسلئے کہ ابتث اور قاعدے سے کام کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔ پھر پہلی، دوسری اور تیسری کتاب۔ اسی کے ساتھ قواعد (گرامر) لکھنے۔ بولنے کی مشق وغیرہ وغیرہ۔ ان ابتدائی چیزوں میں کیا بار معلوم ہوتا۔ پھر اس لئے بھی کہ میرے اسسٹنٹ میری ترجمانی کرتے تھے۔ شوکت بوٹو صاحب ترک ہیں۔ لاہور میں چار سال رہ کر ایم۔ اے عربی اور ایم۔ اے اسلامیات کیا تھا اسلئے کام چلاؤ اُردو جانتے تھے۔ میں نے ان کو "اُردو نثر کے زرّین دور" پر مقالہ لکھنے میں مدد دی تھی۔ میرے آنے سے قبل کام مکمل ہو گیا

تھا۔ مگر نظرثانی کے مراحل باقی تھے۔ بعد میں پروفیسر ڈاکٹر عابدین اِتل (صدر شعبہ سنسکرت) نے شوکت بولوکے مقالے کو پیش کرایا۔ اور شکر ہے انہیں اس مقالے پر ڈاکٹریٹ مل گئی۔ ڈاکٹر اسسٹنٹ بن جانے کے بعد وہ اب تدریس کے مجاز ہو گئے ہیں۔ میرے آنے کے بعد دوسرا کوئی شخص انقرہ نہیں گیا۔ بس شوکت صاحب کام چلا رہے ہیں ۱۹۷۲ء کا تعلیمی سال ختم پر ہے، آگے خدا جانے۔

تنخواہ کا معاملہ یہ تھا کہ پروفیسر کی تنخواہ کی اعلیٰ حد =/۲۵۰۰ ٹرکش لیرا ہے۔ مگر لطیفہ یہ نکلا کہ اس میں سے کوئی گیارہ سو لیرا ماہانہ انکم ٹیکس وغیرہ کے کٹ جاتے تھے۔ مگر ایک دلچسپ بات یہ بھی نکلی کہ یہ فیکلٹی ڈبل شفٹ ہے۔ رات کو بھی سارے درجات کی پڑھائی ہوتی ہے۔ اور رات کا معاوضہ الگ ملتا ہے۔ اور اتنا ملتا ہے کہ ہمارے ہاں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یعنی سو لیرا فی لکچر۔ تو رات کا معاوضہ دس ہزار لیرا ماہانہ تک بنتا ہے۔ کلاسوں کی کمی بیشی سے کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ انکم ٹیکس اس میں سے بھی اسی حساب سے کٹتا تھا۔ پھر بھی رات کا معاوضہ ملا کر بڑی برکت تھی۔ اسی لئے یہ آسان ہوا کہ میں نے بڑی آسانی اور اطمینان سے حج کر لیا۔ ایک چھٹی میں عراق کی زیارات کر آیا۔ ہر سال تعطیل کلاں (جولائی تا ستمبر) میں پاکستان آتا رہا۔ مستقل واپسی کے موقع پر بیروت، دمشق اور حرمین الشریفین میں حاضری دیتا ہوا لوٹا۔ آخری سال میں رات کا معاوضہ محدود کر دیا گیا تھا۔ یعنی "مہینے میں ۳۲ لکچروں سے زیادہ کا معاوضہ نہیں ملے گا، چاہے تم زیادہ کلاس لو"۔ اس سال تین درجات ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے رات کا کام بھی دن کے برابر (یعنی آٹھ پیریڈ فی ہفتہ سے کئی پیریڈ زیادہ) رکھا۔ آخر ان طلبہ کا بھی تو حق تھا کہ کام پورا ہو!!

انقرہ اور ترکی کا حال میں نے علیحدہ کاپی میں لکھا ہے اس لئے یہاں اسی پر بس کرتا ہوں اتنا اضافہ البتہ مناسب ہے کہ ترکوں سے بہتر قوم اور ترکی سے اچھا ملک شاید ہی کوئی ہو۔ اور پاکستانیوں کے ساتھ تو کمال محبت سے پیش آتے ہیں۔ پھر بحیثیت مجموعی بہت اچھے مسلمان ہیں۔

لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ جب تم ترکی کے اتنے مداح ہو اور تنخواہ بھی بہت اچھی ملتی تھی تو بھاگ کیوں آئے: میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ "میں نے مشرق وسطیٰ کے سارے اسلامی

ممالک دیکھ لئے۔ حج کی سعادت نصیب ہوگئی۔ مدینہ منورہ میں حاضری کا شرف مل گیا۔ چالیس سال سے اوپر نوکری کرلی۔ اب کب تک ملازمت کئے جاؤں۔ ابھی کچھ ہمت اور طاقت باقی ہے۔ گھر رہ کر آرام بھی کروں گا۔ اور لکھوں گا، پڑھوں گا بھی۔ بہت سی چیزیں ناقص ہیں ان کو مکمل کروں گا۔" میں ہی کنٹریکٹ کو قبل از وقت ختم کرکے لوٹ آیا۔

داڑھی کی داستان بھی یہاں دہرانی مناسب ہے۔ جب ملازمت شروع کی، تو بے ریش و بروت تھے۔ جون ۱۹۲۹ء میں داڑھی چھوڑی۔ پاکستان آنے کی نیت کے ساتھ میں نے یہ ارادہ بھی کرلیا تھا۔ (اور آگرہ میں نجی صحبتوں میں کہہ بھی دیا تھا) کہ داڑھی مونچھ صاف کردونگا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے ناپسند تھی۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ اس لئے کہ بال قبل از وقت سفید ہوگئے تھے۔ جو دیکھتا پیر فرتوت جانتا۔ اور مجھے ابھی نوکری کرنی تھی۔ ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ میں تین دن رکا۔ برابر رفع کرنے کی نیت رہی مگر ہمت نہ ہوئی۔ پھر ڈھاکہ پہنچکر کیا موقع تھا۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ سے پشاور کے لئے روانہ ہوا۔ تو پھر کلکتہ اور اس کے بعد لاہور میں اس کام کا ارادہ کیا۔ مگر اب بھی ہمت نہ ہوئی۔ آخر مع داڑھی کے ۱۳۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو پشاور وارد ہوا۔ چند روز بعد گھر ہی میں صاف کرڈالی۔ گویا پشاور والوں نے مجھے بغیر ڈاڑھی مونچھ کے ہی دیکھا۔ اور اسی طرح لاہور وغیرہ کے لوگوں نے صاف پایا۔ بس پرانے جاننے دیکھنے والے ملتے تھے، تو انہیں سخت اچنبھا ہوتا تھا۔

پشاور داڑھی لیکر آیا تھا جیسا کہ عرض کیا۔ ان دنوں غزالہ بیٹی دو سال سے بھی کم کی تھی اور وجو بھی زندہ تھی۔ وجو نے میری بیوی کو ہی نہیں میرے سارے بچوں کو بھی کھلایا ہے۔ بقولِ بعض احباب کے وجو میری بیوی کے جہیز میں آئی تھی۔ تو غزالہ نے مجھے پشاور تقریباً نو مہینے کے بعد دیکھا۔ میں اسے قریب بلاتا تھا تو وہ کھنچی کھنچی تھی۔ ایک دفعہ وجو نے کہا جاؤ تمہارے ابا ہیں۔ تو غزالہ برجستہ بولی۔ "ابا نہیں کوئی بڈھا ہے"۔ سب ہنس پڑے۔ میں نے یہ لطیفہ دوسرے احباب کو سنایا۔ بعض تو اب تک یہ فقرہ چست کرتے ہیں کہ غزالہ کے فقرے سے جھینپ کر تم نے داڑھی منڈوائی تھی۔ مگر واقعہ وہی ہے جو میں نے پہلے عرض کیا۔ غزالہ کے فقرے سے بھی تو میرے اس (مہمل) خیال کی تصدیق ہوئی!!

القصہ ۱۴۔ فروری ۱۹۶۹ء کو جہاز سے جدہ جانا ہوا تھا۔ وہ دن راستے میں

کٹا۔ اگلا دن جدہ میں مدینہ منورہ کے لئے جہاز کے ٹکٹ اور نشست حاصل کرنے کی کوشش میں گذرا۔ ۱۶ر فروری کو دیار پاک حاضری ہوئی۔ بس اس دن کے اب سے ہمت ہی نہ ہوئی کہ اب ڈاڑھی کو پھر تختہ مشق بنایا جائے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد دوسروں نے تو بڑھے ہوئے بال مونڈ ڈالے۔ مگر میں نے پھر ڈاڑھی مونڈنے کا خیال کبھی نہ کیا۔

انقرہ واپس آیا اور فیکلٹی گیا تو ڈین صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرنے گیا۔ میری داڑھی دیکھ کر بے ساختہ بولے۔ "بیوک حاجی" (یعنی بڑا حاجی) اور پھر بہت اخلاق سے ملے اور مبارک باد دی۔

چند روز کے بعد سفارت خانے گیا۔ سفیر صاحب بے حد مصروف تھے۔ میں ان کے بالکل سامنے کے دروازے سے داخل ہوا۔ دیکھتے ہی کہنے لگے "ارے آپ تو بالکل TRANSFORM ہو کر آئے"۔ پھر اُٹھے میز کا نصف دائرہ کاٹ کر آگے آئے۔ معانقہ کیا اور پر جوش مبارکباد دی۔ ان دونوں حضرات کے پر خلوص انداز اور خوش طبعی سے میں توفی الواقع بہت محظوظ ہوا۔

ماورائے ملازمت سرگرمیاں

میرے جدی وطن (بچھرایوں ضلع مرادآباد) میں ہمارے بزرگوں نے ایک "بچھرایوں کلب" قائم کیا تھا۔ بڑوں کے دور میں تو اس کی طرف سے بڑے اجتماعات بھی ہوتے تھے۔ مثلاً سنا ہے کہ ایک بار مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ایک اجتماع میں تشریف لائے تھے۔ اور دو دن جلسے رہے تھے بعد میں جب ہمارے یہ بزرگ اپنے دورِ کہولیت میں داخل ہو گئے تو بچھرایوں کلب بھی ماند پڑ گیا۔ ہمارے لڑکپن کے زمانے میں ان لوگوں نے یہ کلب نوجوانوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ اس صدی کی تیسری دہائی کی بات ہے۔

اس زمانے سے کافی عرصے تک ہم لوگ اس کے کرتا دھرتا رہے۔ ہم میں سے بعض نوجوان بچھرایوں ہی میں رہتے تھے۔ لیکن اکثر تعلیم (اور بعد میں ملازمت) کے سبب سے باہر ہوتے تھے۔ لہٰذا بچھرایوں کلب کی سرگرمیوں کا خاص زمانہ مئی جون کی تعطیلات کے دن تھے۔ ان دنوں میں ہاکی میچ، مشاعرے اور ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ جن کی وجہ سے قصبے میں خوب چہل پہل ہو جایا کرتی تھی۔ "بچھرایوں کلب" کی حیثیت تعلیمی اور سماجی کلب کی تھی۔

میں آگرہ آیا تو ابتدا ہی میں "حکیموں کی گلی" آنا جانا ہوا۔ یہ محلہ مسلمان شرفاء

کا پرانا محلہ تھا۔ یہاں کے بعض نوجوانوں نے "مجلس علمیہ عثمانیہ" قائم کر رکھی تھی۔ محمود الحسن خان صاحب اس کے روحِ رواں تھے۔ میں بھی ابتدا ہی میں اس کا رکن بن گیا تھا۔ مجلس کی کارروائیاں مشاعرہ، مباحثہ اور مختصر سوشل ملاقاتوں تک محدود تھیں۔ بعد میں اس کے ارکان بھی بکھر گئے۔ ملازمتوں کے باعث اکثر افراد بیرونِ آگرہ چلے گئے، تو چند سال بعد یہ مجلس خود ہی خاموش ہو گئی۔

۱۹۳۱ء سے گڑھیا حکیمان (ہسپتال روڈ آگرہ) ہمارے اجتماعات کا مرکز بنی۔ خاندانِ حکیمان کے اکثر نوجوانوں سے دوستانہ رسم تھی۔ سید انتظار الدین مرحوم کے گھر سب جمع ہوا کرتے تھے۔ اس مجمع کا نام "مجرڈلی" تھا۔ اس کی رکنیت اور عہدیداران سب زبانی جمع خرچ تھا۔ حکیم سید مبین الزمان قادری ہمارے ہم عمروں میں اس خاندان حکیمان کے اچھے طبیب تھے۔ بعد میں رجواڑوں کے معالجِ خصوصی رہے اور اسی زمانے میں راجاؤں کے ایک اجتماع میں ان کو "طبیب راجگان" کا لقب بھی دیا گیا۔ حکیم مبین صاحب کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی بھی تھے۔ اور اپنی داڑھی کی وجہ سے "مولانا" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ مولانا کی انگریزی دانی (بقول ان کے) صرف کنگ پرائمر تک محدود تھی۔ ان کی غلط انگریزی بعض بڑے دلچسپ اور معنی خیز فقرے کہلوا دیتی تھی۔ وہ اس مجمع احباب کو "مجرڈلی" کہا کرتے تھے۔ ان کی اصطلاح میں مجرڈلی کے معنی ہوئے "احباب کا مجمع"۔ MAJORITY کا تلفظ اور معنی دونوں کے بگاڑ نے یہ اصطلاح ایجاد کرائی تھی۔ اور پھر یہ نام مستقل چل نکلا۔ اور ہماری بولی میں ہر ایسے بے تکلف حلقے کے لئے استعمال کیا گیا۔ مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں جو ان کی تصنیف "نقد و نظر" میں شامل ہے، اس اصطلاح کا ذکر کر کے اسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ "مجرڈلی" پر میں نے ایک طویل نظم انہی دنوں میں کہی تھی، جو میرے مجموعہ کلام میں درج ہے۔

مجرڈلی کے اجتماعات کبھی زیادہ تر مئی جون ہی میں جمکتے تھے۔ ویسے مقامی احباب کی بدولت باقی مہینوں میں بھی جماؤ ہوتا رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ مجمع بھی بکھر گیا۔ سبھی پاکستان چلے آئے۔ بعض حضرات جو آگرہ میں رہ گئے۔ ان ایام کی یاد میں ان کا سرمایۂ حیات رہی اور جو پاکستان میں آ کر بکھر گئے وہ جب کبھی

دو چار باہم مل جاتے ہیں۔ ان قیمتی یادوں کا لطف لے لیتے ہیں۔

میں اگست ۱۹۳۴ء میں آگرہ آگیا۔ آگرہ کی علمی اور ثقافتی تحریکوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ مشاعروں کی صدارت تو میرے لئے ایک عذاب بن گئی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ میرے بزرگوں میں سے ان تین اصحاب نے (مولانا حامد حسن قادری، مولانا عابد حسن فریدی، سید محمد علی شاہ سیکش اکبرآبادی) تو شاید طے یہ کرلیا تھا کہ اپنی بجائے مجھ ہی سے صدارت کرائیں گے۔ اسکول، کالج، انجمن کے ارکان صدارت کے لیے ان کے پاس فرمائش کرنے جاتے تھے، تو وہ میری طرف بھیج دیتے تھے۔ اور میرے لئے ان کا اشارہ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے شرکت کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ صدارت نہیں کروں گا۔ تو بھی وقت پر پکڑا جاتا تھا کہ پھر آگرہ کے شعراء اور شرفا میں سبھی میرے کرم فرما یا بزرگ یا دوست تھے۔ اس لئے انکار کی مجال نہ تھی۔ غرض مشاعروں کی صدارت سے تو میں واقعی اکتا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ جیسے میں کوئی "پیشہ ور" صدر بن گیا ہوں۔

مجتبیٰ مصطفےٰ خان آرزو نے اصرار کرکے جس طرح دو ٹورنامنٹوں کا سیکرٹری بنایا تھا۔ اسی طرح انہوں نے ۱۹۳۶ء میں سیرت کمیٹی آگرہ کا نائب صدر بنایا۔ نواب محمد فیاض خان صدر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مجھی کو سیرت کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ جو میں پاکستان آنے تک بنا رہا۔

۱۹۴۴ء سے اورینٹ پریس آف انڈیا کا آگرہ میں اعزازی نمائندہ تھا۔
۱۹۴۱ء سے آگرہ کالج لائبریری کا انچارج اور آنریری لائبریرین رہا۔ ۱۹۴۴ء سے کالج کے ہاکی کلب کا صدر رہا۔

آگرہ کالج میں ۱۹۳۴ء سے کالج میگزین کے شعبۂ اردو کی نگرانی اور ادارت کا کام میرے ذمے رہا۔ ۱۹۴۹ء میں اسلامیہ کالج پشاور آیا تو یہاں کے میگزین کا شعبۂ اردو میرے سپرد ہوا۔ اسلامیہ کالج پشاور کی زبانوں کی انجمن کی نگرانی ۱۹۴۹ء میں میرے سپرد کی گئی۔ خیر سے اس کے آئین و ضوابط تک نہ تھے۔ میں نے بنائے اور منظور کرائے۔ میں نے ہی اس کا نام بدل کر "بزم ادب" رکھوادیا۔ یہ نام سرحد میں بہت مقبول ہوا۔ اور اکثر کالجوں کی انجمن السنہ شرقیہ نے یہی نام اختیار کیا۔ ۱۹۵۲ء

میں ڈھاکہ یونیورسٹی گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں "خاور کوآپریٹو سوسائٹی" بنائی گئی ہے جس کی نگرانی میں "خاور" نام کا ماہنامہ شائع کیا جائے گا۔ میرے ڈھاکہ پہنچنے سے قبل ہی مجھ کو اس سوسائٹی کا آنرری سیکرٹری بنا دیا گیا۔ "خاور" کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر شادانی صاحب مرحوم تھے۔ رسالہ سال بھر نہایت خوبی سے نکلا۔ مگر خسارہ ہی خسارہ تھا اسلئے بند کرنا پڑا۔

شعبہ اردو فارسی (پشاور یونیورسٹی) کا رسالہ "خیابان" نکلا تو مجھے انچارج بنایا گیا۔ یہ سالانہ اشاعت علمی حیثیت سے پسند کی گئی۔ بعد کو فارسی اور اردو شعبے الگ الگ ہوئے تو "خیابان" شعبہ اردو کو ملا۔ اور کامیابی سے جاری رہا۔ اور اب بھی ہے۔ میں نے اس کا "اقبال نمبر" بھی اعلیٰ پیمانے پر شائع کیا تھا۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں "اردو زبان وادب کا خصوصی شمارہ" (۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک) ساڑھے چھ سو صفحے کا شائع کیا تو بے حد پسند کیا گیا۔ اور بہت سراہا گیا۔ بہت اچھے ریویو شائع ہوئے۔ نگار۔ پاکستان کراچی نے بڑا ریویو شائع کیا تھا۔ اس کا یہ جملہ خوب تھا۔ "جو کام لاہور کراچی کے کرنے کا تھا وہ پشاور نے کر دکھایا۔"

۱۹۶۵ء میں ہمارے شعبہ اردو کی انجمن اردو نے جو جلسے کئے، وہ یادگار حیثیت کے حامل تھے (۱) ڈاکٹر شوکت سبزواری کو تین توسیعی خطبات لسانیات کے لئے اپریل ۱۹۶۹ء میں بلایا تھا۔ ایسے ٹھوس مقالات کے ہوتے ہوئے تینوں دن ایسا زبردست اجتماع تھا کہ باید و شاید۔ (۲) انہی دنوں جشن خیبر کے سلسلے میں عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ جس میں پچاس سے زیادہ شعراء باہر سے آئے تھے۔ کامیاب رات بھر کا مشاعرہ تھا۔ اسکے بعد یونیورسٹی کے کانووکیشن ہال میں مشاعرہ ہوا۔ جس میں تقریباً بیس ممتاز شعراء شریک تھے۔ اس کے بعد میں نے شعبے میں مشاعرہ کیا۔ اس میں صرف پانچ شعراء کو دعوت دی تھی۔ شادانی صاحب، فیض صاحب، احمد ندیم قاسمی صاحب، قتیل شفائی صاحب، جوش صاحب۔ دو تین احباب شعراء نے اور کرم کیا تھا۔ ڈھائی گھنٹے کا یہ مشاعرہ شادانی صاحب کی صدارت میں ایسا کامیاب ہوا کہ خود مجھے حیرت تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ تیس سال سے ایسا عمدہ مشاعرہ اور ایسی اچھی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔ (جوش صاحب

شریک نہیں ہو سکے تھے۔

اس اپریل ۱۹۶۵ء میں نے انجمن کی طرف سے یوم اقبال منعقد کیا۔ یوں تو ہمارا یوم اقبال ہر سال کامیاب رہا ہے۔ لیکن اس دفعہ تو خود میری توقعات سے بڑھکر کامیاب رہا۔ بلکہ ایک مثالی اور یادگار جلسہ ہوا۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کو میں نے بمشکل صدارت کیلئے راضی کیا تھا۔ اور ان کا کرم کہ باوجود ہزار مصروفیتوں کے آنا منظور کیا۔ خوش قسمتی سے بشیر احمد صاحب مرحوم (مدیر ہمایوں) ان دنوں آئے ہوئے تھے۔ اور ہمارے توسیعی لکچروں میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی مقالہ پڑھا۔ اور اس جلسے کے لئے نیا مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے توسیعی لکچروں کے بعد اس جلسے کیلئے رک گئے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے رائٹرز گلڈ کی جانب سے شرکت کی۔ حسن اتفاق کہ ڈاکٹر حسین خطیبی (ڈپٹی اسپیکر ایرانی مجلس اور صدر شعبہ ادبیات تہران یونیورسٹی) اور ڈاکٹر بدیع الزماں فروزانفر بھی شرکت کے لئے آئے اور تقریریں کیں۔ نیز ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے اپنی پر مغز تقریر سے سرفراز کیا۔ پشاور کے ممتاز شعراء کی نظمیں بھی پروگرام کو چمکا رہی تھیں اور کینٹ پبلک اسکول پشاور کے بچوں نے دو کورس ابتداء اور انتہاء میں اتنے عمدہ سنائے کہ سماں بندھ گیا۔

جلسے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں کے سب وائس چانسلر صاحبان (ماسوا دو کے) شرکائے جلسہ میں تھے۔ چار گھنٹے کا جلسہ، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا، سات تقریریں اور مقالے اتنی ہی نظمیں اور کمال یہ کہ ایک شخص بھی نہ تو کسمسایا اور نہ اٹھنے کا ارادہ کیا۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اور میاں بشیر احمد صاحب نے تو وہیں برملا کہا کہ ہم لاہور میں عرصہ دراز سے یوم اقبال مناتے آرہے ہیں لیکن حاضرین، مقررین، اجتماع اور پر مغز مفید مقالات کے اعتبار سے نہ تو ہم نے ایسا جلسہ دیکھا۔ نہ لاہور یا کہیں اور ایسا جلسہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

آگرہ میں علامہ اقبال کے وصال کے بعد ہم نے "بزم اقبال" قائم کی تھی اس

کے مشاعرے اور جلسے تعداد میں کم اور وزن میں زیادہ ہوتے تھے۔ اس بزم نے چند کتابیں بھی شائع کیں اور بزم اقبال کے جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین اور منظومات کا ایک مجموعہ بزم اقبال کے نام سے شائع کیا تھا۔

مگر میرا سب سے بڑا کارنامہ "جامعہ اُردو" کی تاسیس ہے۔ جامعہ اُردو ایک امتحان لینے والے ادارے کا نام ہے۔ اُردو یونیورسٹی کہئے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۸ء تک میں اس کا موسس اور اعزازی رجسٹرار رہا۔ بھارت بھر میں اس وقت تک اس کے ۵۶ مرکز بن چکے تھے۔ جب میں نے پاکستان آنا طے کیا تو اسے علی گڑھ منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر ظہیرالدین علوی اس کے اعزازی رجسٹرار قرار پائے۔ ۹ سال میں نے دن رات کی محنت اور اپنا خون پسینہ بہاکر جامعہ کی بنیادیں مضبوط کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ چودہ سال علوی صاحب نے اسے اپنا خون پسینہ بہاکر ایک مضبوط اور بلند ادارے میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ اب بھارت بھر میں سات سو سے زیادہ مرکز ہیں۔ سو کے قریب درسگاہیں ہیں جہاں جامعہ کے امتحانات کی تدریس ہوتی ہے۔ اس کی اپنی عمارت ہے۔ تنخواہ دار اسٹاف ہے۔ رجسٹرار تک اب تو عرصہ سے باقاعدہ تنخواہ پاتا ہے۔ غرض بھارت میں اُردو کی خدمت اور اشاعت کا کام اب تو جامعۂ اُردو ہی انجام دے رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو اشاعت و خدمت کے لحاظ سے اس کا کام انجمن ترقی اُردو کے کام سے کسی طرح کم نہیں۔ زیادہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ جامعہ اردو کے مارچ ۱۹۵۶ء کے کانوکیشن میں علوی صاحب نے مجھے علی گڑھ بلایا اور میں نے کانووکیشن کا خطبہ پڑھا۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے قیام (نومبر ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۴۹ء) کی مدت میں کالج کی انجمن اُردو کے جیسے کامیاب مشاعرے ہوئے تھے۔ وہ اب تک یادگار ہیں۔ ان دنوں خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی "ماہرِ زبان" کے طور پر ہمارے رفیقِ کار تھے۔ موصوف سے یہ طے تھا کہ مشاعروں کا انتظام تو میرے ذمے ہے اور مشاعرہ چلانا ان کے ذمے۔ ان مشاعروں کا نام دیوان خانہ ہوتا تھا۔ اور نشست فرش کی تھی۔ طلبہ میں بھی بڑے مستعد اور دانشور کارکن جمع تھے۔ آج تک ان میں سے کوئی مل جاتا ہے تو کہتا ہے کہ دیوان خانہ کے وہ اجلاس ایسے تھے کہ ابتک یاد کئے جاتے ہیں

لوگوں کو اس پر حیرت تھی کہ لاہور جیسے شہر میں جہاں (دوسرے بڑے شہروں کی مانند) مشاعرے صرف ہڑ بازی کا مرکز ہو گئے ہیں، یہ محفلیں انتہائی باوقار اور پُرسکون انداز میں منعقد ہوتی رہیں۔

۱۹۴۳ء میں میں آگرہ کے قیام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس قائمہ کارکن منتخب ہوا۔ (اب پاکستان میں آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے پانچ سال کے لئے ممبر مجلس قائمہ کارکن انتخاب کیا ہے) اور کانفرنس کی طرف سے ۱۹۴۵ء میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کا ممبر انتخاب کیا گیا۔ یہ دونوں رکنیتیں ۱۹۴۹ء تک تھیں۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں بھارت سے چلا آیا تو از خود ختم ہو گئیں۔

۱۹۴۳ء سے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کا ایسوسی ایٹ ممبر بنا۔ یہ رکنیت حین حیاتی تھی۔ لیکن تقسیم ملک کے ساتھ یہ بھی ختم ہو گئی۔

آگرہ کالج کے قیام کے زمانے میں آگرہ یونیورسٹی کی بہت سی جماعتوں کا رکن رہا۔ بورڈ آف اسٹڈیز ان اُردو پرشین۔ فیکلٹی آف آرٹس۔ اکیڈیمک بورڈ۔ ریسرچ ڈگری کمیٹی۔ اسی طرح پشاور یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز ان اُردو۔ اکیڈیمک کونسل اور سیکنڈری ایجوکیشن پشاور کی اکیڈیمک کمیٹی۔ بورڈ آف اسٹڈیز ان اُردو وغیرہ۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں سید الطاف بریلوی صاحب نے "مجلس مصنفین" قائم کی تھی۔ اس کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ ایک سالانہ جلسے کی صدارت بھی کی۔ پاکستان میں اورینٹل کانفرنس لاہور میں شرکت کی اور اس کی انتظامیہ کا رکن بنا۔ اُردو تدریس کانفرنس لاہور اور منعقدہ کراچی کے جلسوں میں شرکت کی۔ ہر جگہ ایک ضمنی اجلاس کی صدارت بھی کی۔

۱۹۷۲ء میں گورنر صوبہ سرحد نے بحیثیت سیکنڈری بورڈ پشاور کے نگرانِ اعلیٰ کے مجھے دو سال کے لئے بورڈ کا رکن نامزد کیا۔

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور نے دو سال کیلئے اپنی "مجلس اعلیٰ" کا رکن نامزد کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکزی دفتر کراچی) نے اب تک دو بار مجھے انتخابی

کتب کے فیصلے کے لئے منصف مقرر کیا ہے۔ دوسری دفعہ اوائل ۱۹۷۱ء میں ترکی سے واپسی کے بعد۔ ایک بار اس سے چند سال قبل ترکی جانے سے پہلے مقرر کیا تھا۔ پہلی دفعہ "آدم جی ادبی انعام" میں اور دوسری دفعہ "داؤد ادبی انعام" میں۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات کے لئے دیر سے ممتحن مقرر ہوتا رہا ہوں۔ سندھ کراچی اور پنجاب یونیورسٹی والے اب تک چند در چند بار مقالات کا ممتحن بنا چکے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تین مقالات کا یکے بعد دیگرے ممتحن مقرر کیا اور دو مقالات کے لئے زبانی امتحان میں بھی ممتحن بنایا۔ سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹریٹ کے مقالات میں اکثر ممتحن بنا کے بعد میں بھی بلایا جاتا ہوں۔

انقرہ گیا تو پہلے سال تو فیکلٹی ادبیات میں اپنے شعبے کے استحکام میں لگا رہا۔ اگلے سال یوم اقبال منعقد کیا۔ میرے منعقد کردہ جلسوں کے مقابلے میں تو یہ کوئی بڑا جلسہ نہ تھا۔ لیکن شرکا نے غیر معمولی کامیاب گردانا۔ اس سے پہلے سال جو جلسہ ہوا تھا وہ تھا تو ہماری فیکلٹی ہی میں۔ مگر اس کا انعقاد "ترک پاک دوستی" کی انجمن کی طرف سے ہوا تھا۔ انقرہ میں فروری ۱۹۶۹ء کو غالب کی صد سالہ برسی کا جلسہ بھی منعقد کیا۔ اس جلسے میں مقالات کے بعد مشاعرہ تھا۔ یہ اجتماع بھی بہت کامیاب رہا۔ بعض پاکستانی دوستوں نے اس کی ساری کارروائی ٹیپ پر ریکارڈ کی تھی۔

ان "حرکتوں" کے بعد اگر کھیل کود پر نظر ڈالئے تو مجھے تو ایسا لگتا ہے۔ کہ زیادہ زندگی ان "جلسہ بازیوں" اور لہو لعب ہی میں گذری ہے۔

کھیل کود بچھرالیوں میں جس زمانے میں بالکل ابتدائی عمر تھی۔ ان دنوں گھر پر الٹے سیدھے کھیل ہوا کرتے تھے۔ کانپور گیا تو اسکول کے بچوں کے ساتھ ہاکی کھیلی۔ یہی سلسلہ پشاور آکر بھی رہا۔ پھر آگرہ آیا تو یہاں پھر ہاکی کھیلنے کا موقع ملا۔ اور ۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ فرینڈز یونین کلب میں کھیلا تو معلوم ہوا کہ اب میں اچھی ہاکی کھیلنے لگا ہوں۔ انہی دنوں کرکٹ بھی کھیل لیا کرتا تھا۔ کانپور کے پانچ سالہ قیام میں میں مستقل ہاکی اور کرکٹ کھیلتا رہا۔ اور معیار بھی بلند ہو گیا تھا۔ دو سال تو ہمارے اسکول کی کرکٹ ٹیم اتنی اچھی ہو گئی تھی کہ کانپور کے کالج اور کلب ہم سے دوستانہ میچ بھی نہیں کھیلتے تھے۔

کہ ہار گئے تو بدنامی ہوگی۔ ان دنوں حلیم شیلڈ میں ہم ایک کلب کی طرف سے کھیلا۔ غرض ان دنوں کھیل کچھ اچھا ہی کھیلتا تھا۔ بطور ڈیوٹی کے کچھ کھیلنا پڑتا تھا۔ اور شوق بھی تھا۔

آگرہ کانپور کے اس زمانے میں کبھی کبھی ٹینس بھی کھیلا اور اچھا خاصا کھیلنے لگا تھا۔ لیکن معیار بلند نہ تھا۔ دونوں جگہ والی بال بھی خوب کھیلی اور اچھی کھیلی۔ ۱۹۳۴ء میں آگرہ کالج آگیا۔ تو ابتدا میں تو اسٹاف کلب جاکر ٹینس کھیلنے کا سلسلہ رہا۔ پھر رفتہ رفتہ چھوٹ گیا۔ گھر زیادہ دور ہونے کی وجہ سے کالج سے واپس آکر دوبارہ جانا بھی مشکل تھا۔

جب میں آگرہ آیا ہوں تو یہاں آگرہ کی ڈسٹرکٹ ایسوسی ایشن (جس کا نام آگرہ اتھلیٹک ایسوسی ایشن تھا) میں حصہ لینا پڑا۔ انتظامیہ کا رکن بھی بنا۔ آنریری سیکریٹری بھی منتخب ہوا۔

۱۹۳۶ء میں مصطفیٰ خان آرزو صاحب نے دو ٹورنامنٹ شروع کیے تھے۔ آل انڈیا مولانا محمد علی میموریل فٹ بال ٹورنامنٹ اور بیرا ونشل قمر کی ٹورنمنٹ انہوں نے زبردستی دونوں کا سیکریٹری بنا دیا۔ خود جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ زیادہ بھاگ دوڑ وہ خود کرتے تھے، مگر مجھے بھی پھنسنا ہی پڑتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں میں نے ارادہ کیا کہ اب کھیلوں سے سبکدوش ہوکر علمی کاموں میں زیادہ وقت لگاؤں گا۔ تو بڑی مشکل پڑی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء دو سال اس کوشش میں صرف ہوئے تب کہیں یہ عادتیں چھوٹیں۔

تاش اور شطرنج کا شوق رہا ہے۔ دونوں کھیل بچپن میں خود والد مرحوم نے سکھائے تھے۔ ابتدا میں تو تاش کے کھیل کوٹ پیس، بلیک کوئین کی طرح کے تھے۔ آگرہ کالج کے زمانے میں برج شروع کیا۔ چھوڑنے کا ارادہ ہی تھا کہ انہی دنوں آکشن برج کی بجائے کنٹریکٹ برج کا رواج ہوا تو مجھے عذر مل گیا کہ میں نہیں جانتا۔ چنانچہ آگرہ ہی میں اسطرح تاش چھوٹ گیا تھا۔

آخر ۱۹۴۹ء میں اسلامیہ کالج پشاور میں پھر احباب کے ساتھ برج شروع کرنا پڑا اور یہ سلسلہ کم و بیش جاری رہا۔ ۱۹۶۵ء سے البتہ مستقل چھوٹ گیا۔ بطور حادثہ کے کبھی اتفاقیہ چند بار موقع ملا ہے ورنہ اب نجات ہے۔

یہی حال شطرنج کا ہے۔ کھیلنا تو لڑکپن سے تھا۔ کانپور میں ۱۹۳۰ء سے ہم لوگ چمن گنج منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں ہمایوں باغ میں قیام تھا۔ آس پاس کے گھروں کے سب لوگ دوست تھے۔ بعد مغرب محفل جمتی تھی۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ میں شطرنج نہیں جانتا۔ ایک روز اکبر حسین صاحب اور عبدالعزیز صاحب کھیل رہے تھے۔ میں کھیل کر یا بازار سے واپس آیا۔ اور دیکھنے لگا۔ اتفاق سے عبدالعزیز صاحب ایک غلط چال چلنا چاہتے تھے۔ میں نے ٹوک دیا۔ کچھ نہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر جب وہ بازی ختم ہوئی تو اکبر حسین صاحب بولے۔ آئیے اب آپ سے بازی ہو گی۔ میں نے کہا مجھے تو آتا ہی نہیں۔ کہنے لگے ابتک آپ چھپے رہے مگر اِس ایک چال نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

پھر تو کھیلنا پڑا۔ اس پارٹی میں کئی صاحب اچھا کھیلتے تھے۔ مگر میں سب پر بھاری پڑتا تھا۔ ۱۹۳۱ء ۱۹۳۲ء کا وہ زمانہ میرے بہترین شطرنج کھیلنے کا تھا۔ پھر سلسلہ چھوٹ گیا۔ آگرہ میں نہیں کھیلی۔ اسلامیہ کالج پشاور میں پھر کھیلنی پڑی اور کچھ دن کی مشق کے بعد اچھی خاصی کھیلنے لگا تھا۔ مگر نہ ویسی جیسی کہ کانپور میں تھی۔

۱۹۶۵ء سے قبل پانچ سات برس (یا کچھ زیادہ) برج تو کھیلی لیکن شطرنج کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد دو تین سال یونیورسٹی کے اسٹاف کلب کے سالانہ ٹورنامنٹ میں شرکت ہوتی رہی اور بس۔ مسٹر اعظم جان ایڈمنسٹریٹو آفیسر میرے ساتھی ہوتے تھے۔ ہر سال ہمیں جیتتے تھے۔ پھر میں الفترہ چلا گیا تو یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔

شادی اور اولاد حضرت مولانا مفتی سعادت اللہ صاحبؒ میرے اُستاد تھے تکمیل کے لئے اِن کی خدمت میں والد مرحوم کے حکم کے مطابق آگرہ حاضر ہوا تھا۔ والد ماجد ان کے تبحرِ علمی اور کمالاتِ باطنی سے یقیناً واقف ہوں گے جو انہوں نے بھیجا تھا۔ ہمیں اس وقت کیا اندازہ تھا کہ ان کے کمالات علمی کی کیا شان ہے۔ جب حضرت مولانا ڈھاکہ یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ تو ان کے اہل و عیال آگرہ ہی رہے۔ لبادون گلی اس چھوٹے سے محلے کا نام تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ان ایام میں ہمارے اور ان کے گھرانوں کی خواتین کے تعلقات میں زیادہ سے زیادہ یگانگت اور خصوصیت پیدا

ہوگئی۔ چنانچہ ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی (حسنیٰ) کے لئے میرا پیام دیا گیا۔ اور بتاریخ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء ہماری شادی ہوگئی۔ میرے آٹھ بچے ہیں۔ پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ ان میں سے سات آگرہ میں پیدا ہوئے آخری بچہ البتہ اسلامیہ کالج پشاور میں تولد ہوا۔

تصنیفات و تالیفات

(۱) سب سے پہلی تصنیف "نگارِ عجم" تھی۔ ۱۹۲۷ء میں دو حصوں میں ساتویں آٹھویں درجات کے لئے فارسی کا یہ نصاب مُرتب کیا تھا۔ یو پی کے محکمہ تعلیم نے منظور کیا۔ بعد کو سی پی، راجپوتانہ اور بھوپال میں بھی منظور ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۸ء تک ان کتابوں کے داخلِ نصاب رہنے کا حال معلوم ہے۔ رام پرشاد اینڈ سنز آگرہ نے چھاپی تھی۔ اور متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

(۲) ۱۹۲۸ء میں بہارِ ادب (۲ حصے) ورناکیولر ٹیچرس سرٹیفکیٹ امتحان کے نصاب اُردو کے لئے مرتب کی۔ محکمہ تعلیم یو پی نے منظور کی۔

(۳) ۱۹۳۰ء میں مخزنِ اُردو کے نام سے چار حصے پنجم تا ہشتم (یو پی) کے لئے مرتب کئے۔

(۴) ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر ان کی سیرت اور شاعری پر مختصر تنقید تصنیف کی اور اپنے خرچ سے چھپوائی۔

(۵) ۱۹۳۲ء میں "سرکار دو عالمؐ" نامی کتاب سیرت پاکؐ پر نہم و دہم درجات کے لئے مرتب کی بعد میں پشاور میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

(۶) کلید قواعد کے نام سے پرائمری کے لئے ایک مختصر اُردو گرامر لکھی (شاید ۱۹۳۵ء میں)۔

(۷) گنجینۂ قواعد کے نام سے غالباً ۱۹۳۵ء ٹریننگ اسکول کے طلبہ کے لئے اُردو کی مختصر قواعد لکھی۔

(۸) ۱۹۳۶ء میں روح قواعد و انشاء کے نام سے تین حصوں میں پرائمری ٹیچرز سرٹیفکیٹ امتحان کے لئے اردو قواعد اور انشا پردازی پر جامع کتاب تصنیف کی۔

(۹) ۱۹۳۶ء میں قومی کتب خانہ لاہور کی فرمائش پر ایک مختصر مجموعہ "ادبیاتِ ایرانِ نو" کے نام سے مرتب کیا۔ اسی میں ایرانِ جدید کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب تھا۔ اور ابتداء میں ایک جامع مقدمہ تھا۔ فارسی کے پروفیسر صاحبان نے نہایت پسند کی اور اچھے ریویو لکھے کئی یونیورسٹیوں نے بی اے آنرز یا ایم اے فارسی کے نصاب میں شامل کی۔

(۱۰) ۱۹۳۷ء میں "چمنستانِ اُردو" کے نام سے اُردو مقالات کا ایک مجموعہ مُرتب کیا

جس کے ساتھ ایک جامع مقدمہ بھی تھا۔ اس کتاب کو آگرہ یونیورسٹی نے بی۔ اے کے نصاب میں داخل کیا۔ اور جامعہ اُردو آگرہ نے بعد میں ادیب ماہر کے امتحان میں شامل کیا۔

(۱۱) جناب محترم نصیر صاحب ہمایوں مالک قومی کتب خانہ لاہور نے فرمائش کی تھی کہ میں ان کے لئے علامہ اقبال پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کروں۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ مگر کام پورا نہ ہوسکا۔ حتیٰ کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ نے انتقال فرمایا۔ اب میں مستقل اس کام میں لگ گیا۔ اور کتاب کا مسودہ بالاقساط لاہور بھیجتا رہا۔ میں نے جولائی / اگست ۱۹۳۸ء میں کام مکمل کر لیا تھا۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں اس کا پہلا ایڈیشن "سیرت اقبال" کے نام سے شائع ہوا۔ خدا کے فضل سے ابتک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (۱۹۷۷ء میں طبع پنجم کے لئے "سیرت اقبال" پر نظر ثانی کی اور بہت سے اضافے بھی کئے۔ طبع چہارم میں کتاب اور ضخیم ہوگئی تھی۔ اب ضخامت کچھ اور بڑھ گئی۔ فروری ۱۹۷۸ء پر طبع ہوئی)۔

(۱۲) ۱۹۴۶ء میں اُردو کا ایک نصاب "چمنستان ادب" کے نام سے دو حصوں میں مرتب کیا۔ اس کی تالیف میں مولانا حامد حسن قادری اور میں شریک تھے۔ یہ کتاب جامعہ اُردو کے امتحان ادیب میں شامل کی گئی۔

(۱۳) پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں "مخزن اُردو" کے نام سے ایک سیٹ درجہ اول سے درجہ ہشتم کے لئے مرتب کیا۔ جسے فیروز سنز نے شائع کیا۔ کئی سال تک یہ سیٹ سرحد، پنجاب، سندھ، کراچی، بلوچستان سب جگہ داخلِ نصاب رہا۔ (پرانی تالیف کا نام اس مجموعہ کو دیا گیا)۔

(۱۴) ۱۹۵۴ء میں ماسٹر خان گل (ناشر پشاور) کے لئے "بہار ادب" کے نام سے نہم و دہم کے لئے اُردو نصاب مرتب کیا۔ جو کئی سال رائج رہا۔ (یہاں بھی پرانی تالیف کے نام کی تجدید کی ہے)۔

(۱۵) ماسٹر خان گل صاحب کے لئے اسی زمانے میں "روح قواعد و انشا" کے نام سے میٹرک کے لئے اُردو قواعد اور انشا پردازی کا مکمل مجموعہ مرتب کیا۔

انشاء پردازی کا حصہ چودھری سردار احمد صاحب نے (سیکرٹری بورڈ آف ایجوکیشن پشاور) اور اُردو قواعد کا حصہ میں نے لکھا۔ یہ کتاب اب بھی بے ضابطہ طور پر

اکثر اسکولوں میں مدد کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔

(۱۶) "بزم اقبال" کا ذکر رہ گیا۔ میری قائم کردہ بزم اقبال آگرہ میں پڑھے جانیوالے مقالات اور منظومات کا مجموعہ (سن یاد نہیں۔ شاید ۴۴ ۱۹ء ہوگا) شاہ اینڈ کمپنی آگرہ نے شائع کیا تھا۔

(۱۷) لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب کیلئے میں نے ایک کتاب خط شکست پر مرتب کی تھی۔ (شاید ۴۱ ۱۹ء ہوگا) لکشمی نرائن ہی نے کتاب نمبر ۲-۳-۶-۷-۸ شائع کی تھیں

(۱۸) "ایجادات سائنس" کے نام سے اسی موضوع پر ایک کتاب گیا پرشاد اینڈ سنز تاجران کتب آگرہ کے لیے لکھی تھی، جو راجپوتانہ بورڈ میں زائدانہ نصاب مطالعہ کیلئے منظور تھی (سن تالیف شاید ۴۲ ۱۹ء ہوگا)۔

(۱۹) غالباً ۴۴ ۱۹ء میں "اردو نثر کے نمونے" نامی کتاب مرتب کی۔ جسے شاہ اینڈ کمپنی نے شائع کیا۔ ابتدا میں جامع مقدمہ تھا۔ بی اے میں آگرہ یونیورسٹی نے اسے نصاب قرار دیا تھا۔

(۲۰) ڈھاکہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران اس یونیورسٹی میں ایف اے کے نصاب کے لئے "نگارستان اردو" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جسے یونیورسٹی نے کسی ناشر سے شائع کرالیا۔

(۲۱) پشاور یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران اکثر میری کتابیں پشاور کے ناشر یونیورسٹی بک ایجنسی نے شائع کیں۔ ان کی فرمائش پر "فصاحت و بلاغت" کے نام سے علم بیان اور علم بدیع کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا۔ اس میں اردو کیساتھ فارسی کی مثالیں بھی تھیں۔ اسلئے اردو فارسی دونوں کے بی اے، ایم اے وغیرہ کے لئے اسے شامل نصاب کیا گیا۔ بہت مقبول کتاب ثابت ہوئی ہے۔

(۲۲) یونیورسٹی بک ایجنسی نے میری کتاب "سرکار دو عالم" یہاں دوبارہ چھاپی۔ اس کے تین ایڈیشن یہاں شائع ہو چکے ہیں۔

(۲۳) عزیزم جناب عظیم الحق جنیدی کی تالیف ناشر عجم پر میں نے ان کی فرمائش کے مطابق نظر ثانی کی اور "مختصر تاریخ ادب فارسی" کے نام سے یونیورسٹی بک ایجنسی نے چھاپی۔ اس کے بھی یہاں دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۲۴) یونیورسٹی بک ایجنسی نے میری تازہ تالیف "چمنستانِ ادب" (مجموعہ مقالات نثر) شائع کی، جو پہلی اِسی نام کی کتاب سے مختلف ہے۔ اور بی اے کیلئے پشاور یونیورسٹی میں شامل نصاب ہے (تھوڑا سا فرق نام میں نیز مندرجات میں ہے)۔

(۲۵) میرانیس کا ایک مرثیہ میرے مقدمے کے ساتھ یونیورسٹی بک ایجنسی نے شائع کیا یہ بھی پشاور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲۶) ۱۹۶۴ء میں "پاکستان میں اُردو" کے نام سے ہمارے رسالے خیابان کے خصوصی نمبر کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ یونیورسٹی بک ایجنسی اسکے بھی ناشر ہیں یا محبی خاطر غزنوی صاحب تالیف میں شریک تھے۔

(۲۷) انہی ناشرین نے ۱۹۶۶ء میں خیابانِ اقبال کے نام سے میرا مرتب کردہ اقبالیات کا مجموعہ شائع کیا۔ یہ دونوں (۲۶-۲۷) ضخیم تالیفات ہیں جو اپنے موضوعات پر سیر حاصل مطالعہ کی ضامن ہیں۔ ان دونوں کی تالیف میں عزیز مکرم خاطر غزنوی صاحب میرے ساتھ شامل رہے۔

(۲۸)، (۲۹) ۱۹۵۷ء میں حکومت نے نیا کریکولم مرتب کیا اور اس کے مطابق کتابیں لکھوائیں۔ میں نے نہم دہم کے لئے "جوہر اُردو" اور یازدہم اور دوازدہم کے لئے "سفینۂ اُردو" مرتب کیں، جو منظور کی گئیں۔ اور ۱۹۷۵ء تک داخلِ نصاب رہیں۔ ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ نے مقامی ناشرین کو اشاعت کیلئے دیں۔

(۳۰) اسی نئے کریکولم کے مطابق میں نے قاعدہ بھی مرتب کیا جو منظور ہوا — ایڈیٹروں نے اس اُردو قاعدے میں تبدیلیاں کرکے کافی حد تک انہیں بنا دیا۔ بعد میں برادرم ماجد حسین فریدی نے میرے مرتب قاعدے کو جوں کا توں علیحدہ شائع کیا۔

(۳۱) اگست ۱۹۷۲ء میں ایک کتاب "نثر نگاری کا فن" کے نام سے مرتب کی۔ جس میں اوّل مبادیاتِ انشا اور عملی قواعد کے اصول ہیں۔ اور پھر انشا پردازی کے جملہ اقسام کے اصول اور قاعدے بیان کئے ہیں۔ آخر میں بلاغت اور بیان سے متعلق دوسری معلومات جمع کرکے کتاب کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ اسی موضوع پر پہلی تالیف کردہ کتابوں سے بہتر، مکمل اور جامع تالیف ہے۔ یونیورسٹی بک ایجنسی نے ستمبر ۱۹۷۴ء میں شائع کی۔

(۳۲) حضرت قبلہ سید اختر حسین شاہ صاحب نے قبلہ عالم امیر ملتؒ کے سوانح حیات جمع کئے ہیں۔ تسوید کا کام مئی ۱۹۷۱ء میں مجھے دیا گیا۔ میری بیماری کی وجہ سے سال بھر سے زیادہ مدت کام شروع ہی نہ ہوا۔ آخر نومبر ۱۹۷۲ء میں کام شروع کیا۔ کتاب کا نام "سیرت امیر ملت" تجویز ہوا مئی ۱۹۷۵ء میں کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

(۳۳) درجات ششم ہفتم ہشتم (مڈل) کے لئے قومی کتب خانہ لاہور کے لئے فارسی درسی کتب کا ایک سیٹ (غالباً ۱۹۵۵ء میں) مرتب کیا تھا۔ اُنہوں نے چھاپی مگر مجھے ایک بھی نسخہ نہ دیا کہ یادگار رہتا۔ اب تو ان کے پاس بھی کوئی سیٹ نہیں ہے۔ کتاب کا نام میں نے "نگارِ عجم" رکھا تھا (تاکہ پرانی تالیف کی یاد باقی رہے)۔ پہلا حصہ برائے درجہ ششم تصنیف تھا۔ اور باقی دونوں حصوں میں زیادہ تر انتخاب اور تالیف۔

(۳۴) ترجمہ: ڈھاکہ میں فارکو ناشرانِ کتب نے فرمائش کی کہ امریکی قونصل خانے کے لئے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کردوں۔ میں نے پسند کی شرط پر وعدہ کیا۔ کتاب بہت دلچسپ تھی۔ "اپنی مدد آپ" کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ نام تھا۔ میں نے بھی اُردو میں یہی نام رکھا۔ اپنی دانست میں بہترین ترجمہ کیا تھا۔ ستمبر ۱۹۵۳ء میں میں پشاور چلا آیا۔ کتاب بعد میں چھپی مگر افسوس ہے کہ مجھے اسکا کوئی نسخہ نہ ملا جو دیکھ کر اپنی کارکردگی پرکھ سکتا۔

(۳۵) ایسا ہی ایک اور ترجمہ کیا تھا۔ اس کی اصل اور نقل بھی اب محفوظ نہیں ہے۔ حلیم مسلم ہائی سکول کانپور کے جلسے کی صدارت کیلئے ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم یو پی بلائے گئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انگریزی میں اسکول کی رپورٹ مرتب کی تھی۔ غالباً آٹھ دس صفحے کی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا اصرار تھا کہ ترجمہ بامحاورہ کے ساتھ لفظی بھی ہو۔ چنانچہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کیلئے موزوں مترادفات تلاش کرنے میں بڑا وقت صرف ہوا تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس فرمائش کا بھی پورا التزام مدنظر رکھنا تھا کہ جملوں کی بناوٹ اور الفاظ کی نشست انگریزی اُردو میں ایک ہی رہے۔ اور اُردو محاورہ بھی خراب نہ ہو۔ ترجمہ ایسا ہوا تھا کہ فرمائش پر مکمل طور پر پورا اترتا تھا۔ اب یہ دونوں ترجمے سامنے نہیں کہ ان کو از سرِ نو پرکھا جائے اور اپنی کاوش پر تنقید کی جائے۔

(۳۶) ۱۹۷۷ء علامہ اقبال کے سال کے طور پر منایا گیا۔ مرکزی حکومت نے جو تقریبات کمیٹی بنائی تھی، اس نے بہت سی کتابیں چھاپنی تجویز کی تھیں۔ مجھے "اقبال اور عشق رسولؐ" موضوع دیا گیا۔ میں نے ان کو بار بار توجہ دلائی کہ اس نام سے مولانا رئیس احمد جعفری مرحوم کی کتاب چھپ چکی ہے۔ لہٰذا نام بدلنا ضروری ہے۔ اس لئے انہوں نے کتاب کا نام بدل کر "اقبال اور محبت رسولؐ" کر دیا۔ میں نے کتاب کی تیاری جون ۱۹۷۶ء میں شروع کر دی تھی۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں مسودہ بھیجدیا۔ انہوں نے اس کتاب کی طباعت ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور کے سپرد کی جنھوں نے نومبر ۱۹۷۷ء میں اسے شائع کیا۔

(۳۷) "محمد طاہر فاروقی" از محمد طاہر فاروقی: کتاب ہذا میری روداد زندگی ہے۔

(۳۸) "گردِ کارواں" کے نام سے دو حصوں میں وہ واقعات جمع کئے ہیں جو میری زندگی میں پیش آئے۔ جن میں دوسروں کو بھی کم و بیش دلچسپی ہو سکتی ہے۔ (ابھی تشنۂ تکمیل ہے)

(۳۹) "ہماری زبان": اس نام سے ایک کتاب دسمبر ۱۹۷۵ء میں مرتب کی۔ اس میں میرے مختلف مضامین ہیں۔ جن کا تعلق اُردو زبان، رسم الخط، قومی زبان، اُردو کے مستقبل وغیرہ سے ہے۔ کتاب خاصی معقول ضخامت کی ہو گئی ہے۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں قومی کتب خانہ لاہور نے چھاپنے کے لئے منگالی ہے۔ دیکھئے کب چھپتی ہے۔

(۴۰) خاصی بڑی تعداد میں کتابوں پر ریویو لکھے۔ کچھ ضائع بھی ہو گئے۔ جو ہیں محفوظ ہیں۔ ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔ (آغاز ۱۹۷۷ء تک ترتیب اور نظر ثانی کا کام نہیں کیا ہے)۔

(۴۱) فضل کریم شیخ صاحب نے لاہور میں "ادارۂ فروغ اقبالیات" قائم کیا ہے۔ مجھ سے اقبال پر میرے مضامین کا مجموعہ طلب کیا۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں مسودہ مکمل کر کے بھیجا۔ نام "اقبال کے افکار" تجویز کیا۔ (ابھی تشنۂ اشاعت ہے)۔

(۴۲) "بیاض اشعار" اپنے تمام منظومات، غزلیات کو جو پہلے دوسری بیاض میں تھے اس مجموعہ میں مرتب و مربوط کیا۔ اور یہ تاریخی نام رکھا جس سے ۱۳۸۵ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ جو سنہ ترتیب و کتابت ہے۔

اب ارادہ ہے کہ باقی سب ناقص و کامل مضامین نظر ثانی کر کے یکجا کر دوں۔

جو ہوتے جائیں گے الگ الگ کتابی شکل میں مرتب کرتا جاؤں گا۔ اور ذیل میں درج بھی کردوں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔ ماشاء اللہ (تحریر جنوری ۱۹۷۵ء)۔

(۴۳) حکیم محمد سعید صاحب (صدر ہمدرد نیشنل فاونڈیشن) سے باتوں باتوں میں وعدہ کیا تھا، کہ "نونہال" کے لئے علامہ اقبال کے سوانح، کلام اور پیغام بر بچوں کی استعداد کے مطابق ایک چھوٹی کتاب مرتب کرکے دونگا۔ حکیم صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو "نونہال" کی نومبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں بطور "یادگار اقبال" کے شائع کریں گے۔ اب مذکورہ بالا کتابوں کی تکمیل کے بعد انشاء اللہ مارچ ۱۹۷۷ء میں یہ کام کروں گا۔ (نونہال کے اس اقبال نمبر میں "ہمارا اقبال" کے عنوان سے حضرت علامہ کے سوانح حیات و پیغام کی یہ تلخیص شائع ہوئی تو بہت پسند کی گئی۔ حکیم سعید صاحب نے بچوں کے خطوط کے حوالے سے جنوری ۱۹۷۸ء کے نونہال میں بھی شائع کی اور مجھے بھی الگ شکریہ اور مبارکباد کا خط بھیجا)۔

مقدمات

بعض احباب کے اصرار پر بعض کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں۔

(۱) جناب شکیل بدایونی (مرحوم) کے پہلے مجموعۂ کلام "رعنائیاں" پر ان کے انتہائی اصرار پر مقدمہ لکھا۔

(۲) جناب جمیل احمد صاحب نے "تاریخ شاعراتِ اُردو" تالیف کی تو اس پر زبردستی مقدمہ مجھ سے لکھوایا۔

(۳) برادر محتشم مولوی نورالرحمن صاحب (مرحوم) نے مولانا محمد علی جوہر کے "حبیبہ کلام" بقلم خود (عکسی) کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اور شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اشاعت کا وعدہ کیا تو میری تجویز پر نور بھائی نے مولانا کا مابقی کلام بھی اس میں شامل کیا۔ تاکہ مکمل دیوان ہو جائے۔ اس پر نور بھائی نے خود مقدمہ لکھا ہے۔ لیکن میرا مضمون بھی بطور تعارف اس "دیوانِ جوہر" میں شامل ہے۔

(۴) پشتو اکیڈیمی (پشاور یونیورسٹی) نے سید انوارالحق صاحب سے کلیاتِ خوشحال خان خٹک" کا ترجمہ اُردو نثر میں کروایا۔ میرے ذمے یہ کام کیا گیا کہ میں اُردو ترجمے پر نظرثانی کروں۔ میں نے انتخاب کلام میں بھی خصوصی مدد دی۔ مولانا عبدالقادر صاحب (مرحوم) ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی کے اصرار پر مجھے اس کتاب کی بابت اپنے تاثرات بھی لکھنے پڑے

جو "انتخاب خوشحال" میں شامل ہیں۔

(۵) بیگم مطلوب حسین صاحب نے جب وہ کینٹ پبلک اسکول پشاور میں پڑھاتی تھیں ، ۱۹۵۷ء میں بچوں کے لئے اُردو کی ابتدائی کتابیں (چار حصوں میں) تالیف کی تھیں، حسب فرمائش ان کا "پیش لفظ" میں نے لکھا تھا۔

مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین میں سے اکثر ایسے ہیں جو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی تک کتابی شکل میں نہیں چھپ سکے۔ ارادہ ہے کہ دو مجموعے شائع کئے جائیں۔ کاغذ اور اشاعت دونوں کی دشواریاں ہیں دیکھنا ہے کہ یہ دونوں مجموعے کبھی شائع ہو سکیں گے کہ نہیں۔

گم شدہ مضامین اس سلسلے میں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ابتدا میں مجھے یہ توفیق نہ تھی کہ اپنے مضامین کی نقل محفوظ کیا کردں۔ اسلئے بعض مضمون غائب ہو گئے۔ ان میں سے بعض کا فی الواقع افسوس ہے۔

(۱) ۱۹۳۹ء میں میں نے مولانا فضل حق خیرآبادی پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا تھا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے اس کے لکھنے میں خاص مدد دی تھی اور اپنے کتب خانے سے بعض نایاب کتابیں بھی حوالہ کیلئے عطا کی تھیں۔ یہ مضمون حضرت مولانا کی سیرت و کردار پر مفصل روشنی ڈالتا تھا۔ اُس وقت بالیقین کوئی مضمون ایسا مبسوط ان پر نہیں لکھا گیا تھا۔

انہیں دنوں میں جناب جوش ملیح آبادی نے دہلی سے رسالہ کلیم نکالا تھا۔ وہ لکھنے والوں سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے اور مضامین حاصل کرنے کیلئے آگرہ بھی آئے تھے۔ جناب مخمور اکبرآبادی اور جناب ل۔ احمد صاحب کے ساتھ جوش صاحب میرے گھر بھی آئے۔ اس وقت میرے کچھ اور احباب بھی گھر پر موجود تھے۔ کچھ دیر لطف ملاقات رہا۔ میرا یہ مضمون "کلیم" کے مقصد سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے میں اس کا کیا ذکر کرتا۔ مگر میرے احباب میں سے کسی نے ذکر کر دیا۔ اور پھر جوش صاحب بضد ہوئے کہ یہی دیدو۔ میرے پاس نقل نہ تھی۔ مگر ان کی فرمائش منظور کرنی پڑی۔ اس کے بعد چند ماہ انتظار کیا کہ میرا مضمون چھپے۔ نہ چھپا تو میں نے تقاضے کئے کہ واپس کر دیجئے۔ اکثر تو خط کا جواب ہی نہ آیا۔ جواب آیا

تو کسی اور کے ہاتھ کا لکھا ہوا اور عموماً اس مضمون کا کہ جوش صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ان کے آنے پر مضمون کی بابت تحریر کیا جائیگا۔۔ غرض یہ مضمون ایسا غائب ہوا کہ پھر سوائے افسوس کے میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

(۲) سن تو ٹھیک یاد نہیں شاید ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء ہوگا، جب مہاتما بدھ کی ڈھائی ہزار سالہ (یا تین ہزار سالہ) برسی منائی گئی تھی۔اس وقت پشاور کے عجائب خانہ میں خاص تقریب بھی ہوئی تھی۔ ریڈیو پاکستان پشاور میں یہ تجویز زیر غور تھی کہ اس تقریب کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا جائیگا۔ اس کام کیلئے انہوں نے مجھ سے پشاور میوزیم کے نوادر کی بابت نثر کی فرمائش کی۔ میں نے عجائب خانہ جاکر وہاں کے نوادر دیکھے ان کی بابت مفصل معلومات حاصل کیں، اور بیس فلسکیپ صفحات پر مشتمل یادداشتیں مرتب کرلیں۔ ریڈیو پاکستان سے نشریہ تو غت ربود ہوا۔ میری یادداشتیں محفوظ تھیں۔ سوچا کہ ان کی مدد سے گندھارا آرٹ اور مہاتما بدھ پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ ان ایام میں جناب احمد فراز ہمارے شعبے میں ایم۔اے کے طالب علم تھے۔انہوں نے اصرار کیا کہ میں یہ یادداشتیں ان کو دیدوں۔ وہ مضمون مکمل کرا کے چھپوا دیں گے۔ آخر مجھے ان کے اصرار پر مجبور ہونا پڑا۔ (فراز صاحب نے ایک مقامی ہفتہ وار "خادم" کے لئے یہ کاغذات مجھ سے لئے تھے) اب خدا جانے وہ یادداشتیں کیا ہوئیں۔ مضمون مکمل ہو گیا ہوتا۔ تو چھپ بھی جاتا۔

(۳) ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء میں مجھے دہلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مراد آباد سے بریلی تک ریل میں ان کا ساتھ رہا تھا۔ پھر خانقاہ نیازیہ بریلی میں دو دن ان کا ساتھ رہا۔ اور اس درمیان میں ان سے کئی داستانیں سنیں۔ میں دہلی ریڈیو پر تقریر کے لئے گیا۔ تو ان لوگوں نے فرمائش کی کہ یہ سب داستان سپرد قلم کروں اور دہلی ریڈیو سے نشر کروں۔ میں نے حسب فرمائش یہ سب قصہ مرتب کیا اور ڈاک سے ارسال کر دیا۔ میرا وہ خط دہلی ریڈیو والوں تک نہیں پہنچا کہ کوئی اور ہی پڑھکر سنا دیتا۔ اور میں نے اس مضمون کی نقل نہیں رکھی تھی۔ اب افسوس ہوتا ہے، کہ یہ یادگار باتیں محفوظ نہیں رہیں۔

(۴) پشاور ریڈیو سے نومبر ۱۹۵۰ء سے آخر ۱۹۵۱ء تک دو سال میں نے ان کا ہفتہ وار پروگرام "اردو سیکھئے" چلایا تھا۔ یہ پروگرام بیحد مقبول ہوا۔ طلبہ اور غیر طلبہ

سب اسے بیحد پسند کرتے تھے۔ میں جنوری ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ چلا گیا۔ تو کچھ دن کسی اور نے یہ پروگرام لکھا مگر پھر بند ہوگیا۔ میں اس پروگرام کی نقلیں محفوظ نہیں رکھتا تھا۔ مگر اکثر تقریریں ریڈیو پشاور سے حاصل ہوگئی تھیں۔ کچھ حاصل نہ ہوسکیں، ان میں سے دو تقریروں کے ضیاع کا سخت افسوس ہے، "ذرا" اور "سہی" کے بامحاورہ اور برمحل استعمال پر الگ الگ پندرہ منٹ کی یہ تقریریں بہت پسند کی گئی تھیں۔ اب اگر میں ارادہ بھی کروں تو شاید وہ سب معلومات بہ آسانی فراہم نہ کرسکوں اس لئے کہ ان تقریروں میں برمحل اور بامحاورہ استعمال ہی نہ ہوتا تھا، بلکہ ایسے استعمال کے لئے میں اصول بیان کرتا تھا، اور یہ اصول میرے "خود ساختہ" ہوتے تھے۔ جن پر کئی کئی دن صرف ہوجاتے تھے، تاکہ یہ اصول واقعی "کلی طور پر" صادق آئیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
سابق صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاضل بزرگ

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب مرحوم سے میرے تعلقات ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئے تھے جبکہ انہوں نے آگرہ میں جامعۂ اُردو کی بنیاد ڈالی تھی۔ میں اُس زمانے میں کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اُردو پڑھاتا تھا۔ اور مرحوم "جامعۂ اُردو" کے رجسٹرار بھی تھے اور آگرہ کالج میں بھی اُستاد تھے۔ وہ کہنے کو تو اُس جامعہ کے رجسٹرار تھے لیکن حقیقت میں وہ اُس کے سب کچھ تھے، یعنی اس کے سرپرست بھی تھے، اور اُس کے امتحانات، قواعد و ضوابط، طریق کار، نصابات اور اسناد وغیرہ سے متعلق جملہ امور کے لئے خط و کتابت اُنہی کے قلم سے ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے جامعہ کے قواعد و ضوابط مجھے بھیجے اور میری نگرانی میں امراؤتی میں اسکے امتحانات کا مرکز بنانا چاہا۔ امتحانات تین تھے:- (۱) ادیب (۲) ادیب ماہر اور (۳) ادیب کامل۔ اور ان امتحانات میں ہر شخص اپنے طور پر تیاری کر کے شریک ہوسکتا تھا۔ پرچوں کی تقسیم اور نصابات کی تفصیل بہت "ادب آموز" تھی جو مجھے بہت پسند آئی۔ اُس زمانے میں ہمارے کالج کا پرنسپل ایک انگریز تھا جو مسلمانوں کی تہذیب و شرافت کا بہت مدّاح تھا۔ اور فورٹ ولیم کالج کے نصابات سے بھی کسی قدر واقف تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور اُس سے جامعۂ اُردو کے امتحانات کا ذکر کیا کہ اگر ہمارے طلباء ان امتحانات میں شرکت کریں گے، تو انھیں یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری میں بڑی سہولت ہوگی۔ پرنسپل بہت خوش ہوا اور اُس نے ہمارے طلباء کے لئے خصوصی طور پر رخصت منظور کی۔ پھر مجھے موقع ملا کہ شہر کے لوگوں کو بھی رغبت دلاؤں۔ چنانچہ میں عائدینِ شہر سے ملا اور بکثرت طلبہ و طالبات کو ان امتحانوں کے لئے آمادہ کیا۔ پھر تو شہر میں ایسا شوق بڑھا کہ کالج اور شہر کے امیدواروں کی تعداد پورے ملک کے مراکز کی تعداد سے زیادہ ہونے لگی۔

پروفیسر صاحب مرحوم اسی وجہ سے مجھ سے بہت خوش تھے اور اسی تعلق کی بنا پر

اُن سے میری "نصف ملاقات" مستقل طور پر قائم رہی۔ پاکستان بننے پر غالباً ۱۹۴۸ء میں وہ کراچی تشریف لائے۔ تو جامعہ اُردو کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے آگئے تھے لیکن جو بیج انھوں نے بویا تھا۔ اور جسکی آبیاری کی تھی۔ وہ پھل پھول کر ایک ایسا تناور درخت بن گیا تھا کہ اب ہندوستان میں ہزارہا افراد اُس سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔

پروفیسر مرحوم پاکستان تشریف لانے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی میں بھی اُستاد رہ چکے ہیں۔ لیکن پھر پشاور یونیورسٹی ہی اُنھیں زیادہ پسند آئی۔ غالباً اس لئے کہ ان کے بچپن کا کچھ عرصہ والد صاحب کی ملازمت کی وجہ سے پشاور ہی میں گذرا تھا۔ اسی لئے اُن کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی۔ پشاور یونیورسٹی میں وہ صدرِ شعبۂ اُردو ہوگئے تھے۔ اور لطیفہ یہ ہوا کہ جب اُن کی ترقی کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہاں کے وائس چانسلر محمد علی صاحب نے رائے حاصل کرنے کے لئے محترم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کو اور راقم الحروف کو پشاور طلب کیا۔ اتفاق سے وہ تاریخ پہلی رمضان المبارک کی تھی۔ لیکن چونکہ مرحوم کا معاملہ تھا اس لئے ہم لوگوں نے وہاں پہنچنا ضروری سمجھا۔ ہم لوگ وائس چانسلر صاحب کے دفتر میں پہنچے اور ہم دونوں نے "ہم زبان" ہوکر ان سے یہی عرض کیا کہ فاروقی صاحب جیسے بزرگ اُستاد کی ترقی کے لئے ہم لوگوں کی رائے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ آپ خود ہی کر سکتے تھے۔ بہرحال وائس چانسلر صاحب نے فوراً اُن کو عہدہ کی ترقی بھی دی اور تنخواہ کے دو تین اضافے بھی منظور کر دیئے۔

مرحوم طبعاً باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ اُن کی وجہ سے محفلوں میں زندگی پیدا ہو جاتی تھی اور اُن کے قہقہوں سے در و دیوار گونجنے لگتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ ترکی تشریف رکھتے تھے تو حج کے موقع پر وہ وہاں سے مدینہ منورہ پہنچے۔ میں بھی وہاں پہنچا ہوا تھا اور حضرت مولانا عبدالغفور صاحب علیہ الرحمۃ کے درِ دولت پر مقیم تھا۔ وہیں قریب ہی رباط ٹونک کے ہوٹل سے مرحوم کے قہقہوں کی آواز مجھے سنائی دی۔ میں آواز پہچان گیا اور وہاں بلا تکلف داخل ہوا تو مرحوم کے قہقہوں میں اور بھی جان پڑ گئی۔ پھر تو ہم لوگ بار بار حج کے دوران ملتے رہے۔ اور اس مبارک سرزمین میں بہت سی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

مرحوم کی زندہ دلی کا ایک واقعہ عرض کروں۔ میرے پاس مرزا طپش کی

ایک بیاض ہے جس پر ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے ایک مقالہ نقوش میں شائع کیا تھا۔ یہ بیاض مجھے برادرم محترم پروفیسر حمید جالندھری نے عنایت فرمائی تھی۔ طاہر صاحب کے پاس مرزا طپش کا کلیات تھا۔ ان کو اسکی نقل کیلئے لکھا۔ تو جواب دیا کہ مجھے ایک صاحب کے انتقال کا انتظار ہے۔ اس کے بعد دوں گا۔

مرحوم میری درخواست پر بارہا سندھ یونیورسٹی کے ایم۔اے، کے ممتحن مقرر ہوئے اور بارہا ڈاکٹریٹ کے زبانی امتحانوں کے لئے تشریف لائے۔ غالباً ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ کہ اپنی کمزوری اعصاب کی وجہ سے فرمانے لگے۔ کہ "شاید میں اب نہیں آؤں گا" اُن کا یہ جملہ میرے دل میں اُتر گیا۔ بڑی تشویش ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو آپ کو ضرور بلواؤں گا۔ اور شکر ہے کہ وہ ڈی لٹ کے زبانی امتحان کے لئے یہاں تشریف لانے پر مجبور کئے گئے۔ اس کے بعد افسوس ہے۔ کہ اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔ لیکن نصف ملاقات آخر وقت تک جاری رہی۔

طاہر صاحب آگرہ میں فارسی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن پاکستان آکر انہوں نے اُردو ہی کو اختیار کیا۔ وہ فارسی نیز اُردو میں ایم۔اے تھے۔ اور عربی میں بھی کلی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی برجستہ اور بلاتکلف لکھتے بھی تھے اور بولتے بھی تھے۔ اور ہر زبان میں اُن کا خط نہایت پختہ اور پاکیزہ تھا۔ آگرہ کے جامعہ اُردو ہی نے ان کو "دکتور ادب" کی سند دی تھی اور وہیں انھوں نے ۱۹۳۸ء میں سیرتِ اقبال لکھی تھی جو ادیب کامل کے خصوصی مطالعے والے پرچے کے لئے داخلِ نصاب تھی۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۷۸ء تک اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ کتاب میں مرحوم برابر ترمیم و اضافہ فرماتے رہے۔ اور زیادہ مفید بنانے کی کوشش میں رہے۔ پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے اس کے متعلق صحیح فرمایا تھا۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے اقبال کے کلام کی نبض پہچانی ہے اور ٹھیک اسی جگہ پر ہاتھ رکھا ہے۔ جہاں ایک صاحبِ ذوق اور سخن فہم شارح کو رکھنا چاہیئے تھا۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے افکار کی اچھی شرح ہی نہیں بلکہ کلامِ اقبال کا ایک پاکیزہ انتخاب بھی ہے جس میں اقبال کی زندگی کے کسی دور۔ اُن کی کسی فارسی یا اُردو تصنیف کو نظرانداز نہیں کیا گیا"۔ بہرحال یہ کتاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے اقبالیات سے متعلق بہت مفید ہے اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ اکثر ایسے طلبہ کو اقبال سے شغف

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے ـــ علامہ اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) سے لیکر کتاب کے پانچویں ایڈیشن (۱۹۴۸ء) کے زمانے تک بکثرت طلبہ اس سے مستفید ہوئے ہیں ۔ اور انشاءاللہ آئندہ بھی مستفید ہوتے رہیں گے ۔

اس کتاب کے علاوہ مرحوم نے حکومت کے ایماء پر صد سالہ تقریبِ ولادت اقبال" کے موقع پر ایک شاندار کتاب " اقبال اور محبت رسولؐ " (۲۳۱ صفحات) بھی لکھی ہے ۔ جس میں عشق، عشقِ رسولؐ، اطاعتِ رسولؐ، سیرت رسولؐ، انسانِ کاملؐ، قرآنِ حکیم ارمغانِ عقیدت، لمعاتِ شوق وغیرہ ابواب ہیں اور موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل مکمل ہے ۔

مرحوم کی چند اور کتابیں بھی ہیں ۔ یعنی چمنستانِ ادب ۔ مختصر تاریخ ادب فارسی سرکار دوعالمؐ ۔ انتخاب مراثی انیسؔ و دبیرؔ، فصاحت و بلاغت اور فن نثر نگاری وغیرہ ۔ لیکن مؤخرالذکر کتاب (یعنی فن نثر نگاری) اُن کے علمی ادبی تجربات کا نچوڑ ہے ۔ اس کا موضوع تو عام ہے ۔ لیکن وہ زندہ رہنے والی کتاب ہے اور اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے ۔ پھر اس کا اندازِ بیان بھی نہایت سادہ اور دلکش ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِس کتاب میں ہماری یونیورسٹیوں کے طلبہ کو زبان و ادب کے متعلق وہ سب کچھ مل جائے گا ۔ جو بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی بمشکل حاصل ہو سکے گا ۔ اس میں ۳۸۱ صفحات ہیں ۔ اور اس کے عنوانات یہ ہیں :ـ

جنس (تذکیر و تانیث)، تعداد (واحد و جمع)، مرکب الفاظ، مترادف الفاظ، متضاد الفاظ ۔ مشابہ الصوت الفاظ ۔ خاص مقاصد کیلئے خاص الفاظ ۔ سابقے اور لاحقے، تلفظ علامت فاعل (نے)، علامتِ مفعول (کو) مطابقتِ فعل ۔ مطابقت صفت و موصوف ایک فعل کی بجائے دوسرا فعل ۔ کچھ الفاظ کا صحیح استعمال ۔ جملے ۔ چند بنیادی مشورے، کلام کے نقائص، پیراگراف بنانا، عنوان، آغاز و اطناب ۔ خلاصہ لکھنا ۔ مفہوم نویسی ترجمہ کرنا ۔ شعر کی تشریح، بیان، مکالمہ، روزمرہ اور محاورہ، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات، کہانی، خط و کتابت، مضمون نگاری، رموز و اوقاف، فصاحت و بلاغت، علم بیان، چند اصطلاحات، اقسام نثر و نظم ـــ گویا دریا کو کوزے

میں بند کر دیا ہے اور اہل قلم حضرات کے لئے وہ سب کچھ یکجا کر دیا ہے۔ جسکی ضرورت ناگزیر ہے۔ یہ کتاب مرحوم نے ۱۹۷۲ء میں لکھی تھی لیکن وہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہو سکی۔ اس میں فصاحت و بلاغت سے متعلق اس طرح بحث فرمائی ہے:۔

" جس کلام میں قواعدِ زبان کی کوئی غلطی نہ ہو، جو روزمرہ کے مطابق ہو، جس میں غریب و نامانوس الفاظ نہ ہوں۔ جس میں تعقید یا اور کوئی عیب نہ پایا جائے۔ فصیح کہلاتا ہے۔ اور اس کی اس صفت کو فصاحت کہتے ہیں۔ الفاظ کی بے جا تکرار، ثقیل اور نامانوس حروف کی بھرمار جن کا تلفظ، بولنے اور سننے میں بدمزگی پیدا کرے۔ فصاحت میں خلل انداز ہوتے ہیں، ان سے احتراز ضروری ہے۔ یاد رکھئے کہ فصاحت کا تعلق الفاظ سے زیادہ ہے، اور معنی سے کم۔ ہو سکتا ہے کہ اچھے معانی ہوں، مگر بیان میں فصاحت نہ ہو۔ ایسی صورت میں کلام کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ذوقِ سلیم اسے قبول نہیں کرتا۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ کسی فصیح کلام میں بھی اثر اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک وہ کلام، مقتضائے حال کے مطابق نہ ہو یعنی اس میں عمر، رتبہ، موقع، حالت، کیفیت، منظر، اصلیت وغیرہ کی کامل رعایت نہ کی گئی ہو ــ تو ایسا کلام جو فصیح ہو اور مقتضائے حال کے مطابق ہو بلیغ کہلاتا ہے۔ اور کلام کے اس وصف کو "بلاغت" کہتے ہیں۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ "

دراصل مرحوم نے ۱۹۵۹ء میں فصاحت و بلاغت کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اور جس میں فصاحت و بلاغت، بیان و بدیع اور اصناف نثر و نظم سے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی تھیں اُنہی پر اضافہ اور اُنہی کا تکملہ اس کتاب (فنِ نثر نگاری) میں پایا جاتا ہے، جو ایک طالبِ علم یا اُستاد کے لئے بہت ضروری ہے۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں تو ایسی بھی ہیں جن سے عموماً پڑھے لکھے بھی کم واقف ہیں۔ اور ان میں فرق نہیں کرتے۔ مثلاً ان کے الفاظ کے خصوصی استعمال پر غور فرمائیں :۔

سنسناہٹ، گرج، کڑک، گٹ گٹ، قلقل، دنادن، دھائیں، کھنک، ٹاپ، گونج، گھمر، چوں، تھاپ، آس، تاناری ری وغیرہ۔

یا یہ الفاظ دیکھئے :۔

بھیڑ، جماعت، حلقہ، ٹولی، دستہ، بیڑا، ٹکڑی، گچھا، جھنڈ، ڈار، بیڑا

گچھا، کنج، گیل (گہل)، جتھا، گٹھا، تھئی، گڈی، طومار، ڈھولی، ریوڑ، گلہ، جھرمٹ یا جھومڑ دَل، لچھا، کنجی، جھلڑ، بنسواڑا، امریاں، فالیز وغیرہ۔

اِن کیفیات کا فرق قائم کیجئے:۔

چمک، ڈلک، آب، دمک، بھبک، مہک، لپٹ، تڑاکا، چھُن چھُن، چھَن چھَن، چرخ چوں، گھوں گھوں وغیرہ۔

مسکنوں کے نام دیکھئے:۔

محل، حرم، رنواس، حویلی، حجرہ، آشرم، تکیہ، کٹیا، جھونپڑا، بارک، چھاؤنی کوٹھی، بنگلہ، چھتا، بِل، بھٹ، بانبی، تھان، کھڑک وغیرہ۔

پھر آوازوں کے فرق کا جائزہ لیجئے:۔

ممیانا، ہنہنانا، دھاڑنا، چنگھاڑنا، بھونکنا، رینکنا، رانبھنا، ڈکارنا، کوکنا، غٹرغوں کرنا، کُڑکُڑانا، رٹنا، چنگھارنا، ہوکنا، بلبلانا، بغبغانا، چہچہانا، بھنبھنانا ٹرانا، جھنکارنا، بھنکارنا، چٹ چٹانا، گھگیانا وغیرہ۔۔ میرا تو خیال ہے کہ مرحوم نے اس سلسلے میں وحیدالدین سلیم اور پنڈت کیفی کے کاموں میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ اور اُن کی یہ کتاب چھوٹے بڑے ہر درجے والوں کیلئے بہت مفید ہے۔

آخر میں ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مرحوم اپنے چچازاد بھائی پروفیسر حامد حسن قادری اور پروفیسر فریدی مرحوم کی طرح نقشبندیہ مجددیہ کے سلسلۂ تصوف میں داخل تھے اور اسی رشتے کی وجہ سے وہ راقم الحروف کے متعلق بھی نیک گمان رکھتے تھے۔ مرحوم کے روحانی تواضع اور عظمت کا اندازہ ان کے آخری ایام کے ان مکتوبات سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے اس حقیر کو لکھے تھے اور جو تاریخی اعتبار سے بھی کسی کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ وہ مکتوبات (۶ عدد) یہ ہیں:۔

(مکتوب نمبر ۱)

محلہ کریم شاہ بخاری پشاور شہر

۲۰ رمئی ۱۹۷۸ء

۴۸۶/۹۲

مخدومی و مطاعی، سیدی و مولائی دامت برکاتکم و مدت ظلالکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ۔ ۱۶ رمئی کا کارڈ پرسوں مل گیا تھا۔ فوری جواب سے تغافل اسلئے برتا کہ کتاب کا عطیہ بھی وصول ہو جائے۔ تو شکریہ و امتنان

شامل عریضہ کرلوں۔ چنانچہ آج "اقبال اور قرآن" کا پارسل بھی مل گیا۔ الحمد للہ۔
صرف چند نسخے انہوں نے بھیجے ہیں۔ اسلئے اس عطیے میں خصوصی کرم زیادہ سے زیادہ ہے۔ شکریہ کے بہت سے الفاظ و عبارات لکھ کر اس نوازش و کرم پر حرف نہیں لانا چاہتا۔ بس اتنا عرض کرتا ہوں کہ یہ گراں قدر عطیہ میری بساط و حیثیت سے بالاتر ہے۔ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔
سید نور محمد سرور اکبرآبادی صاحب کا مقالہ انشاءاللہ اس ہفتے میں پیش ہو جائیگا۔ اللہ تعالی نے تکمیل کے مراحل سے گزارا ہے۔ تو ماںبقی امور کی تکمیل و توفیق فرمائیگا۔ "وہو المستعان"۔
"اقبال اور قرآن" دو گھنٹے ہوئے نازل ہوئی ہے۔ اب تک اسی کے مطالعے میں مستغرق تھا۔ ابتدائی صفحات اور سیر کا مرحلہ گزار کے عریضہ ارسال خدمت کرنے لگا ہوں۔ کتاب تمام کی تمام نظر غائر سے مطالعہ کی متقاضی ہے۔ اوسط علمیت والے اور منتہی سبھی کے لیئے افادے کی ضامن ہے۔ آپ نے بڑا کام کر دیا ہے۔ وہی رب العزت صلہ عطا فرمائے گا۔
میں نے آج ڈاکٹر معزالدین صاحب کو خط لکھا ہے تو پوچھا ہے کہ "اقبال اور قرآن" مصنف تک پہنچی یا نہیں؟ یہ بھی لکھا ہے کہ فروری میں آپ نے امید بندھائی تھی، اور سرکاری دفاتر کب کام میں مستعدی دکھاتے ہیں! ساتھ ہی آج ایک خط عبدالغفور صاحب کو اسلام آباد لکھا ہے، تاکہ وہ معاوضہ کی ادائیگی کی تحریک کریں۔ آپ مناسب سمجھیں تو کچھ وقفہ دے کر اسی طرح خط لکھیئے گا۔ انشاءاللہ مفید مطلب ہوگا۔
میری صحت گرتی جارہی ہے۔ دوا احتیاط کرتا رہتا ہوں۔ مگر بات اب دعاؤں پر آگئی ہے۔ کرم اور توجہ فرمائیے احسان دانش کا ایک شعر ہے:۔

محبت میں مکان و لامکاں ہیں دو قدم لیکن
مجھے یہ دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

اس شعر میں ذرا سی ترمیم کر لیجئے تو میرے حسب حال ہو جائے گا۔

بصارت گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے ؛ مجھے اب دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

دعائے خیر کا محتاج۔
کمترین
محمد طاہر فاروقی "

مکتوب نمبر ۲

۴۸۶/۹۴

پشاور

۲۹ جون (۱۹۷۸ء) مخدوم و مکرم و محترم مدظلکم العالی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ ۔ کل کرم نامہ ملا ۔ یاد فرمائی کا شکریہ
ڈاکٹر معزالدین صاحب کو آپ خط نہیں لکھتے تو اسلام آباد کو لکھیئے ۔ یوں تحریر فرمایئے
کہ کتاب تو آگئی ۔ اب شاید ما بقی رقم کی ادائیگی آپ کے یہاں سے ہونی ہے تو کرم کیجیئے ۔ اسطرح
شکایت کا پہلو بچ جائے گا ۔

اسلام آباد کا پتہ یہ ہوگا " جناب عبدالغفور صاحب سیکشن آفیسر ، وفاقی وزارت تعلیم
مکان نمبر ۲۹ ۔ سیکٹر ۷/۴ ۔ اسلام آباد " ناسازی مزاج کا حال معلوم کر کے سخت تردد ہوا ۔ اسکا
ایک سبب گرمی بھی ہے ۔ لیکن اصل باعث وٹامن کی کمی ہے ۔ اس عمر میں بی کمپلیکس اور ملٹی
وٹامن دونوں بعد غذا کے استعمال کرنے ازبس ضروری ہیں ۔ اور ان کو کبھی ترک نہیں
کرنا چاہیئے ۔ میری بھی ایسی ہی تکلیف ہوگئی تھی ۔ یا شاید کچھ زیادہ ۔ ایک نیک ڈاکٹر دوست
کے مشورے سے یہ دوائیں استعمال کیں ۔ عرق عنبر سادہ کا عمل بھی یہی ہے ۔ اعصابی کمزوری دور
ہو جائے گی ۔ تو سارا معاملہ بہتر ہو جائیگا ۔ انشاء اللہ منسلکہ کاغذ پر وٹامن ٹکیاں / کیپسول کے
نام لکھے ہیں ۔ ضرور استعمال فرمایئے ۔ چند ہفتوں ہی میں فائدہ نظر آئے گا ۔ مگر استعمال اب
مستقل جاری رکھنا (میری رائے میں) قطعاً لازم ہے ۔ اللہ فضل فرمائے گا ۔ زیادہ آداب

کمترین
محمد طاہر فاروقی

۴۸۶
سوالات ثانی

صبح شام بعد غذا ایک ایک ٹکیہ } (i) Trividox Tablets (Abbott) } صبح ناشتے کے بعد
(ii) Optilets (Abbott) } یا دوپہر کھانے کے بعد
ایک ٹکیہ (یا لمبی ٹکیہ کہیئے) صبح بعد غذا ۔

(iii) Viterra Capsules (Pfizer) ایک کیپسول بعد غذا ۔ شام کو نمبر ا کے ہمراہ ۔

(iv) (ہمدرد یا اجمل خان یا طبیّ کا) عرق عنبر سادہ ۔ (نہار منہ بہتر ہے)
اسکی خوراک ڈھائی تولہ سے پانچ تولہ ہے ۔ آپ ڈھائی تولہ استعمال فرمایئے ۔

اوقات :- (۱) تہجد یا فجر کے بعد (نہار منہ) عرق عنبر سادہ۔
(۲) صبح ناشتے یا دوپہر کھانے کے بعد Trizidox ایک اور Optilets M ایک
(۳) شام/رات کھانے کے بعد Trinirox ایک Yatenzo ایک۔

محلہ کریم شاہ بخاری عقب میڈ دسنیما
پشاور شہر
۷ر جولائی (۱۹۷۸ء)

مکتوب نمبر ۳

۴۸۵/۹۲

مخدومی و معظمی قبلہ و کعبہ مدظلکم العالی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاجِ گرامی قریبِ اعتدال ہوگا۔ مجھی .... کا کرم نامہ آیا۔ وہ شعبہ کے معاملات سے بیحد پریشان اور اِس کمحد.........................

بڑے ادب سے التماس ہے کہ توجہ فرمائیے۔ اور اس انتشار اور پریشانی سے نکالیئے۔ .... کی پراگندگی و اضطراب کا مجھے اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ ایسے میں زندگی وبال ہوجاتی ہے۔ آپ کے کرم اور دستگیری کی بجا طور پر احتیاج اور التجا ہے۔ "بر کریماں کارہا دشوار نیست" .... ضرور توجہ فرمایئے۔ عین نوازش ہوگی۔

سیرت اقبال کا نیا ایڈیشن طبع ہوکر آگیا۔ انہوں نے جو جلدیں بھیجی ہیں وہ ابھی مجھے نہیں ملیں۔ آج کل میں آجائیں گی، تو حاضرِ خدمت کردوں گا۔ یہ طباعت نہایت دیدہ زیب، مکمل اور خوشنما ہے۔ آج کل کے لحاظ سے انہوں نے قیمت بھی بہت واجبی رکھی ہے انشاء اللہ آپ اُسے ظاہر و باطن ہر لحاظ سے پسند فرمائیں گے۔

ڈاکٹر معزالدین صاحب کو پرسوں پھر خط لکھا ہے .... اپنے اور آپ کے دونوں کے بقایا کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ خدا آسان فرمائے۔ زیادہ آداب۔

کمترین
محمد طاہر فاروقی

مکتوب نمبر ۳

پشاور
۱۵ر جولائی (۱۹۷۸ء)

۴۸۶/۹۲

مخدومی و مطاعی مدظلکم العالی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۱۲ر جولائی صادر ہوا۔ میں نے بھی دو دن ہوئے عریضہ ارسالِ خدمت

کیا ہے۔ ممکن ہے آج ہی لاہو۔ اس میں خاص طور پر .... کی پریشانی اور تشویش کا ذکر کرکے التماس کی ہے کہ ان کی دستگیری اور مشکل کشائی فرمائیے۔ تاکہ یونیورسٹی کا کام آسان ہو اور وہ ذہنی کوفت سے نجات پائیں۔

دواؤں کی بابت ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب کے مشورے معلوم ہوئے ——
(۱) عرق عنبر سادہ (۲) خمیرہ ابریشم ارشد والا۔ (۳) ٹریویڈاکس اور ان کے ساتھ لائیے۔
(۴) ملٹی وٹامن۔ ملٹی وٹامن کی سادہ لمبی ٹکیاں شیشی میں نہیں آتیں۔ بڑے ڈبے ہوتے ہیں۔ سوا پانچ ساڑھے پانچ روپے سیکڑا ملتی ہیں۔ وہ ہلکی ہوتی ہیں۔ سو منگوا لیجئے۔

عام طور پر تین روزانہ (صبح دوپہر شام) کھائی جاتی ہیں۔ آپ کم از کم دو ضرور استعمال میں رکھئے۔ یہ سب دوائیں ابھی سے پابندی سے جاری رہیں۔ تو انشاء اللہ نمایاں فائدہ ہوگا۔ اور رمضان شریف میں بہت سہولت رہے گی۔ رمضان شریف میں بھی افطار کے وقت، تراویح کے بعد اور سحری کے وقت، تین اوقات میں تقسیم کرکے یہ دوائیں جاری رکھیئے۔ انشاء اللہ عام نقاہت اور اعصابی کمزوری سب کا تدارک ہو جائے گا۔ وَھُوَ المستعان۔

گھر سے نکلنا مشکل ہوگا۔ طبیعت بفضلہٖ ٹھیک ہے۔ مگر گھر کی چوکیداری بھی ایک کام ہے۔ میں جاؤں تو بیوی پابند ہو جاتی ہیں۔ بہر حال بخیر می گذرد۔ دعاؤں کا محتاج۔

کمترین
محمد طاہر فاروقی

مکتوب نمبر ۵

پشاور
۱۲ اگست (۱۹۷۸)

مخدومی و مطاعی مولائی و مرشدی مدظلکم العالی

السلام علیکم، آداب مسترشدانہ۔

گرامی نامہ مورخہ ۶ اگست کو مل گیا تھا۔ آپ کی دعائیں میرے لئے موجب تقویت ہیں۔ خدا مجھے آپ کے کلمات خیر کا اہل بنائے!! منجھلے صاحبزادے سید دشریف میں ہیں۔ میں ان کو شہد کے لئے لکھ چکا ہوں۔ اب آپ کے لفافے سے اور تقویت ہوئی۔ آتا ہوگا۔ ضرور استعمال کروں گا۔ شہد کے استعمال سے شکر کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ اسلئے اس سے گریز کیا تھا۔ اب استعمال کی پکی نیت ہے۔ اللہ راس لائے گا۔

محبی ڈاکٹر شمس الدین صدیقی صاحب اپنے کام سے لاہور گئے تھے۔ ڈاکٹر معزالدین صاحب سے اپنے پیسے وصول کرلائے۔ ڈاکٹر معزالدین صاحب نے (ان کے بیان کے مطابق) سب پیسے خرچ کرکے برابر کئے۔ اب کتابوں کی فروخت سے جو آتے جاتے ہیں۔ وہ مصنفین کو بھیجتے ہیں۔

شمس الدین صاحب کے تو تھوڑے ہی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر عشرت حسن کے انگریزی مقالہ کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ "اقبال کی مابعد الطبعیات"۔ ترجمہ نہایت عمدہ اور قابل فہم ہے۔ انگریزی سے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس سے سب سمجھ میں آگیا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

پاکستان میں جھوٹ بولنا کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ کم سے کم ۹۵ فی صد آدمی جھوٹ بولتا ہے۔ . . . . کے اقوالِ زریں بھی اسی ذیل میں سمجھتا ہوں۔

دوا کی بابت میں نے اپنے دوست اور معالج ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ چھوٹتے ہی بولے کہ "یہ دوا تو پیٹ کے السر کے لئے ہے۔ اب نئی دوا آئی ہے۔ اور السر میں بہت استعمال کی جاتی ہے"۔ کیا آپ کو پیٹ میں زخم تجویز ہوا ہے؟ "بُری چیز ہے۔ مگر اس کا ہومیوپیتھک علاج بہت آسان اور اچھا ہے۔ میں خود باوجود اناڑی پن کے کئی مریضوں پر کامیاب علاج کرچکا ہوں۔ اگر اس دوا نے فائدہ نہ کیا ہو تو وہ نسخہ عرض کروں"۔ یہ جملہ پڑھکر بے حد خوشی ہوئی، کہ "بہر حال اس وقت کے لئے تیار ہوں جبکہ صرف ان کا ہی کرم کام دے سکیگا"۔ یہ مقام بہت بلند ہے۔ شکر ہے کہ خدا نے جناب کو نفس مطمئنہ کے اس انعام سے مالا مال کیا ہے۔ الحمدللہ۔ رَبِّ زِدْ فَزِدْ وَھُوَالْمُسْتَعَانُ۔

دعاؤں کی درخواست اور احتیاج کے ساتھ، ویسے بحمداللہ روبہ اصلاح ہوں۔

زیادہ ادب

کمترین

محمد طاہر فاروقی

پشاور۔ ۲۷ر اگست ۱۹۷۸ء

مخدومی ومطاعی۔ مولائی ومقتدائی مدظلکم العالی۔ ۷۸۶

السلام علیکم۔ گرامی نامہ صادر ہوئے کئی دن ہوگئے۔ جواب جلد پیشِ خدمت نہ کرسکا

افسوس ہے شہد منگوالیا ہے۔ اور بالالتزام کھا رہا ہوں۔ خدا کے فضل سے اب نمایاں افاقہ ہے۔ دعاؤں کی بہر حال ضرورت ہے۔ علاج میں توجہ کر رہا ہوں دعائیں آپ خصوصیت سے فرمائیں۔

آپ نے یہ نہ لکھا کہ کیا واقعی آپ کو Abdominal ulcer کی شکایت ہے۔ یا ایسی تکالیف ہیں جن سے پیٹ میں زخم کا احتمال ہو سکتا تھا، یا ڈاکٹر صاحب نے محض تیر تکا فرمایا تھا۔

بہر حال احتیاطاً اس تکلیف کی ہومیو پیتھک کی دوائیں لکھے دیتا ہوں۔ میں خود کئی مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا ہوں۔ اگر پیٹ میں زخم کا اندیشہ ہو تو یہ دوائیں استعمال فرمائیے۔ (i) Uraniumnit 200 ہفتہ میں دو بار یعنی ایک خوراک کے بعد تین دن کا ناغہ۔ پھر ایک خوراک پھر تین دن کا ناغہ اس طرح کچھ دن جاری رکھیے۔ (ii) Nux Vomica ۳۰ رات کو سوتے وقت روزانہ صرف ایک خوراک۔ فی الحال دونوں دوائیں گولیوں میں ایک ایک ڈرام منگوا لیجیے۔ پھر بعد تو چلے گی دوسری ختم ہو جائے تو اور منگوا لیجیے سات [illegible] گولیوں تک کی خوراک [illegible] کر [illegible] لیجیے۔ اندیس [illegible]

عبد الغفور صاحب کو [illegible] کے [illegible] میں [illegible] وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ فوراً ڈاکٹر معز الدین صاحب کو [illegible] کریں۔ زیادہ آداب

کمترین
محمد طاہر فاروقی

(پشاور میں پنجشنبہ ۱۷ شوال ۱۳۹۸ھ = ۲۱ ستمبر ۱۹۷۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ انا للہ...)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طاہر فاروقی مرحوم

پروفیسر محمد طاہر فاروقی کا شمار ان اساتذہ کرام میں ہے جو پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اور دیانت و امانت کے ساتھ، نیک نیتی کے ساتھ اور تمنائے صلہ کے بغیر تعلیم و تعلّم کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ اور ان کا انتہائی مقصد یہ رہا کہ وہ دُنیائے تعلیم میں طلبہ کے ذریعہ سے ایسے نقوش قائم کر دیں، جو انمٹ ہوں اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ایسی راہوں کو ہموار کر دیں جو اہل وطن کو ان کی منزل مقصود تک پہنچا دیں۔ اس میدان میں وہ لگ بھگ ۴۵ سال سرگرم عمل رہے۔ ہائی سکول ہو یا ڈگری کالج، ڈھاکہ یونیورسٹی ہو یا پشاور یونیورسٹی یا انقرہ (ترکی) یونیورسٹی، وہ پورے خلوص و لگن کے ساتھ طلبہ و طالبات کے لئے مینارۂ نور بنے رہے۔ اور حق یہ ہے کہ لاتعداد اساتذہ کے لئے بھی ایک نمونہ کی حیثیت سے وہ تعلیم و تعلّم کے میدانوں میں پیش رفت کرتے رہے۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب سے میری پہلی ملاقات انقرہ میں ہوئی جب وہ جامعہ انقرہ میں شعبہ اُردو کے صدر تھے۔ میں ان کے ماضی سے کسی قدر واقف تھا اور ان کی علمی خدمات سے آگاہ تھا۔ ان سے پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ اس نے ان سے دائمی تعلق کی راہ پیدا کر دی۔

۱۹۷۱ء میں انقرہ سے واپس آ کر اپنے وطنِ ثالث پشاور میں گوشہ نشین ہوگئے۔ اور ایک عالم کی پوری شان کے ساتھ وہ اپنے زندگی کے تجربات و تاثرات کو مرتب کرنے میں منسلک اور مصروف ہوگئے۔ ان کی متعدد قابل ذکر تصانیف ہیں:

سیرتِ اقبال۔ بزمِ اقبال، خیابانِ اقبال، پاکستان میں اُردو نثر نگاری کا فن، ایجادات سائنس۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم۔ سیرت امیر ملّت۔ مختصر تاریخ ادب فارسی۔

ادبیات ایران نو وغیرہ ۔ یہ ایسی تصانیف ہیں، کہ جو اگرچہ مختلف موضوعات پر ہیں ۔ مگر ان کے علمی ذوق اور ان کے تحقیق مزاج اور مطالعۂ سیرت کی آئینہ دار وعکاس ہیں ۔ اور ان تحریروں سے ان کی شخصیت کا اندازہ لگانا مشکل کام نہیں ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اہلِ فکر ونظر جب پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب پر تحقیقی کام کرینگے اور انکی خدمات کا بھرپور جائزہ لیں گے تو ان کو صحیح طور پر ان کی شخصیت کا ادراک ہوگا ۔ اور یہ جان کر ضرور خوشی ہوگی کہ پروفیسر فاروقی کس درجہ نافع الناس تھے اور وہ کس درجہ علم وادب کے لئے وقف تھے ۔ انھوں نے مالی مفاد کو پائے حقارت سے ٹھکراکر علم کی دُنیا میں اپنا مقام پیدا کیا ۔ اپنی ۴۵ سالہ تدریسی زندگی میں وہ اپنے حسنِ عمل، حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار کی وجہ سے بلند ترین مدارج پر فائز ہوتے رہے ۔ مگر ان کے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے بھی احساسِ عظمت نہ پیدا ہوا ۔ وہ ساری عمر انکساری کرتے رہے ۔ اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے لوگوں کے دل جیتتے رہے ۔ خود پیچھے ہٹتے رہے ۔ دوسروں کو آگے بڑھاکر مسرت و اطمینان محسوس کرتے رہے ۔

ان کی آخری زندگی میں میرا ان کے ساتھ قریب سے رابطہ رہا ۔ اور میں نے ان کو ہمیشہ، ہر وقت اور ہر لمحہ سراپا محبت و خلوص پایا اور کام کا دھنی، دل کا غنی، علم و حکمت کا ولی ۔

پروفیسر نظیر صدیقی
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد

طاہر فاروقی

طاہر فاروقی صاحب کے نام اور کام سے پہلے پہل میں اس وقت آشنا ہوا جب ۱۹۴۶-۴۸ء کے درمیان میں میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور میں الیف اے کا طالب علم تھا اور فاروقی صاحب غالباً سینٹ جانس کالج آگرہ میں فارسی کے پروفیسر تھے۔

اُن کی کتاب "سیرتِ اقبال" مجھے کالج لائبریری میں مل گئی تھی۔ اس پر حمید احمد خان کا دیباچہ پڑھکر میں فاروقی صاحب کے نام اور کام دونوں سے مرعوب ہوا۔ خصوصاً اس لئے کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کے "ہمایوں" لاہور میں حمید احمد خاں کے مضامین دیکھ کر اُن سے پہلے ہی مرعوب تھا۔ حمید احمد خاں نے اقبال پر طاہر فاروقی کی کتاب کو پہلی کتاب قرار دے کر اس کی خاصی تعریف کی تھی۔ جو ہر دیباچہ نگار کو کرنا پڑتی ہے۔ فاروقی صاحب کی اس اولیت نے بھی میری نگاہ میں ان کی وقعت اور وقار کو بڑھا دیا تھا۔

اُسی زمانے میں فاروقی صاحب نے ادیب یا ادیب کامل کے عنوان سے اُردو کے پرائیویٹ امتحان کا ایک سلسلہ چلایا جس کی سطح انٹرمیڈیٹ کی تھی۔ ہمارے فارسی کے پروفیسر قاضی شکیل کے پاس اس امتحان کا سرکلر آیا تو انہوں نے مجھ سمیت چند طالب علموں کو اس امتحان میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اُس امتحان میں شریک ہو کر میں نے ادیب یا ادیب کامل کی سند حاصل کرلی۔ جس کا آج سے پہلے میں نے کہیں ذکر بھی نہیں کیا۔ فاروقی صاحب اس امتحان کے رجسٹرار ہوتے تھے۔ اور اس امتحان سے انکا مقصد اردو کو فروغ دینا تھا۔

جب میں ایف اے کے امتحان سے فارغ ہوا تو اُس وقت تک پاکستان کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور میرے والدین مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکے منتقل ہو چکے تھے۔ اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے میرے دل میں یہ آرزو پرورش پا رہی تھی کہ میٹرک کے بعد کی تعلیم مسلم یونیورسٹی میں حاصل کروں اور اس طرح اپنے محبوب ترین ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے فیضان سے مستفید ہوں۔ میٹرک کے بعد علی گڑھ جانا ممکن نہ ہوسکا۔ ایف اے کے بعد یہ منزل دور تر نظر آرہی تھی۔ تاہم علی گڑھ کی آرزو اپنی جگہ قائم تھی۔

ایف اے کے امتحانات سے فارغ ہوکر میں ڈھاکہ پہنچا تاکہ وہاں والدین سے ملاقات ہوسکے اور میں ان سے علی گڑھ جانے کے بارے میں مشورہ کر سکوں۔ اس وقت تک پاکستان اور ہندوستان کے حالات بہت کچھ الجھ چکے تھے۔ بڑے فسادات کے علاوہ ہندوستان اور حیدرآباد کی کشیدگی بڑھتی چلی جارہی تھی، یہاں تک کہ ایک دن حیدرآباد پر ہندوستان نے حملہ کر ہی دیا۔ اب علی گڑھ کے معاملے میں خود میری ہمت پست ہونے لگی۔

انہی دنوں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نیاز حاصل کرنے جانکلا۔ ان سے اپنی تعلیم کا ذکر آیا تو انہوں نے میرے علی گڑھ جانے کے خیال کو نامناسب قرار دیا اور فرمایا کہ پروفیسر طاہر فاروقی آئے ہوئے ہیں۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر رہ چکے ہیں۔ آپ ان سے بھی مشورہ کرلیں۔ مشورے کیلئے دو بجے کے بعد شعبۂ اُردو میں آجائیں۔

میں حسب ہدایت شعبہ اُردو پہنچا تو شادانی صاحب نے میرا تعارف طاہر فاروقی صاحب سے کرایا اور بتایا کہ یہ ایک مسئلے میں آپ کا مشورہ چاہتے ہیں۔

طاہر صاحب سے ملنے کا امکان ہی میرے لیئے نہایت دل خوش کن تھا۔ جب ان سے ملا تو ان کی نورانی شخصیت کو دیکھکر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ اس زمانے میں طاہر صاحب فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھتے تھے۔ جو اُن کے گورے چٹے خوبصورت چہرے پر نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ ان کی عینک اس خوش نمائی میں اضافے کا باعث تھی۔ ان دنوں وہ شیروانی پہنا کرتے تھے۔

طاہر صاحب نے بھی میرے علی گڑھ جانے کے خیال کی تائید نہ کی۔ خصوصًا اس لیئے

قیام پاکستان کے بعد علی گڑھ کی فضا بدل رہی تھی۔ اور اسے مزید بدلنا تھا۔ پھر یہ کہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا تقاضا یہی تھا کہ والدین سے قریب رہ کر تعلیم حاصل کروں۔ مجھے شادانی صاحب اور طاہر صاحب کے مشوروں پر عمل کرتے ہی بنی۔ بالآخر میں نے ڈھاکا یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔

ڈھاکے میں طاہر صاحب کا قیام نہایت مختصر تھا۔ وہ غالباً دوسرے یا تیسرے دن ڈھاکے سے چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں طلبہ کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور تعداد کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تعداد میں اضافے کی ضرورت بھی۔ لیکن شروع شروع میں اُردو کے لائق و فائق اساتذہ ڈھاکے آنے پر آمادہ نہ تھے اور جب وہ آمادہ ہوئے تو شادانی صاحب کی خارجہ پالیسی نے ان اساتذہ پر شعبۂ اُردو کے دروازے بند کردئے۔

ابتدا میں شادانی صاحب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی اور کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالقیوم نعمانی (نگار لکھنؤ کے قارئین اس نام سے ضرور واقف ہوں گے) کو لائے۔ لیکن نعمانی صاحب اپنے ہائی بلڈ پریشر کے ہاتھوں جلد ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کے بعد شادانی صاحب ڈاکٹر شوکت سبزواری کو میرٹھ سے بلانے میں بصد مشکل کامیاب ہوئے۔ ان کے آنے کے بعد شعبۂ اُردو میں ریڈر (جدید اصطلاح میں ایسوسی ایٹ پروفیسر) کی جگہ کا اشتہار نکلا۔

شادانی صاحب نے اپنے رفقائے کار پر یہ بات واضح کردی کہ وہ چاہیں تو ریڈرشپ کے لئے درخواست دے سکتے ہیں۔ لیکن ریڈر باہر کے امیدواروں میں سے لیا جائیگا۔

باہر کے امیدواروں میں وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنے شاگرد اور دوست پروفیسر اختر انصاری کو لانے کے آرزومند تھے۔ لیکن وہ علی گڑھ کی گلیاں چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے۔ اس دوران میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر اختر اورینوی قسمت آزمائی کیلئے ڈھاکے آئے۔ شادانی صاحب سے ملے اور ریڈرشپ کیلئے درخواست دیکر واپس چلے گئے۔ اُن دنوں شادانی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اختر اورینوی کے بارے میں

ان کے تاثرات کیا ہیں۔ کہنے لگے۔ اختر اورینوی اُردو کے مشہور ادیب، ممتاز افسانہ نگار اور تجربہ کار معلم ہیں لیکن لفظ تقریباً بولتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ممکن ہے یہ لفظ غلط ہو لیکن مجھے تو یہ لفظ شبلی نعمانی تک کی تحریروں میں نظر آیا ہے۔ کہنے لگے۔ غلط لفظ خواہ اختر اورینوی استعمال کریں، خواہ شبلی نعمانی وہ غلط ہی مانا جائے گا۔ تقریباً کے معنی میں قریباً استعمال کرنا غلط ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ شادانی صاحب اختر اورینوی کے تقرر کے حق میں نہیں ہیں۔ دراصل یہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اُردو طلبہ کی کم نصیبی تھی کہ اختر اورینوی جیسے وسیع المطالعہ عالم اور ممتاز استاد نے اپنی خدمات پیش کیں اور وہ قبول نہیں کی گئیں۔

اختر انصاری کے انکار کے بعد شادانی صاحب اپنے محترم دوست اور اُردو کے ممتاز محقق قاضی عبدالودود کو لانے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ انہوں نے ریڈر شپ کے لئے ان کی درخواست داخل کرا رکھی تھی۔ امیدوار کا انتخاب انٹرویو کی بجائے ماہرین کی متفقہ رائے پر منحصر تھا۔ ماہرین میں بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق بھی تھے۔ اور کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر زبیر صدیقی بھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی ایک روایت یہ تھی (شاید اب بھی ہو) کہ اساتذہ کے تقرر کے لئے جو سلکشن بورڈ ہوتا تھا اس میں متعلقہ شعبے کا صدر شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شادانی صاحب سلکشن بورڈ کے رکن نہ تھے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ شادانی صاحب کی بھرپور نمائندگی ڈاکٹر زبیر کیا کرتے تھے، جو ان کے خاص احباب میں سے تھے۔

تمام عمر شادانی صاحب کا ایک اصول یہ رہا کہ انہوں نے اصولی تقاضوں پر ذاتی تعلقات کو ترجیح دی۔ چنانچہ ڈاکٹر زبیر صدیقی نہ صرف سلکشن بورڈ کے ممبر تھے بلکہ وہ مدتوں ایم۔ اے اُردو کے زبانی امتحان (Viva Voce) کے ممتحن بھی رہے۔ اسی طرح ایک زمانے میں انہوں نے عارضی طور پر چند مہینوں کے لئے اپنے ایک دوست ڈاکٹر مظفر ندوی کو اپنے شعبے کا اُستاد مقرر کر لیا۔ موصوف عربی اور اسلامیات کے فاضل تھے۔ اُردو ادب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ بہ حیثیت معلم اردو بری طرح ناکام رہے۔ اپنے ان اوصاف کے باوجود وہ سالہا سال بی اے آنرز اور ایم۔ اے (اُردو) کے ممتحن رہے۔ شعبۂ اُردو میں اُردو کے سند یافتہ لوگوں

کو بھی منتخب کرتے وقت شادانی صاحب نے امیدواروں کی تدریسی استعداد سے زیادہ ذاتی اغراض و مفادات ہی پر نظر رکھی۔ نتیجتاً ڈھاکہ یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے برصغیر کے کمزور ترین شعبوں میں سے تھا۔

ریڈر شپ کے فیصلے کے لئے جب سلکشن بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ تو اُس میں ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زبیر صدیقی کے درمیان زبردست مہابھارت ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالحق اور قاضی عبدالودود کے درمیان محققانہ چشمک چلی آرہی تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے موقف یہ اختیار کیا کہ قاضی عبدالودود کے پاس تدریسی تجربہ بالکل نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ریڈر شپ کے لئے موزوں نہیں ہیں۔

میٹنگ تلخ گفتاری پر ختم ہوگئی۔ طے یہ پایا کہ ریڈر شپ کے لئے دوبارہ اشتہار دیا جائے۔ چنانچہ دوبارہ اشتہار دیا گیا۔ اب کی بار امیدواروں میں طاہر فاروقی اور مجنوں گورکھپوری بھی تھے۔ اسی زمانے میں مجنوں گورکھپوری ڈھاکے آئے اور شادانی صاحب سے ملے۔ بوجوہ مجنوں صاحب سے میری ملاقات نہ ہوسکی لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ کاش مجنوں صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی آجائیں۔ ان کے آجانے سے نہ صرف شعبۂ اُردو میں ایک پُر وقار اضافہ ہوجاتا بلکہ ان کا وجود پوری یونیورسٹی کے لئے باعثِ فخر اور موجبِ فیضان بن جاتا۔ لیکن انہیں شادانی صاحب کی حمایت حاصل نہ تھی جس کے اسباب آسانی سے سمجھے جاسکتے ہیں۔

اُسی زمانے کی بات ہے۔ ایک دن شادانی صاحب کے گھر پر مشرقی پاکستان کے اُردو شاعر احسن احمد اشک نے ان سے پوچھا۔ کہئے ڈاکٹر صاحب! آپ کے یہاں ریڈر شپ کا مسئلہ کب تک طے ہورہا ہے اور امیدواروں میں کس کے انتخاب کا امکان زیادہ ہے؟ شادانی صاحب نے کہا۔ سلکشن بورڈ کی میٹنگ عنقریب ہونے والی ہے۔ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے تو کام کے لئے مناسب آدمی چاہئے۔ جو آدمی بھی ملے گا۔ مجھے اس کے ساتھ کام کرنا ہے۔ ویسے اب کی بار جن امیدواروں کے درمیان اصل مقابلہ ہے وہ ہیں طاہر فاروقی اور مجنوں گورکھپوری۔ شخصی اور علمی خوبیوں کے اعتبار سے ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ آپ نے شاید فاروقی صاحب کو دیکھا ہو۔ کیا نورانی شخصیت ہے۔ ان کے مقابلے

ہیں مجنون صاحب ماشاء اللہ تول قسم کے آدمی ہیں ۔ بالکل دبلے پتلے چھوٹے قد کے آدمی ۔ پھر آپ نے اقبال پر مجنوں صاحب کی کتاب دیکھی ہوگی ۔ کتاب کیا ہے کتبیا ہے ۔ اس کے مقابلے میں آپ نے طاہر فاروقی صاحب کی کتاب سیرت اقبال دیکھی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

اگرچہ میں شادانی صاحب کے نیازمندوں اور پرستاروں میں سے تھا ۔ (اور اب بھی ان کی بہت سی خوبیوں کے چاہنے والوں میں سے ہوں) تاہم مجھے ان کی یہ گفتگو غیر منصفانہ اور افسوسناک معلوم ہوئی ۔ شادانی صاحب اپنے معاصرین کو نہ پڑھتے تھے ۔ نہ اُن کے بارے میں صحیح اندازہ رکھتے تھے ۔ اسی لئے انہیں طاہر فاروقی اور مجنوں گورکھپوری کے فرق کا مطلق اندازہ نہ تھا ۔

جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے سلکشن بورڈ کی میٹنگ ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زبیر صدیقی حسبِ معمول بطور ماہرینِ اُردو ادب شریک ہوئے ۔ سلکشن بورڈ کے ایک ممبر فضل احمد کریم فضلی بھی تھے ۔ جو اس زمانے میں حکومت مشرقی پاکستان کے ایجوکیشن سیکریٹری تھے ۔ میٹنگ میں ڈاکٹر عبدالحق اور فضلی صاحب نے مجنون گورکھپوری کی حمایت کی اور ڈاکٹر زبیر صدیقی نے طاہر فاروقی کی ۔ کیونکہ شادانی صاحب کی ہدایت یہی تھی ۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زبیر صدیقی کے درمیان زبردست جنگ رہی ۔ میٹنگ تلخی اور بدمزگی پر ختم ہوئی اور بغیر کسی فیصلے کے ختم ہوئی ۔

ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زبیر صدیقی کے درمیان دو مرتبہ تلخ گفتاریوں کو دیکھکر ڈھاکہ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اُردو ریڈرشپ کے مسئلے کو طے کرنے کیلئے میٹنگ نہ بلائی جائے بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے ماہرین اردو ادب میں سے کسی تین کے پاس امیدواروں کے نام بھیج کر رائیں حاصل کر لی جائیں ۔ مجھے یاد نہیں کہ شادانی صاحب کی تجویز پر کون تین ماہرین چنے گئے ۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ ان تین میں سے ایک پروفیسر رشید احمد صدیقی ضرور تھے ۔ شادانی صاحب کو اپنے مطلوبہ امیدوار طاہر فاروقی صاحب کی حمایت میں تینوں ماہرین یا ان میں سے اکثریت کی رائے غالباً حاصل ہوگئی ۔ امیدواروں میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی تھے ۔ لیکن بہرحال انتخاب طاہر فاروقی صاحب ہی کا ہوا ۔

بہرحال شادانی صاحب بڑی خیت اور خاصی محبت سے طاہر فاروقی صاحب کو اپنے شعبے میں ریڈر کی حیثیت سے لے آئے۔ اب جو اتنی مدت کے بعد فاروقی صاحب ڈھاکے آئے تو پہلی ملاقات میں مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ ان کی شخصیت کا جو تصور میرے ذہن میں تھا وہ اس سے بہت مختلف نظر آئے۔ داڑھی بالکل غائب تھی۔ اور شیروانی کی جگہ سوٹ نے لے لی تھی۔ غرض کہ یہ طاہر فاروقی وہ نورانی شخصیت والے طاہر فاروقی نہ تھے۔

شادانی صاحب طاہر فاروقی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے، جس کی متعدد وجہوں میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پروفیسر حامد حسن قادری کے عزیزوں میں سے تھے۔ شادانی صاحب پروفیسر حامد حسن قادری کا بیحد احترام کرتے تھے۔ قادری صاحب کے نام شادانی صاحب کا ایک نہایت طویل خط میرے علم میں ہے۔ جس میں انہوں نے فراق گورکھپوری کی فنی غلطیوں کے بارے میں قادری صاحب سے تبادلہ خیال کیا تھا۔ اور قادری صاحب سے اپنے اعتراضات کی تائید چاہی تھی۔ یہ سلسلہ ناتمام رہ گیا۔ ورنہ وہ شاید فراق پر بھی ایک ویسا مضمون لکھتے جیسا کہ انہوں نے حسرت، فانی اور جگر پر لکھا تھا۔

پروفیسر حامد حسن قادری علمی اور ادبی خط وکتابت سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ میرے ان کے درمیان بھی کئی سال تک سلسلہ مراسلت رہا۔ بہت سے ادبی مسائل پر میرے ان کے درمیان بیس بیس صفحوں کے خطوط آتے جاتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر کبھی طباعتی سہولت میسر آئی تو اپنے نام ان کے خطوط کتابی شکل میں شائع کرکے انہیں محفوظ کردوں گا۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ جب ان کا قیام آگرے ہی میں تھا اسی زمانے میں انہوں نے میرے نام اپنے سارے خطوط نقلیں تیار کرنے کے بہانے واپس منگا لئے تھے۔ اور بعد میں انہوں نے ان خطوط کو واپس کرنے سے معذوری ظاہر کردی تھی۔ اسی بات پر میرے ان کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہوگئے۔ میں انہیں یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ آپ جیسے بزرگ سے مجھے ایسی وعدہ خلافی کا اندیشہ ہرگز نہ تھا۔

طاہر فاروقی صاحب خوش مزاج اور خوش اخلاق ضرور تھے لیکن ان کے مزاج میں آفریدی پٹھانوں کا کھرا پن بھی تھا۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے۔ نتیجتاً شادانی صاحب سے ان کے تعلقات زیادہ دیر تک نبھ نہ سکے۔ شادانی صاحب انہیں جتنا مانتے تھے

اتنا جانتے نہ تھے۔ اگر جانتے ہوتے تو انہیں اپنے شعبے میں لانے کی کوشش غالباً نہ کرتے۔

جب شادانی صاحب سے فاروقی صاحب کے اختلافات شروع ہوگئے۔ تو فاروقی صاحب شادانی صاحب سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہی نہیں کہ وہ شادانی صاحب سے دور ہونے لگے بلکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق وہ شادانی صاحب کے مقرب طلبہ ارشد کاکوی (مرحوم) اور مجھ سے بھی دور ہونے لگے۔ اس اطلاع کے باوجود مجھے فاروقی صاحب کی ذات سے کوئی کد نہ تھی۔ میں حسب معمول ایک طالبعلم کی حیثیت سے ہر موقع پر ان کا احترام کیا کرتا تھا۔ البتہ میں ان کی علمیت اور قابلیت سے اس حد تک متأثر نہ تھا کہ اپنے کو ان کے نیازمندوں میں شمار کرتا۔ ان میں بھی اتنی رواداری تھی کہ وہ میرے اور ارشد کاکوی کے پیٹھ پیچھے ہم دونوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہتے رہے ہوں، لیکن انہوں نے ہمیں کبھی یہ محسوس نہیں کرنے دیا کہ وہ ہم سے خوش نہ تھے۔

شادانی صاحب سے اُن کی بڑھتی ہوئی علیٰحدگی ہی کے زمانے کی بات ہے، ایک دن شام کے وقت اُن کے یہاں سے لوٹ رہے تھے۔ اور میں تنہا شادانی صاحب کے یہاں جا رہا تھا۔ راستے میں فاروقی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے میری مزاج پرسی کی تو میں نے اپنی طبیعت کی ناسازی کا ذکر کیا۔ انہوں نے مجھے صبح کے وقت ورزش کرنے کا مشورہ دیا جس میں ایک ورزش ڈنٹر پیلنے کی بھی تھی۔ پہلے تو انہوں نے ڈنٹر پیلنے کے عمل کو زبانی سمجھایا پھر اچانک انہوں نے اپنے جوتے اتار کر سڑک کے کنارے ڈنٹر پیلنے کا طریقہ بتادیا۔ میں ان کے اس *demonstration* پر حیران رہ گیا۔ اتفاق سے اس وقت اس سڑک پر میرے اور ان کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ ورنہ تماشائیوں کا ایک ہجوم لگ سکتا تھا۔

جب شادانی صاحب سے فاروقی صاحب کی کشیدگی بہت بڑھ گئی تو انہوں نے ریڈرشپ سے استعفا دیدیا۔ مستعفی ہونے کے بعد غالباً کچھ عرصے تک انہوں نے اورینٹل کالج میں کام کیا یا شاید پشاور یونیورسٹی چلے گئے جہاں سے وہ ڈھاکہ یونیورسٹی آئے تھے۔

۱۹۶۳ء میں جب میرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تأثرات وتعصبات" چھپا تو میں نے ایک جلد ان کے پاس بھیجی وہ بیحد خوش ہوئے اور انہوں نے ریڈیو پاکستان پشاور سے اس پر ایک نہایت موافقانہ تبصرہ کر کے تبصرے کی ایک نقل میرے پاس بھیجدی۔ یاد آتا ہے

کہ اس واقعے سے پہلے یا اس کے بعد انہوں نے شعبے کے میگزین کیلئے مجھ سے مضمون کی فرمائش کی جس کی تعمیل میں نے کردی تھی۔ بعد میں اس میگزین کے مضامین "پاکستان میں اردو" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ فاروقی صاحب نے اس کتاب کی ایک جلد مجھے عنایت کی تھی۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان جب میں کراچی میں تھا تو ان سے دو ایک ملاقاتوں کا موقع ملا۔ بڑی خوش دلی اور خلوص سے ملے۔ ان کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی معصومیت اور بشاشت ہوتی تھی، جس سے میں خاص طور پر لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان میں تکلف اور تمکنت بالکل نہ تھی۔ وہ ہر شخص سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ انہیں کسی سے برگشتہ اور متنفر ہونا ضرور آتا تھا لیکن ان میں درگزر کی صلاحیت بھی تھی۔ وہ عداوت کے اہل رہے ہوں تو رہے ہوں لیکن غیبت کے قائل ہرگز نہ تھے۔ وہ ایک بڑے اچھے مجلسی انسان بھی تھے۔ مجلسوں میں خود کو نمایاں کرنے یا رکھنے کی کوشش نہ کرنے کے باوجود وہ نمایاں رہتے تھے۔ وہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے کے مالک تھے۔ انکی مسکراہٹ فطری تھی۔ اور ان کے قہقہے بے ساختہ۔

طاہر فاروقی صاحب سے میری آخری ملاقات کئی سال پہلے یہیں اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ ان سے مل کر دل کو واقعی خوشی ہوتی تھی۔ یعنی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ ایک فرض ہے جو ادا ہو رہا ہے، اور بس۔ انہوں نے مجھے پشاور میں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور گھر تک پہنچنے کا راستہ سمجھایا۔ لیکن یہ مسرت میری قسمت میں نہ تھی۔ قبل اس کے کہ میں اُن کے گھر تک پہنچوں وہ اپنی آخری آرامگاہ تک پہنچ گئے۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

پروفیسر صدیق جاوید
گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر طاہر فاروقی

(معروف اقبال شناس)

علامہ اقبال کی شاعری اور بیسویں صدی کا آغاز ایک ساتھ ہوا۔ اس صدی کی پہلی دو دہائیوں میں جہاں دوسرے یادگار واقعات رونما ہوئے دنیا اقبال کی شخصیت، شاعری اور فلسفہ بھی علمی اور ادبی دُنیا کا ایک یادگار واقعہ ثابت ہوا۔ اقبال کے فکری اور فنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ان کے فن کی تحسین اور فکر کی تفہیم ایک ضرورت بنتی گئی۔ اور یوں اقبال شناسی کی وہ روایت قائم ہوئی جس نے آگے چل کر اُردو ادب میں ایک نئے شعبے کی تشکیل کی جسے اب اقبالیات کہا جاتا ہے۔ اقبال شناسی کے پہلے دور کی حدود ۱۹۳۸ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس دور میں مطالعہ اقبال کی سنجیدہ کوششیں بیسیوں مضامین کے علاوہ چند باقاعدہ تصانیف اور بعض رسائل کے اقبال نمبر کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ کتابوں میں نواب ذوالفقار علی خاںؒ کی انگریزی کتاب A VOICE FROM THE EAST مولوی احمد دین کی اُردو کتاب "اقبال" اور شیخ اکبر علی کی انگریزی کتاب IQBAL, His Poetry and Message علی الترتیب ۱۹۲۲، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۲ میں شائع ہوئیں۔

ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ کا رسالہ نیرنگ خیال لاہور اقبال کی زندگی میں شائع ہونے والا معروف ترین اقبال نمبر ہے۔ جسے اقبال صدی کے موقع پر رسالہ نقوش نے نیرنگ خیال نمبر کے نام سے شائع کیا ہے۔ جب علامہ اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو مطالعہ اقبال ایسے جوش و خروش سے شروع ہوا کہ ایک تحریک بن گیا۔ یہ سال زمانی حد فاصل متعین کرتا ہے۔ اور یہاں سے اقبال شناسی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد چند مہینوں میں "سہ ماہی اُردو" "سب رس" علی گڑھ میگزین اور جوہر (جامعہ ملیہ) جیسے رسائل کے اقبال نمبر شائع ہوئے۔

اس دور میں اقبالیات کے سلسلے کی پہلی باقاعدہ تصنیف پروفیسر طاہر فاروقی کی کتاب

"سیرت اقبال" ہے۔ جو ۱۸ر جولائی ۱۹۳۸ء کو مکمل ہوئی۔ اور جنوری ۱۹۳۹ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی تھی۔ اور اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں طبع ہوا۔ آج بھی اس کتاب کی اہمیت اور ضرورت برقرار ہے۔ اقبال پر اس سلسلے کی دوسری اہم کتابیں روح اقبال اقبال نئی تشکیل، اقبالِ کامل۔ ذکرِ اقبال، فکرِ اقبال اور شعرِ اقبال بھی علی الترتیب ۴۲ء، ۴۴ء، ۴۸ء، ۵۵ء، ۵۷ء، اور ۶۴ء کے سالوں میں پہلی بار شائع ہوئیں۔ گویا سیرتِ اقبال، اقبالیات کی بنیادی اور حوالہ جاتی کتابوں میں تقدم رکھتی ہے۔ آج بھی مطالعہ اقبال کے لئے جن کتابوں کی سفارش کی جاتی ہے ان میں مذکرہ کتب سرفہرست آتی ہیں۔ اور ان سے استفادہ لازمی خیال کیا جاتا ہے ان کتابوں کا موازنہ اور مقابلہ اور اقبالیات میں مرتبے اور مقام کا تعیّن ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اب طاہر فاروقی مرحوم کی اقبال پر تصنیف و تالیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

سیرتِ اقبال کے مندرجات حسب ذیل ہیں۔ (۱) سوانحِ حیات (۲) شاعری (۳) تبصرہ (۴) اقبال کا پیغام (۵) سیاست (۶) اقبال کا خطاب۔

ان ابواب کو ذیلی عنوانات میں تقسیم کرکے تعلیمات اقبال کے بنیادی مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء کو محررہ تعارفِ کتاب میں فاروقی مرحوم خود لکھتے ہیں۔ ....

حیرت سی حیرت ہے کہ اب تک کوئی ایسی تصنیف شائع نہیں ہوئی جسے پڑھکر علامہ کی تعلیمات کا خاکہ ذہن میں آجائے اور قارئین کو اقبال کی کتابوں کے مطالعہ کی جانب رہنمائی کر سکے۔ میں نے اس مقصد کو سامنے رکھکر "سیرت اقبال" لکھی ہے۔ اور ہر کلیہ اور نظریہ کی بابت علامہ اقبال کی تصانیف سے کافی و شافی اسناد پیش کئے ہیں۔" سیرت اقبال کی اول اشاعت میں پروفیسر حمید احمد خاں نے دیباچہ تحریر کیا تھا۔ حمید احمد خاں دوسرے علمی اعزازات کے علاوہ اقبال کے بالغ نظر ارادتمندوں کی صف میں بھی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اور انہیں علامہ مرحوم سے چند ملاقاتوں کا بھی شرف حاصل ہے۔ ایک پختہ نظر اور اصابت رائے کے حامل نقاد کی حیثیت سے انکی شہادت بڑی وقعت رکھتی ہے۔ انہوں نے دیباچہ میں مصنف کی غیر مشروط ستائش نہیں کی۔ خانصاحب نے مصنف کے کارنامے کی بڑی جامع الفاظ میں تحسین کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :- ......

جہاں تک مجھے علم ہے پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی سعی بلیغ جو اس کتاب کی شکل میں ملک کے سامنے آرہی ہے۔ علامہ مغفور کی وفات کے بعد اس سلسلے میں پہلی کوشش ہے۔ پروفیسر موصوف نے "اقبال بحیثیت انسان" اور "اقبال بحیثیت شاعر" دونوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جو اقبال کے

ایک جامع سیرت نگار کے لئے یقیناً ضروری تھا۔ لیکن کتاب کا بیشتر حصہ اقبال کی تعلیم کی سلجھی ہوئی اور شستہ تشریحات پر منحصر ہے .... اقبال کو سمجھنا اگر مشکل ہے تو سمجھانا اس سے زیادہ مشکل۔ مگر حق یہ ہے کہ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے اس منزل پر اپنی قدرت بیان اور قوت اظہار و مطالب کے جو شواہد پیش کئے ہیں ان کو دیکھکر پروفیسر صاحب کے فہم سلیم اور کمال انشاء دونوں کا یکساں معترف ہونا پڑتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کوئی بات مدعیانہ انداز میں بلا حجت و دلیل پیش نہیں کی۔ پوری کتاب کا انداز علمی اور استقرائی ہے۔ ہر بیان کے لئے خود اقبال کے کلام سے استشہاد کیا ہے۔ اقبال کے کلام سے جو حوالہ جات دیے ہیں ان کی کثرت اور نوعیت کو دیکھکر پروفیسر صاحب کے مطالعۂ اقبال کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز کے ثبوت کے لئے اُن کی نگاہ اقبال کے ابتدائی اور آخری فارسی اور اُردو اشعار پر پڑتی ہے۔ حوالہ جات کی یہ کثرت تعلیم یافتہ حضرات کے اس طبقہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ مفید ہوگی، جسے اقبال کے پورے کلام کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے افکار کی اچھی شرح ہی نہیں بلکہ کلام اقبال کا ایک پاکیزہ انتخاب ہے۔ جس میں اقبال کی زندگی کے کسی دور اور ان کی کسی فارسی یا اُردو تصنیف کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ فاروقی صاحب نے عقیدتمندانِ اقبال کے اُس وسیع طبقے پر بڑا احسان کیا ہے۔ جسے اقبال کی تمام تصانیف نظم و نثر تک دسترس نہ تھی۔ .... فاضل مصنف نے ایک مشکل مضمون کو ہر لحاظ سے عام پسند بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو فلسفہ و حکمت کے رموز سے بیگانہ ہیں، اس تصنیف سے بوجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کی خصوصیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی باتیں دہرائی جا سکتی تھیں۔ بہر حال اس قدرے طویل اقتباس سے سیرت اقبال کی افادیت پر خان صاحب جیسے عالی نظر فاضل معلم اور ادیب کی مہرِ تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ یاد رہے یہ دیباچہ سیرتِ اقبال کے آخری ایڈیشن میں بھی برقرار ہے۔

طاہر فاروقی صاحب "سیرت اقبال" کے ہر ایڈیشن میں ترمیم و اضافہ کر کے کتاب کو مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش ضرور کرتے رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کتاب کی اسکیم اور بیشتر ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ گذشتہ ایک آدھ سال میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے والی بیشتر کتابیں ترتیب و تدوین کے اس مرحلے میں ہیں لیکن انکو مدافعت کی دلیل

اور جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ قاضی اختر جوناگڑھی نے ۱۹۵۵ء میں "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" میں سوانح اقبال کے جائزہ میں لکھتے ہوئے کہا......... ابتک کوئی جامع کتاب اس موضوع (اقبال کے حالات و سوانح زندگی) پر نہیں لکھی گئی۔ طاہر فاروقی صاحب کی "سیرت اقبال" اس سمت میں پہلی کوشش کہی جاسکتی ہے۔ ابتک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرتِ اقبال کی کتنی مانگ رہی ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی تمام حیثیت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس وقت تک اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا اکثر حصہ مؤلف کے پیش نظر تھا۔ اس کے باوجود اسکو مکمل سیرت نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ اُس میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے۔ جسکی ایسی کتاب سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس میں زیادہ حصہ اشعار اور منقولات کا ہے۔ اقتباسات اور واقعات کے لئے اکثر حوالے نہیں دئے گئے۔ ترتیب عام تذکروں کی سی ہے۔ اور اقبال کی خصوصیات پر سرسری طور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے"۔

کتاب کے نام سے یقیناً یہ التباس ہوتا ہے کہ اس میں سوانح اقبال جامعیت اور قطعیت سے بیان کئے گئے ہوں گے۔ اختر میاں نے جن دوسری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ان کا فاضل مؤلف نے چوتھے ایڈیشن میں حوالے فراہم کرکے بہت حد تک ازالہ کر دیا ہے۔ اور کتاب پر نقد و تبصرہ کرنے وقت اگر کوئی رعایت نہ بھی کی جائے تو یہ امر بہر صورت ملحوظ رکھنا پڑیگا۔ کہ اپنی اسکیم اور موضوع کے اعتبار سے یہ پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب زمانی تقدم کے علاوہ اقبال کی تدریس اور تفہیم کا فریضہ تقریباً گذشتہ چالیس سال سے بطریق احسن انجام دے رہی ہے۔

پروفیسر طاہر فاروقی کی اقبال کے فکر و فن سے دلچسپی تاحیات برقرار رہی — علامہ اقبال کی رحلت کے ساتھ برصغیر ہند و پاک کے مختلف مقامات پر شاعر مشرق کی یاد میں اقبال مجلسیں قائم ہوئیں۔ تو آگرہ میں بھی بزم اقبال کی بنیاد رکھی گئی۔ طاہر فاروقی اسکے معتمد تھے۔ تعلیماتِ اقبال کی اشاعت اور اُردو زبان کی ترویج اس بزم اقبال کے بڑے مقاصد تھے۔ بزم اقبال آگرہ نے اقبال سیشن منعقد کیا۔ اس میں جو مقالات اور منظومات پڑھی گئیں۔ انہیں طاہر فاروقی نے مرتب کرکے سال ۱۹۴۴ء میں آگرہ سے کتابی صورت میں بزم اقبال کے نام سے شائع کیا۔ طاہر فاروقی شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی کے صدر تھے۔ انہوں

نے شعبہ کے ادبی مجلے "خیابان" کے نگران کی حیثیت میں جون ۶۲ء میں اس مجلہ کا اقبال نمبر شائع کرایا۔ اس کے شریک مدیر خاطر غزنوی اُستادِ شعبۂ اُردو تھے۔ یہ نمبر بہت مقبول ہوا۔ اسکی افادیت اور مانگ کے پیش نظر سال ۶۶ء میں کتابی شکل میں "خیابانِ اقبال" کے نام سے شائع کیا گیا۔

طاہر فاروقی کے تین مضمون "اقبال کا تصورِ وطنیت"۔ "اقبال مکاتیب کے آئینے میں" اور ساقی نامہ شامل مجلہ اور کتاب ہیں۔ اس سے دو تین سال بیشتر خونِ جگر کی نمود (اقبال کا نظریۂ فن) ماہ نو میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ مضمون ماہ نو اقبال نمبر ۷۷ء میں بھی شامل ہے۔ اقبال کے تصورِ مردِ مومن پر بیسوں مقالے چھپ چکے ہیں۔ کسی پامال موضوع پر قلم اٹھانا خوشہ چینوں کیلئے آسان کام ہے۔ مگر کسی صاحبِ نظر اور نکتہ دان کیلئے لیاقت و اہلیت کا امتحان ہوتا ہے۔ رسالہ "فنون" لاہور کے شمارہ جولائی اگست ۱۹۶۶ء میں پروفیسر طاہر فاروقی کا اقبال کے مردِ مومن پر مضمون شائع ہوا تھا۔ جو ڈاکٹر یوسف حسین اور پروفیسر عزیز احمد کے بعد بلا شبہ ایک تازہ اور قابلِ داد مضمون ہے۔

اقبال صدی کے موقع پر نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ ولادت علامہ محمد اقبال کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی کی کتاب بعنوان "اقبال اور محبت رسول صلعم" ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور سے شائع کی۔

طاہر فاروقی کی اقبال سے دلچسپی متذکرہ بالا سطور سے ظاہر ہے۔ سیرتِ اقبال میں حب رسول صلعم کے عنوان سے تین چار موقعوں پر اقبال کے جذبات و احساسات بیان کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ اُسی زمانے سے طاہر مرحوم خود حبّ رسول اللہ صلعم کو حرزِ جان بنائے ہوئے تھے۔ مگر وہاتِ دُنیا کے الجھاؤں میں اُن کے مذہبی رجحانات شاید غالب نظر نہیں آتے۔ مگر حیاتِ مستعار کے آخری سالوں میں وہ معرفت و سلوک کی منزلوں میں مصروفِ عمل دکھائی دیتے تھے۔ سرخ و سفید طاہر فاروقی عمر کا بیشتر حصہ کلین شیو رہے۔ آخری پانچ سات سالوں میں ڈاڑھی چھوڑ دی تھی۔ گویا مذہبی روایات اُن کا تجربہ بن چکی تھی۔ اور رسول اللہ صلعم کی محبت سے وہ سرشار تھے۔ وفات سے صرف ۹، ۱۰ ماہ قبل نومبر ۷۷ء میں "اقبال اور محبتِ رسول صلعم" شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب نہ صرف طاہر فاروقی کی علمی پختگی اور ادبی لحاظ سے قدرتِ زبان و بیان کا

ثبوت ہے۔ بلکہ اپنے موضوع پر تحقیق و ترتیب، تشکیل اور جذب وشوق کی ترکیب و امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ کتاب کی تمہید میں علامہ اقبال کی رسول اکرم صلعم سے والہانہ شیفتگی اور فریفتگی کو واقعات و مکتوبات اور علامہ کے اشعار کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ تمہید کے بعد پہلا باب عشق کے عنوان سے ہے۔ اسمیں پروفیسر صاحب نے عشق کے معنی اور مفہوم کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا باب عشق رسول اکرم صلعم کے نام سے ہے۔ جس میں سنتِ رسولؐ کی پیروی کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اس باب کا دوسرا حصہ صحابہ کرام کی محبت رسولؐ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں اطاعتِ رسولؐ کی اہمیت اور حکمت، قرآنی آیات اور اقبال کے شعروں کے حوالے سے درج ہے۔ چوتھا باب سیرتِ رسولؐ کے زیر عنوان ہے۔ یہ باب تین ذیلی فصلوں (۱) سیرت طیبہ (۲) اسوۂ حسنہ (۳) مکارم اخلاق میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انسان کامل، زیر نظر کتاب کا پانچواں باب ہے جس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مردِ مومن کیلئے واحد مثالی پیکر ہی انسان کامل یعنی رسول اکرم صلعم کی ذاتِ گرامی ہے۔ چھٹے باب کی سرخی "قرآنِ حکیم" کے الفاظ ہیں اس باب کا استدلال ابتدائی پانچ سطور سے سامنے آجاتا ہے۔ طاہر فاروقی لکھتے ہیں:۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ قول پہلے آچکا ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔ کہ رسول اکرم صلعم کے اخلاقِ حسنہ عین قرآن کریم تھے۔" کَانَ خُلقه القرآن"۔ یعنی قرآن حکیم میں جو احکام و فرامین الفاظ کی صورت میں بیان ہوئے ہیں، حضور صلعم کے حیاتِ طیبہ میں ان کی عملی تفسیر تھی۔ ساتویں باب میں ارمغان عقیدت میں تعارف نعت گوئی اور اُردو نعت کے نمونے پیش کئے ہیں۔ آخری باب موسوم بہ لغاتِ شوق میں اقبال کے شعروں کے حوالے سے انکی حضور اکرم صلعم سے عقیدت ووابستگی کا حال بیان کیا ہے۔ اِس کتاب کی ضخامت ۲۲۷ صفحات ہے۔

راقم الحروف کو پروفیسر طاہر فاروقی سے چار پانچ موقعوں پر ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن میں سے ہر ملاقات مختصر اور سرسری تھی۔ مرحوم کے جن اوصاف کا تذکرہ سُنا تھا، ملاقاتوں میں ان کی تصدیق ہوگئی۔

فاروقی مرحوم انتہائی کشادہ جبین اور نرم دل اور گرمجوش آدمی تھے۔ وہ ایسے شخص تھے، جنکے بارے میں ماہرین نفسیات کو احساس برتری اور احساس کمتری کی

اصطلاحات اِستعمال کرتے وقت سو بار سوچنا پڑتا۔ چھوٹے اور بڑے یکساں ان کے گرویدہ تھے۔ وہ زندہ دل اور خوش باش انسان تھے۔ علمی مقام مرتبہ کے زعم میں مبتلا شخصیتوں کی طرح وہ اپنے اُوپر غیر ضروری اور ساختہ ثقاہت کو طاری نہیں کرتے تھے۔ وہ زرہ پوش آدمی نہیں تھے۔ اور شاید اُسکی انہیں ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بے ریا اور بے تکلف قسم کے مجلسی انسان تھے۔ ترکی میں ایک عرصہ اُردو کے پروفیسر رہے۔ پشاور یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے۔ مگر اپنی فطری بے نیازی کے سبب دوسروں پر اپنی شخصیت نہ ٹھونس سکے۔ اور کسی شخصیات غیر کے مرہونِ منت نہ ہوئے۔

ہمارے ہاں ہوس کچھ معاشرتی قدر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اور اس کے اثرِ بد سے ادب جیسی غیر مادی چیز بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ یار لوگ کوئی ٹھوس کام کئے بغیر عظمت و انفرادیت کے تمغے سجانے کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ جن لوگوں نے قابلِ ذکر کارنامے سرانجام دئے ہیں۔ ان کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے بخل سے کام لیتے ہیں۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی کا خیال مجھے بار بار یاد کراتا ہے کہ تعریف و تحسین کے بارے میں ہم دوسروں کے بارے میں بڑے بخیل اور اپنے سلسلے میں مسرف واقع ہوئے ہیں۔ اور تو اور دست طلب دراز کرنے میں بھی حجاب محسوس نہیں کرتے۔ مگر طاہر فاروقی اِس اعتبار سے مختلف آدمی تھے۔ وہ عزیزوں اور طالب علموں کی خوب دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے۔ اپنے معاصرین کی اہمیت کا دل کھول کر اعتراف و اقرار کیا کرتے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے اپنی عظمت کا مینار تعمیر کرنے کیلئے کبھی چندہ اکٹھا نہ کیا تھا۔

پروفیسر حشمت جہاں ناز
گورنمنٹ گرلز کالج ایبٹ آباد

بزمِ ادب کا ایک روشن چراغ

طاہر فاروقی صاحب اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ بزم ادب کا ایک اور چراغ بجھ گیا۔ چمن اُردو کا ایک اور باغبان چل بسا۔ سرزمین پاک کا ایک اور چہکتا ہوا بُلبل خاموش ہوگیا۔ صوبۂ سرحد کی ادبی فضا ایک مرتبہ پھر سوگوار ہوگئی ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

طاہر صاحب کو اُردو ادب سے جو دلبستگی تھی، وہ مختلف رنگوں میں اپنے جلوے دکھاتی رہی۔ پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا چراغ آپ کے ہی ہاتھوں روشن ہوا۔ بیشمار طلبا اِن کی ذات سے فیضیاب ہوئے۔ علم و فضل کا دریا بہتا رہا۔ سینکڑوں طالب ہاتھ دھوتے رہے۔ بیس بائیس سال تک وہ اس چمن کی آبیاری کرتے رہے۔ اسکے ذرّہ ذرّہ پران کی خدمات کی مہر ثبت ہے۔ اِس کی فضاؤں میں گویا آج بھی ان کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ انکی یادیں آج بھی اِس شعبہ سے وابستہ ہیں۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ آج اس سرزمین پر جو چراغاں ہے وہ اِسی ایک چراغ کی ضیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کا جو اِس علاقہ میں چرچا ہے۔ وہ ایک حد تک انہیں کی ذات کا فیضان ہے۔ اور لکھنے لکھانے کا جو سلیقہ ہے وہ اسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے۔ ان کی بیشتر تصنیفات و تالیفات نصاب میں شامل ہیں جو اِس صوبہ میں مختلف درجات میں طلباء پڑھ رہے ہیں اور یوں گویا ان کا ہی ذہن علمی و ادبی فضا پر چھایا ہوا ہے۔

طاہر صاحب بحیثیت اُستاد طلبا میں مقبول و معروف تھے۔ مشکل موضوعات کو بھی وہ اپنی ذہانت اور قادر الکلامی کے بل پر آسان اور سہل بنا دیتے تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے کا ایک عجیب مادہ قدرت نے ودلیعت کیا تھا۔ یونیورسٹی کے علاوہ پرائیویٹ طلباء بھی کسی معاملہ میں ان سے مدد کے طالب ہوتے تو وہ گوناگوں مصروفیات کے باوجود انکی ہر طرح

مدد کرتے۔

مہمان نواز تھے۔ اکثر گھر پر مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا۔ احباب کا مجمع رہتا جس میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ شامل ہوتے۔ ہر ایک کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آتے۔ اخلاص و مرحمت کا مظاہرہ کرتے۔ طرح طرح کے لطائف و ظرائف سناتے ہنستے ہنساتے۔ خاطر مدارات کرتے۔ وہ بزرگوں میں بزرگ۔ جوانوں میں جوان۔ اور بچوں میں بچہ نظر آتے تھے۔ غرض ہر مجلس کی شان اور ہر محفل کی جان تھے ۔

گلشن میں سرو فوج میں مثل نشاں رہے ؛ عالم میں سر بلند رہے ہم جہاں رہے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آج سے تقریباً بیس سال قبل میں ان سے پہلی بار ان کی قدیم رہائش گاہ صاحب سنگھ بلڈنگ پر ملی تھی۔ پہلی مرتبہ ہی وہ اس قدر بے تکلفی، اس قدر خلوص اور اس قدر شفقت سے ملے جیسے کوئی اپنا عزیز خاص اور شفیق بزرگ ملتا ہے۔ اِن کی یہ شفقت و مرحمت ہمیشہ قائم رہی ــــــ زمانہ طالب علمی میں میری مدد فرماتے رہے۔ اور قدم قدم پر رہنمائی کرتے رہے۔ بعد میں بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میں جب پشاور جاتی بہت اپنائیت سے ملتے۔ میری پہلی کتاب "اردو نثر نگاری" شائع ہوئی آپ نے بہت سے اچھے مشورے دئے، جو بعد میں بھی میرے کام آئے غرض میری ہر تصنیف و تحریر کی داد دیتے اور ہمت افزائی فرماتے۔

ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ برسوں پرانی باتیں یاد رہتیں۔ اور انہیں تفصیل سے مزے لے لے کر سناتے۔ میں جب بھی اور جتنے عرصہ کے بعد بھی ملتی فوراً پہچان جاتے۔ ان کے انتقال سے تقریباً دو ماہ قبل میں ان سے ملنے ان کے گھر گئی۔ آپ نماز میں مشغول تھے۔ ہم ڈرائنگ روم میں ان کا انتظار کرنے لگے۔ اندر آئے اور کہنے لگے کہ میں بغیر دیکھے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ضعیفی اور کمزوری کے باوجود گھنٹوں ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ اپنے ہاتھ سے مالٹے کاٹ کر دیتے تھے۔ اور لطیفے سُناتے رہے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ کچھ عرصہ بعد بیٹے کی شادی کا دعوت نامہ بھیجا۔ شادی ایبٹ آباد میں تھی مگر ان دنوں میں بیمار تھی شریک نہ ہوسکی بعد میں جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ خبر آئی کہ طاہر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ع

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

وہ انتہائی وضعدار انسان تھے۔ جب بھی ایبٹ آباد آتے ہمارے گھر ضرور آتے،

اکثر خطوط کے جواب تفصیل سے دیتے۔ اور مختلف متنازع فیہ مسائل پر تسلی بخش تبصرہ کرتے۔ آج وہ اس جہاں میں نہیں لیکن ان کی خوبیاں ایک ایک کرکے یاد آرہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے باغ و بہار۔ زندہ دل۔ ذہین اور جیتے جاگتے انسان پر موت کیسے غالب آگئی۔ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید عرصہ تک پُر نہ ہوسکے۔ ہم ایک شفیق اُستاد۔ اعلیٰ ادیب۔ بے باک نقاد اور ایک عظیم انسان سے محروم ہوگئے۔ ع

آسماں اُسکی لحد پر شبنم افشانی کرے

پروفیسر محمد نذیر اشک

اُستاد طاہر فاروقی

(یادیں اور تاثرات)

پہلے پہل مرحوم سے تعارف سیرتِ اقبال کے مرتب و مؤلف کی حیثیت سے ہوا۔ ذاتی شناسائی بہت بعد میں ہوئی۔ عام طور پر ایک نوجوان پڑھنے والا جس کتاب سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے مصنف کا دیوقامت ہیولیٰ ذہن پر کافی عرصہ تک مسلط رہتا ہے۔ لیکن سیرۃ اقبال کا مصنف میرے لئے ایک مختلف حیثیت رکھتا تھا۔ کتاب پڑھنے کے بعد اُن کا تصور ایک شفیق و مہربان اُستاد کا تصور تھا۔ کتاب کی عبارات سلیس، لہجہ شائستہ و شستعلیق، ترتیب نصابی مضامین پُر از معلومات، انداز بیان دلچسپ مگر باوقار کتاب' اقبال جیسی کھاری بھرکم شخصیت پر ہونے کے باوجود ہلکی پھلکی اور مختصر، حیاتِ اقبال کے ہر پہلو پر حاوی ہونے کے باوصف ادب و احترام کے تمام تر تقاضوں کو محبت و شائستگی سے ادا کرتی ہوئی۔ یہ تھا مرحوم طاہر فاروقی کے بارے میں میرا ابتدائی تاثر۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں جب پشاور یونیورسٹی قائم ہوئی۔ تو کچھ عرصہ بعد سُنا کہ طاہر فاروقی صاحب پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے حصے میں آئے ہیں۔ پہلے اُن کا نام آگرہ کالج کے حوالے سے پڑھا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھارت و پاکستان کی دو آزاد مملکتوں میں جو اثاثے تقسیم ہوئے۔ اُن میں میرے نزدیک سب سے قیمتی اثاثہ ہندوستان کی علمی و ادبی شخصیات تھیں ہیں۔ میں اِس بات میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ کہ کونسی علمی شخصیت کس کے حصے میں آتی ہے۔ طاہر فاروقی صاحب کی پشاور آمد میرے لئے ایک متاعِ گرانمایہ کی منتقلی سے کم نہ تھی۔ یہ واقعہ میرے لئے بہت مسرت انگیز تھا۔ اگرچہ میں اُن سے براہ راست مستفید نہ ہو سکتا تھا لیکن یہی کیا کم تھا کہ آگرے کا ایک چراغ خیبر کی پہاڑیوں پر جل رہا تھا۔ جس کی روشنی سے یہ خطہ منور ہوگا۔

شعبۂ اردو میں جو طالب علم داخلہ لیتے، اُن سے شعبے کے حالات معلوم کیا کرتا۔ یہ طالبعلم

سب سے زیادہ ذکر فاروقی صاحب کی من موہنی شخصیت کا کیا کرتے۔ میں میٹرک کے بعد مختلف ملازمتیں کرتے ہوئے پیشہ تدریس سے وابستہ ہوگیا تھا۔ اور ایف اے، بی اے پرائیویٹ طور پر پاس کرنے کے بعد پشاور پہنچ کر بی ٹی میں داخلہ لیا۔ تو طاہر فاروقی صاحب کی زیارت نصیب ہوئی۔ اُنہیں مختلف تقاریب میں دیکھا۔ کبھی انگریزی سوٹ میں، کبھی شیروانی میں اور کبھی شام کے بعد سیر کرتے ہوئے کُرتے پائجامے میں۔ ہر رنگ میں اُن کی چھب نرالی تھی۔ میرا خیال تھا کہ انگریزی سوٹ وہ تکلفاً پہنتے تھے محض رسم دُنیا کو نبھانے کے لئے۔ ورنہ اُن کے قدو قامت کا جادو اور شخصیت کے رنگ و بُو مشرقی لباس میں زیادہ نکھر کر سامنے آتے تھے۔

ذاتی ملاقاتوں کا سلسلہ اُس وقت شروع ہوا جب ۱۹۶۰ء میں میں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے ایم۔ اے پریویس کا امتحان دیا۔ اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ اب ایم اے فائنل کے لئے باقاعدہ داخلہ لینا چاہیئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے فائنل کا امتحان دے کر اپنی امتیازی حیثیت برقرار نہ رکھ سکوں گا۔ چنانچہ فاروقی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یاد پڑتا ہے۔ کہ یہ ملاقات جناب پروفیسر افضل قصوری صاحب کی معرفت ہوئی، جو فاروقی صاحب کے نیاز مند، میرے دیرینہ دوست اور اُس وقت پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ امتحانات میں کام کرتے تھے۔

پرائیویٹ طالب علم ویسے بھی شرمیلا اور کچھ احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی تھا۔ فاروقی صاحب سے ڈرتے، گھبراتے، شرماتے ہوئے مِلا۔ لیکن وہ جو میرانیسؔ نے کہا ہے

؎ مری قدر کر اے زمین سخن ٭ کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

اس شعر کی عملی تفسیر مجھے اپنی زندگی میں صرف دو شخصیتوں سے مِل کر ہوئی۔ ایک مرحوم قریشی احمد علی صاحب صادق جو اسلامیہ کالج پشاور کے سابق پروفیسر اور صوبہ سرحد کی ایک بہت بڑی علمی و ادبی شخصیت تھے۔ اور جن کا شمار متحدہ ہندوستان کے ماہرین تعلیم میں سے ہوتا تھا۔ دوسرے طاہر فاروقی صاحب مرحوم۔ اپنے چھوٹے سے چھوٹے ملنے والے کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہ وہ چھوٹا ہے۔ اور یہ خود بڑے ہے۔ بلکہ ان سے اِس انداز سے ملتے گویا چھوٹا آدمی ہرگز چھوٹا نہیں۔ بلکہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اور یہ خود ایک طالب علم جو اُن سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مجھے اِن دونوں حضرات سے مِل کر یہ احساس ہوا کہ میں بھی ایسی باتیں کہہ سکتا ہوں جن سے یہ حضرات بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں تھا۔ صرف اِن کے ملنے میں

بڑھاوا دینے کا انداز تھا۔ جس سے ہر زمینِ سخن اپنے تئیں آسمان سمجھنے لگتی۔ اِس سے خُردوں میں حوصلہ مندی پیدا ہوتی۔ "برآور ہر چہ اندر سینہ داری" کا ولولہ جاگتا۔ اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے ارمان انگڑائیاں لینے لگتے۔ دُنیا پہلے سے زیادہ خوبصورت اور رہنے کے قابل نظر آتی۔ یہ محض فاروقی صاحب کی شخصیت کا طلسم تھا۔ جو خاک کے ذروں کو رازالوندی سے آشنا کر دیتا۔

فاروقی صاحب سے پہلی ملاقات نے میرے اندر یہ سب حوصلے پیدا کر دیئے۔ اور ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کا اشتیاق رہتا۔ چنانچہ اِس کے بعد اُن سے کئی ایک ملاقاتیں رہیں۔ وہ ہر بار اس انداز میں دریافتِ حال فرماتے گویا میں بھی اُن کے کنبے کا ایک فرد ہوں۔ اور میرے دُکھ سکھ کا اُنہیں ہر وقت خیال رہتا ہے۔ میں بھی بے تکلفی سے اپنے مشکلات و مسائل بیان کرتا۔ اور وہ ایک ایسے مشفق طبیب کی طرح مشورے عنایت کرتے، جس سے آدھی پریشانی تو اُسی وقت جاتی رہتی۔ اور باقی آدھی پریشانی کو دُور کرنے کی سکت آجاتی۔ چنانچہ میں نے فائنل کی کلاس میں باقاعدہ داخلہ لینے کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ مجھ میں اب یہ اعتماد بحال ہو چکا تھا کہ شعبہ اُردو میں ایک ایسے صاحب موجود ہیں جو ہر طالب علم کو خواہ وہ ریگولر ہو یا پرائیویٹ محض ایک طالب علم سمجھتے ہیں۔ اور جہاں کہیں بھی وہ ہو اُسکی قدر افزائی اور ہمت افزائی میں بہت فراخدلی سے کام لیتے ہیں۔

میں اپنی زندگی کا یہ واقعہ ہرگز نہیں بھول سکتا۔ پریویس میں اوّل پوزیشن لینے کے بعد فائنل میں اِسے برقرار رکھنے کے مسئلے تھا۔ اندر ہی اندر مسابقت کی ایک رَو طالب علموں میں چل رہی تھی۔ فائنل میں دو مرحلے بہت سخت تھے۔ ایک مضمون کا پرچہ جس میں صرف ایک مضمون سو نمبر کا ہوتا تھا۔ اور دوسرا زبانی امتحان جس میں پانچ سات منٹ میں سو نمبروں کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ ایک پرائیویٹ طالب علم کے لئے دونوں مرحلے خاصے دشوار تھے۔ مضمون کے پرچے میں میں نے اپنے لئے 'جدید نظم اور اُس کے علمبردار' کا موضوع چُنا۔ میری یہ عادت رہی ہے کہ میں امتحان میں عموماً ایسے موضوع کا انتخاب کرتا، جسے بہت کم طالب علم ہاتھ لگاتے۔ اُس میں فائدہ یہ رہتا کہ ممتحن اُس مضمون کا مطالعہ کرنے میں تازگی محسوس کرتا ہے۔ اور کم از کم سارے مضمون کو پڑھ کر نمبر دیتا ہے۔ جدید نظم کا مطالعہ ویسے بھی میں نے اپنی ذاتی دلچسپی کیلئے بساط بھر اچھا خاصا کیا تھا۔

میں نے مضمون کا ایک خاکہ بنایا۔ اور پھر اُس خاکے کی مدد سے مضمون لکھا۔ مضمون پلان کرنے میں کوئی نصف گھنٹہ اور لکھنے میں غالباً گھنٹہ سوا گھنٹہ لگا۔ نظر ثانی میں پندرہ بیس منٹ۔ گویا یہ سارا عمل دو پونے دو گھنٹے میں ختم ہوگیا۔ سارا مضمون بارہ چودہ صفحات پر ختم ہوگیا۔ میرے ساتھ کے طالب علم پوری کاپی ختم کرنے کے بعد شیٹوں پر شیٹیں مانگ رہے تھے۔ میرے حوصلے پست ہوگئے۔ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے میں نے پرچہ ممتحن کے حوالے کیا۔ اور اُٹھ کر چلا آیا۔ باہر لان میں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگا۔ وقت ختم ہونے پر دوسرے طالبعلم (خاص طور پر جن سے مقابلہ تھا) باہر نکلے۔ تو وہ بہت ہشاش بشاش تھے۔ کسی نے چھبیس کسی نے چوبیس اور کسی کسی نے اٹھائیس صفحات تک لکھے۔ لیکن اُن کا موضوع "سرسید اور اُن کے رفقاء کا عہدِ زرین" تھا۔ میں بہت مایوس ہوا۔ اور دِل میں سمجھ گیا کہ اب کے اول پوزیشن تو گئی۔ اور یہ بات میرے لیئے بہت شرمندگی کا باعث تھی۔ نہایت بوجھل قدموں سے تھکا ہارا، ہاسٹل پہنچا۔ کھانا کھا کر بستر پر لیٹا۔ تو خیال آیا کیوں نہ فاروقی صاحب کو صورتِ حال بتائی جائے۔ چنانچہ شام کو اُن کے دولت خانے (صاحب سنگھ بلڈنگ پشاور صدر) پہنچا۔ فاروقی صاحب حسبِ سابق نہایت تپاک سے ملے۔ چائے منگائی۔ خیریت دریافت کی۔ میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ پریشان ہو کر کہنے لگے "کیا بات ہے۔ میں نے پورا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "میاں جو کچھ آپ نے کیا، بہت صحیح کیا۔ بہت درست کیا۔ ایک معقول مضمون اتنے ہی وقت میں اور اتنے ہی صفحات پر لکھا جا سکتا ہے۔ میں آگرہ کالج سے لیکر اب تک پرچے جانچتا آیا ہوں۔ کئی یونیورسٹیوں کا ممتحن رہا ہوں۔ اب بھی میرے پاس پرچے آتے ہیں۔ بارہ چودہ صفحات سے زیادہ جو بھی لکھتا ہے جھک مارتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی ہانکتا ہے۔ بے مغز، بے مطلب باتیں ہوتی ہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ تم نے بہت صحیح کیا ہے۔

اُن کی اِن باتوں سے میری جان میں جان آئی۔ اور میں پھر سے تازہ دم ہو کر زبانی امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ وہاں بھی سامنا ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم، مولانا عبدالقادر صاحب (مرحوم) ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی اور فاروقی صاحب (مرحوم) سے تھا۔ وہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور عبدالقادر صاحب کی جرح و تنقید کا نہایت خندہ پیشانی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور طالب علمانہ انکساری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس واقعہ کے اظہار سے مقصود صرف یہ ہے کہ اگر یاس و قنوطیت کے اُس عالم میں فاروقی صاحب کی مشفقانہ باتوں نے حوصلہ نہ دلایا ہوتا تو زبانی امتحان میں اور بالآخر نتیجہ میں وہ شاندار کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

فاروقی صاحب کی طبیعت جلال و جمال کا امتزاج تھی۔ اُن کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ ہر معاملہ کو حسن تدبیر سے معقولیت۔ وضعداری اور شرافت کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب مخاطَب کسی طرح قائلِ معقول نہ ہوتا۔ تو فوراً اُن کی رگ فاروقیت پھڑکتی اور گفتگو کا رُخ سلیس اُردو کی طرف منتقل ہوجاتا۔ یہ "سلیس اُردو" اُن کی خاص اصطلاح تھی۔ کہا کرتے "اور پھر میں نے سلیس اُردو میں بات شروع کی ....."

اُن کی سلیس اُردو کیا تھی۔ ہر قسم کی ناگفتنی کو گفتنی بنا کر پیش کردیتے۔ اور مخاطَب جلد اکر اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ یہ اسلحہ اُن کے توشہ خانے میں ہر وقت محفوظ رہتا۔ اور بوقت ضرورت اُس کا استعمال کرنے پر آمادہ ہوتے۔ جو لوگ اُن کی طبیعت کے اس انداز سے واقف تھے۔ وہ اُن کی رفتارِ گفتار کو اس منزل تک پہنچنے ہی نہ دیتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ اس حدِ ادب کے بعد سلیس اُردو کی حد شروع ہوجاتی ہے۔

مرحوم کی زندگی کے ایک اور رُخ کا مشاہدہ بھی مجھے ہوا۔ جس کے بھید سے نہ تو کوئی پردہ اُٹھانے کی میں نے کوشش کی اور نہ اس کی توجیہہ میرے پاس ہے۔ بہرحال یہ ایک ایسا رُخ ہے جو اُن کے فاروقی مزاج سے تو کوئی بعید نہیں لیکن مجھے اِس کی توقع ہرگز اُن سے نہ تھی۔

اب وہ واقعہ سنیئے۔ سنہ تو یاد نہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے۔ کہ مرحوم خیابان کے اُردو نمبر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جو اب "پاکستان میں اُردو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مرحوم نے مجھ سے بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنے لئے "پاکستان میں اُردو خاکہ نگاری" کا موضوع منتخب کیا۔ اور شعبہ کی لائبریری سے خاکہ نگاری کے موضوع پر چند کتابیں طلب کیں فاروقی صاحب نے اعجاز الرحمن (مرحوم) کو بُلا کر کہہ دیا کہ اِسے (راقم کو) کتابیں دیدی جائیں۔ اعجاز صاحب سے بھی میری شناسائی تھی۔ شعبے کے طلبہ میں وہ ایک اچھے محنتی اُستاد کی شہرت رکھتے تھے۔ اِس بناء پر میں اُن کا بے حد احترام کرتا تھا۔ مرحوم سے کئی ملاقاتیں بھی ہوچکی تھیں۔ وہ اُردو ادب کے اچھے طالب علم تھے۔ اور اِن ملاقاتوں کے بعد اُن سے

خوشگوار تعلقات تھے۔

اعجاز صاحب اور میں جب لائبریری میں داخل ہوئے۔ تو وہ مجھ سے نہایت رُکھائی سے پیش آئے۔ جیسے وہ مجھ سے قطعاً واقف نہ ہوں۔ میں نے از خود سلسلہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اُن کی خیریت دریافت کی۔

"اعجاز صاحب! مزاج اچھے ہیں؟"

"آپ کو میرے مزاج سے کیا۔ آپ کو کتابیں لینا ہیں۔ کتابیں لیجئے۔"

میں دل میں کٹ کر رہ گیا۔ مجھے اُن سے ایسے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی۔ میں نے جلدی جلدی دو ایک کتابیں منتخب کیں۔ اور رجسٹر پر دستخط کرکے وصول کرلیں۔ لیکن دن بھر اُنکے اِس رویّے پر حیرت و افسوس کرتا رہا۔

دوسرے دن اعجاز صاحب راستے میں ملے۔ اور از خود السّلام علیکم کہہ کر روک لیا۔ اپنے کل کے رویّے پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "دراصل فاروقی صاحب مجھ سے خفا ہیں۔ میں جانتا ہوں، کہ آپ کے فاروقی صاحب سے اچھے مراسم ہیں۔ اگر اُنہیں یہ معلوم ہوجاتا کہ آپ کے میرے ساتھ بھی اچھے تعلقات ہیں تو ممکن ہے یہ بات آپ کے اُنکے تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتی۔ اِس لئے مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ اُمید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔"

میں نے اس واقعہ کی تحقیق میں پڑنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن یہ اُلجھن اب بھی باقی ہے۔ کہ اعجاز صاحب جیسا کم گو۔ شریف النفس، محنتی اور طالب علموں جیسا اُستاد۔ فاروقی صاحب کے بارے میں یہ تاثر کیسے قائم کرسکتا ہے؟

ایم۔اے کرنے کے بعد فاروقی صاحب نے مجھے شعبے میں آنے کی دعوت دی تھی، اور میں نے سرکاری ملازمت کو ترجیح دی تھی۔ میں اپنے اِس فیصلے پر پشیمان بھی تھا۔ لیکن اِس واقعہ کے بعد میں نے شکر ادا کیا۔ اور اپنے فیصلے کو اِس اعتبار سے صحیح سمجھنے لگا۔ کہ شکوک و شبہات کی اس فضاء میں شاید میرا بھی یہی حال ہوتا۔ اور شعبے کی ملازمت میں آکر فاروقی صاحب کے ساتھ ایسے خوشگوار تعلقات سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

مشرقی روایات تو اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ اِس قسم کے واقعات کا تذکرہ کیا جائے۔ لیکن انسان بہرحال انسان ہے، فرشتہ نہیں۔ اور فرشتے سے بہتر ہے

انسان بننا۔ اور انسان کی ذات میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ دیکھنا تو صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس کے میزانِ عمل میں کونسا پلڑا بھاری ہے۔ خیر کا یا شر کا۔ اس اعتبار سے فاروقی صاحب کی ذات ایک شفاف چشمے کی حیثیت رکھتی تھی جس سے تشنگانِ علم و ادب بقدر ظرف اپنی اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ اور یہ چشمۂ فیض آخر تک رواں دواں رہا۔ اور اُن کی ذات سے ہر ایک کو خیر پہنچتا رہا۔

اپنی موت سے کچھ تھوڑا عرصہ پیشتر اُن سے بورڈ کے دفتر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ترکی سے واپس آچکے تھے۔ اور اب اُن کا نورانی چہرہ سفید ڈاڑھی سے بھی مزین ہو چکا تھا۔ جسم میں پہلی سی تازگی و توانائی نہ تھی۔ لیکن لب و لہجہ کی شگفتگی ماند نہیں پڑی تھی اُسی تپاک سے ملے۔ اور دفتر کے ایک کونے میں علیحدہ لیجا کر دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ وہ لاٹھی کے سہارے کھڑے تھے۔ اور میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں نے دورانِ گفتگو ایک دو بار کرسی پر تشریف رکھنے کو کہا۔ کیونکہ میں اُن کے جسم میں نقاہت محسوس کر رہا تھا لیکن وہ بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہی اپنائیت، وہی دلدہی و دلجوئی۔ وہی خاندان کے ایک بزرگ کی سی شفقت اور اُستادوں جیسی محبت و عنایت، "اب جس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں"۔

پشاور یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو اب بھی آباد ہے۔ لیکن اُس طرف قدم کم اُٹھتے ہیں۔

مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اُداس ہے

کیپٹن سید واصف علی واصف
ایم۔اے۔اے ای سی
(ریٹائرڈ)

پروفیسر طاہر فاروقی کے علمی و ادبی کارنامے

(جامعہ اُردو — فیضِ جاریہ)

پروفیسر طاہر فاروقی صاحب کے وہ تمام علمی و ادبی کارنامے قابل ذکر ہیں جن کی وجہ سے پاک و ہند کی دُنیائے علم و ادب میں ان کو ایک ممتاز مقام حاصل رہا۔

وہ اُردو فارسی، عربی اور انگریزی میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے پنجاب لکھنؤ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں سے فارسی، عربی اور اُردو کے مختلف امتحانات فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن سے پاس کئے اور پھر بی۔ اے انگریزی میں کرکے ایم۔اے فارسی اور ایم۔اے اُردو کی ڈگریاں آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کیں اور ان امتحانوں میں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ رہے۔ بلکہ ۱۹۳۵ء سے آجتک آگرہ یونیورسٹی میں ان کا ریکارڈ قائم ہے۔

طاہر صاحب اس سے پہلے مدرسۂ عالیہ آگرہ سے دینی علوم میں درسِ نظامیہ کی تکمیل کرچکے تھے، جس سے قرآن و حدیث و فقہ کے متعلق ان کو ایک عالمِ دین کا مرتبہ حاصل ہوگیا تھا۔

فاروقی صاحب ایک طویل عرصہ تک (تقریباً ۴۵ سال) مختلف کالجوں یونیورسٹیوں میں لکچرار، ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ خصوصاً حلیم مسلم کالج کانپور، آگرہ کالج آگرہ، پنجاب یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی، ڈھاکہ یونیورسٹی اور انقرہ یونیورسٹی (ترکی) میں مامور رہے، اور اپنی بہترین کارکردگی، ہر دلعزیزی اور اعلیٰ اقدار کی وجہ سے بڑے کامیاب اور نیک نام رہے۔

اساتذہ کرام اکثر ممتحن رہا کرتے ہیں لیکن طاہر صاحب اس شان سے ممتحن رہے کہ کبھی خود درخواست نہ دی، بلکہ ان کی خدمت میں اربابِ اختیار کی جانب سے ممتحنی پیش

کی جاتی تھی اور امتحانات بھی ان کو نہ صرف میٹرک سے لیکر ایم۔ اے تک کے ملتے تھے، بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی اور پبلک سروس کمیشن کے بھی وہ ممتحن رہتے تھے۔

علمی و ادبی خدمت و شہرت کی وجہ سے فاروقی صاحب کو ملک کی اعلیٰ ادبی انجمنوں کا رکن بھی بنایا گیا تھا۔ خاصکر وہ "ترقیِ اُردو بورڈ" کے عرصہ تک رکن و ممبر رہے۔ اور علامہ نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی اور ممتاز حسن جیسے شہرۂ آفاق ادیبوں کیساتھ اُردو لغت کی تیاری میں کام کیا اور اُس کی ترتیب و تالیف میں اُن کا معقول و معتدبہ حصہ ہے۔

تصنیف و تالیف طاہر صاحب کا ہمیشہ سے بڑا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک بڑی تعداد تو اسکولوں، کالجوں کے نصابِ اُردو فارسی سے متعلق ہے۔ مگر ان کی مخصوص غیر درسی کتاب جس پر ان کی شہرت پورے برّصغیر میں قائم ہوئی "سیرتِ اقبال" ہے جو اقبالیات کے فن میں سب سے پہلی کتاب ہے اور جو ۱۹۳۹ میں قومی کتب خانہ لاہور سے شائع ہوئی۔ جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی دوسری معرکۃالآرا کتابیں چند اور ہیں۔ "سیرت محمد علی جوہر" ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ "سرکارِ دو عالم" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے بھی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی دو کتابیں "سیرتِ امیرِ ملت" جو اُن کے پیر و مُرشد کی سوانح عمری ہے۔ اور آٹھ سَو صفحات کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اور "اقبال اور محبت رسول" جو اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر حکومتِ پاکستان کے ایماء پر شائع ہوئی۔ بڑی وقیع تصانیف ہیں۔

رسالہ "خیابان" شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی کے دو مخصوص شمارے "پاکستان میں اردو" اور اقبال کے موضوع پر طاہر فاروقی صاحب نے اپنے ساتھی پروفیسر خاطر غزنوی صاحب کے اشتراک سے بڑی آب و تاب سے شائع کئے اور علمی و ادبی حلقوں میں بڑے مقبول ہوئے۔

علاوہ بریں ملک کے وقیع رسالوں میں موصوف کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اور اقبالیات پر جس کے وہ ماہر سمجھے جاتے تھے ان کے توسیعی لکچر مختلف یونیورسٹیوں میں کرائے گئے جو بڑے کامیاب رہے۔

طاہر صاحب کو شعر و سخن سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ خود بھی بہت اچھے شاعر تھے اور اُردو فارسی دونوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ انہوں نے کافی تعداد میں اُردو غزلیں اور نظمیں

کہیں جنکو بڑے سلیقہ سے انہوں نے یکجا کر لیا تھا، ممکن ہے ان کی طباعت کی کبھی نوبت آ جائے۔
ہر ادارہ میں جہاں وہ رہے، اعلیٰ پیمانے کے مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ اپنے طلبہ میں عمدہ ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ ادبی انجمنیں بھی انہوں نے قائم کیں جن سے اُردو زبان و ادب کو بڑا فروغ ہوتا تھا۔
ریڈیو اور ٹیلیویژن پر ان کی علمی و ادبی تقاریر اور پروگراموں کا ریکارڈ متعدد اسٹیشنوں میں محفوظ ہے۔ دہلی، لاہور، پشاور، ڈھاکہ، حیدرآباد کے اسٹیشنوں میں ان کی بڑی وقیع تقاریر ہوتی رہیں۔ پشاور ریڈیو پر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ان کا ایک مستقل ہفتہ واری پروگرام "اُردو سیکھیئے" کے موضوع پر ہوتا تھا جس کی صوبہ سرحد میں اُردو کی ترویج، تدریس اور ترقی میں بڑی اہمیت ہے۔

جامعۂ اُردو

طاہر فاروقی صاحب کا سب سے بڑا اور یادگار کارنامہ "جامعہ اردو آگرہ" ہے جس ادارہ کی بنیاد انہوں نے ۱۹۳۹ء میں رکھی۔ علامہ اقبال کی یادگار قائم کرنے کے لئے موصوف نے ۱۹۳۸ء میں "بزم اقبال" قائم کی جس کی غرض و غایت اور اسکے مقاصد اُردو زبان و ادب کی خدمت اور علامہ اقبال کے کلام کی ترویج و اشاعت تھے اس بزم کے انعقاد اور اس کے لائحہ عمل کے لئے آگرہ کے مشہور ادیب و شاعر علامہ سیماب اکبرآبادی اور علامہ میکش اکبرآبادی اور دیگر سربرآوردہ ہستیوں نے بڑی معاونت کی۔

طاہر صاحب عرصہ سے کوشاں تھے کہ پنجاب یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے السنۂ مشرقی کے طرز پر تدریجی امتحانات الہ آباد یونیورسٹی میں بھی اُردو زبان کے کم از کم تین قائم کر دیئے جائیں لیکن بعض احباب کی معاندانہ کارروائیوں کی وجہ سے یو پی کے محکمۂ تعلیمات نے اس تجویز کو منظور نہ کیا اور اپنا ایک ہی امتحان جاری رکھا۔ طاہر اپنی دُھن کے پکّے تھے۔ اور اُردو کی خدمت و ترقی کے لئے وہ کسی مخالفت و رکاوٹ کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی ایک نئی اسکیم بنائی اور بزم اقبال کا ایک ذیلی مگر اہم ادارہ ایک مخصوص آئین کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں "جامعہ اردو" کے نام سے قائم کیا۔ جس میں انہوں نے اُردو کے تین تدریجی امتحانات "ادیب"، "ادیب ماہر" اور ادیب کامل رکھے اور ہر فرد کے لئے (خواہ کسی تعلیمی ادارہ کا طالب علم ہو یا پرائیویٹ امیدوار) مقرر کر دیئے۔
ادیب کا معیار الیف۔اے، ادیب ماہر کا بی۔اے اور ادیب کامل کا ایم اے کے برابر رکھا۔ اور مناسب نصاب و سلیبس تیار کر دیئے۔ اس اسکیم کی تنظیم کے لئے بزم اقبال کے اراکین نے خود طاہر صاحب کو رجسٹرار مقرر کیا کیونکہ وہ ہی مؤسس تھے۔ اور ان ہی کے ذہن میں امتحانات

کی اسکیم کا پورا خاکہ تھا۔

جامعہ اردو کی سرپرستی کو اُس وقت کے عظیم اُردو دوست شخصیتوں نے بخوشی قبول کرلیا۔ یہ حضرات سر تیج بہادر سپرو۔ ڈاکٹر عبدالحق (بابائے اردو) اور پنڈت راجنا تھ کنزرو تھے۔ علاوہ بریں معاونین میں ڈاکٹر ذاکر حسین، سر محمد یعقوب، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر ظہیرالدین علوی صاحبان قابلِ ذکر ہیں۔

طاہر صاحب نے نو دس سال تک اعزازی رجسٹرار کی حیثیت سے اِس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی جدّ وجہد کی۔ ہندوستان کے مختلف مقامات پر اپنے امتحانوں کے مراکز قائم کرائے جنکے لئے بااعتماد اشخاص سپرنٹنڈنٹ اور مراکز انسپکٹر اسکول و کالج کے اساتذہ میں سے مقرر کئے۔ ممتحن بنانے کے لئے اسکولوں کالجوں، یونیورسٹیوں کے نامور تجربہ کار ٹیچر اور پروفیسر منتخب کئے۔ ان سب لوگوں نے اعزازی طور پر کام کرنا قبول فرمایا۔ یہ اسکیم بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ اور سینکڑوں طلبہ کو استفادہ کا موقع ملا اور اُردو کی ترویج واشاعت کیلئے جامعہ اُردو نے بڑا کام کیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک طاہر صاحب نے تنِ تنہا امتحانات کے تمام تنظیمی کاموں کو خود سرانجام کیا۔ ان کی محنت و کاوش کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بیک وقت بیک نشست انھوں نے دو دو سَو خطوط امتحانات کے متعلق لکھے ہیں۔

جب ۱۹۴۸ء میں طاہر صاحب پاکستان آنے لگے تو انہوں نے جامعہ اُردو کے ادارہ کو علی گڑھ منتقل کردیا اور اپنے بااعتماد اور لائق دوست پروفیسر ظہیرالدین علوی کو اس کا رجسٹرار مقرر کرادیا۔ علوی صاحب نے بھی بڑی تن دہی اور خیر خوبی سے کام کیا۔ ان کی نگرانی میں اس ادارہ نے خوب ترقی کی۔ مراکز کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ امیدواروں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی اور چند سال کے اندر ہی جامعہ اردو کی اپنی عمارت علی گڑھ میں تیار ہوگئی۔ اور اپنا باقاعدہ عملہ بھی مقرر ہوگیا۔ ممتحن صاحبان کو معقول معاوضہ بھی دیا جانے لگا۔ علوی صاحب کے بعد جناب احمد علی شاہ صاحب (ریٹائرڈ جج جے پور) رجسٹرار مقرر ہوئے جنہوں نے بھی ادارہ کی ترقی کو برقرار رکھا۔ اور آج جامعہ اُردو صحیح معنوں میں اُردو یونیورسٹی ہے۔ جامعہ کے امتحانات کے لیے امیدواروں کی تیاری کیلئے علی گڑھ میں کلاسیں بھی کھول دی گئی ہیں۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں، تعلیمی بورڈوں اور محکمہ جات تعلیم نے جامعہ اُردو (علی گڑھ) کے امتحانات کو باقاعدہ تسلیم کرلیا ہے۔ بقول پروفیسر سرور اکبرآبادی کے " فاروقی

صاحب کے چشمۂ علم سے لاکھوں تشنگانِ علم سیراب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں" دراصل جامعہ اُردو کی اسکیم طاہر صاحب کا فیضِ جاریہ ہے۔ اسکی کامیابی کا ایک عمدہ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندوستان خاصکر یو پی میں اردو جاننے والوں، اردو کے حامیوں اور اُردو کے طلبہ کی تعداد بڑھ جانیسے وہاں کی حکومت کی ایک گشتی چٹھی جاری ہوئی ہے کہ اگر کسی اسکول میں چار یا زیادہ طلبہ اُردو پڑھنا چاہیں تو ان کے لئے ایک اُردو پڑھانے والا استاد لازمی طور پر رکھا جائے۔ اس سے پہلے اُردو تقریباً تمام تعلیمی اداروں میں مفقود ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ طاہر فاروقی صاحب کی سوچی سمجھی اسکیم اور پیش بینی کا نتیجہ ہے۔ یہی انکی شہرتِ دوام کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ جب تک اُردو زبان زندہ رہے گی۔ طاہر صاحب کی یاد بھی زندہ رہے گی۔

طاہر صاحب کے اس نادر عظیم یادگار کارنامے اور ان کی اردو کی خدمت کے صلہ میں خود جامعہ اُردو نے ان کو اپنا تحفہ پیش کیا اور ۱۹۵۳ کے کنووکیشن میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (صدر انڈین یونین) کی صدارت میں طاہر صاحب کو "دکتورادب" یعنی ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی گئی۔

جامعہ اُردو زندہ باد ۔ طاہر فاروقی زندہ باد

قطعات بیاد طاہر

(۱)

وہ پُر نور چہرہ وہ تنویرِ طاہر — نگاہوں میں ہر دم ہے تصویرِ طاہر
وہ سب کے محب اور ہمدرد سب کے — سبھی کے دلوں میں ہے توقیرِ طاہر

(۲)

خلوص و دیانت تھا کردار طاہر — رفاقت کا اعلیٰ تھا معیارِ طاہر
سدا دوسروں کی بھلائی کے خواہاں — مثالی نمونہ تھا ایثارِ طاہر

(۳)

محبت کی دُنیا کا سردار طاہر — سب اپنوں کا غیروں کا غمخوار طاہر
بھلائی کا سب کی طلب گار طاہر — تھا انسانیت کا پرستار طاہر

(۴)

بہت پختہ ایمان و ایقانِ طاہر — خودی، خود شناسی رہی شانِ طاہر
سبق کامیابی کے ہم کو سکھائے — رہے گا سدا ہم پہ احسانِ طاہر

(۵)

شگفتہ مزاجی میں مشہور طاہر — خوشی، خوش دلی سے تھے معمور طاہر
تھے رنج و محن سے بہت دور طاہر — نہ تکلیف میں بھی تھے رنجور طاہر

(۶)

علم اور فضل میں تھے اکمل و کامل طاہر — خُلق و اخلاص میں تھے جوہرِ قابل طاہر
ہمت و حوصلہ بے مثل تھا ان کا وصف — کسی مشکل کو سمجھتے نہ تھے مشکل طاہر

(۷)

زندگانی کی حقیقت کے تھے محرم طاہر — کامیابی کے لئے عزم مصمّم طاہر
خدمت خلق کا تھا جذبہ ہمیشہ انہیں — سب کی امداد کو تیار رہتے ہر دم طاہر

(۸)

بہرِ احباب تو تھے باعثِ عزت طاہر — اور اعزّا کے لئے موجبِ شفقت طاہر
عمر بھر دیتے رہے درس محبت طاہر
کیوں نہ ہو جائیں بھلا درخورِ رحمت طاہر

پروفیسر محمد عبدالعلیم صدیقی
اسلامیہ کالج پشاور

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی مرحوم

(چند یادیں چند تاثرات)

فاروقی صاحب ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ چاہے وہ کسی محفل میں ہوں یا شعبۂ اُردو میں ہر جگہ احباب کا ایک جمگھٹا ہوتا۔ اور فاروقی صاحب اپنی دلچسپ بات چیت، ادبی تذکرے اور ادبی لطائف سے محفل کو گرماتے رہتے تھے۔ ان مجلسوں میں انکے دوست احباب طلباء اور دیگر رفقائے کار شریک ہوتے اور ہر شخص اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے محظوظ ہوتا۔ کبھی اسلامیہ کالج کے پرانے تذکرے نہایت دلنشین انداز میں کرتے، تو کبھی آگرہ کی پرانی یادیں تازہ فرماتے۔ اور کسی وقت بھی انکی مجلس میں بوریت کا احساس نہ ہوتا۔

مشاعروں کی صدارت کے فرائض انجام دینا ایک خاصا مشکل فن ہے جو ہر کوئی صحیح طور پر نباہ نہیں سکتا، لیکن فاروقی صاحب کو اسمیں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ خود بھی شاعر تھے، آدابِ نشست و برخاست سے کماحقہ واقف، شعراء کرام کے مزاج سے آشنا، بر وقت داد اور بے جا تعارفی جملوں سے بے نیاز ہوکر کچھ اس انداز سے صدارت فرماتے کہ شاعر بھی خوش اور محفل بھی پُرسکون۔ کوئی چوبیس برس پیشتر کی بات ہے کہ اسلامیہ کالج پشاور کی بزم ادب کے زیر اہتمام ایک کُل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں پاکستان کے جملہ صوبوں سے ممتاز شعراء نے شرکت کی تھی۔ جس محفل میں طلباء موجود ہوں ذرا بھی کسی شاعر کی جانب سے بے راہ روی ہوجائے تو طلبہ نہ تو کسی شاعر کا خیال کرتے ہیں۔ اور نہ ہی محفل کی سنجیدگی پیش نظر رکھتے ہیں۔

اس محفل میں اختر اکبر آبادی، باقی صدیقی، مصطفیٰ زیدی، اجمل خٹک، احمد فراز اور کئی دوسرے شعراء نے شرکت کی۔ محفل میں اچانک بدنظمی پیدا ہوئی۔ شعراء نے

واک آؤٹ کیا۔ اور ایک سنجیدہ محفل افراتفری کا شکار ہوگئی۔ فاروقی صاحب نے طلبہ کی طبیعت کو بھانپا۔ ایک مختصر سی تقریر کی اور اسلامیہ کالج کے طلباء کو سرحد کی پرانی روایات سے آگاہ کیا۔ اور خاص طور پر میزبان کی حیثیت سے طلباء کو اپنی مہمان نوازی کا درس دیا۔ اسطرح سے وہ محفل جو شاید فوراً برخاست ہو جاتی، فاروقی صاحب کی حاضر دماغی اور بروقت نفسیاتی اندازِ تخاطب سے دوبارہ شروع ہوئی۔ شعرائے کرام ہال میں دوبارہ واپس لوٹ آئے اور طلباء نے بقیہ وقت ہر شاعر کو نہایت سکون سے سُنا۔

علامہ اقبال اور اقبالیات سے فاروقی صاحب کو عشق تھا۔ فاروقی صاحب کو علامہ اقبال کے سب سے پہلے ناقد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ گزشتہ چالیس برس سے علامہ پر ہزاروں مضامین اور سینکڑوں کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں لیکن فاروقی صاحب نے "سیرتِ اقبال" نامی کتاب لکھ کر آنے والوں کو اقبال پر لکھنے اور اسکی تعلیمات کو سمجھنے کا راستہ دکھایا۔ ۱۹۷۵ء میں شعبۂ اردو جامعہ پشاور کے زیرِ اہتمام یومِ اقبال نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا تھا۔ کراچی اور لاہور سے بڑے بڑے اسکالروں نے شرکت کی تھی جن میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین خان مرحوم، پروفیسر حمید احمد خان مرحوم اور ڈاکٹر وحید قریشی قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات نے اقبال پر عالمانہ تقریریں کیں اور پرمغز مقالے پڑھے لیکن مجھے آج تک حمید احمد خان مرحوم کا وہ جملہ یاد ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فاروقی صاحب اقبال کے پہلے ناقد ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب اُسوقت لکھی جب کسی کے ذہن میں اقبالیات پر لکھنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ علامہ اقبال کے ایک سکالر کی زبانی اس سے زیادہ فاروقی صاحب کی صلاحیت کا اعتراف کیا ہو سکتا ہے۔

فاروقی صاحب کو مولانا رومیؔ اور حافظؔ سے والہانہ عشق تھا۔ محفلِ سماع میں شرکت سے انہیں خاصی دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر مظہر علی خاں مرحوم سابق صدر شعبۂ انگریزی پشاور یونیورسٹی کے ہاں ہر سال مولانا رومی کی یاد میں محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی۔ ڈاکٹر مظہر مرحوم اہلِ ذوق و معتقدینِ رومی کو مدعو کرتے تھے۔ اور خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ یہاں میں نے فاروقی صاحب کے شوق کو دیکھا ہے۔ مولانا رومیؔ، حافظؔ، اور خسروؔ کے اشعار پر بے قابو ہو جاتے تھے اور کئی بار آبدیدہ بھی ہو جاتے تھے۔ ساری رات یہ محفل جاری رہتی اور فاروقی صاحب ہمہ تن گوش رہتے اور مولانا رومی سے عقیدت کا اظہار کرتے تھے

فاروقی صاحب ایک دردمند دل رکھتے تھے وہ ہمیشہ اپنے طالب علموں کی تعلیمی اور

مالی حالت پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اور خاص طور پر خانگی طالب علموں کی انہیں بہت فکر رہتی تھی، اور دامے درمے، سخنے مدد فرماتے تھے۔ انہیں ریڈیو سے پروگرام دلواتے اور تعلیم کے مکمل ہونے کے بعد ملازمت دلوانے کی بھی کوشش کرتے۔ میری دانست میں شعبۂ اُردو کے کئی ایسے طلبا ہیں جنکے مستقبل کے سنوارنے میں فاروقی صاحب کی کوششوں کا ایک بڑا حصہ ہے۔

فاروقی صاحب کے ہاں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے کچھ معیار مقرر تھے۔ انہیں منافقت سے نفرت تھی، اور جہاں کہیں بھی انہیں اِس بُرائی کا احساس ہوتا تمام رسمی آداب کو بالائے طاق رکھکر سختی سے مخالفت کرتے۔ جس سے بھی دوستی کی، آخری وقت تک نباہنے کی کوشش کی اور جب مخالفت پر اتر آئے تو کھل کر برملا اظہار فرمایا لیکن کینہ پروری اور منافقت سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ گذشتہ چند سال سے بلڈ پریشر کے مریض تھے اور بعض اوقات جذبات سے بے قابو ہوجاتے تھے، اور کڑی تنقید سے گریز نہیں فرماتے تھے۔ لیکن یہ ردِ عمل وقتی ہوتا تھا۔ اور بعد میں حسبِ معمول اپنی محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے۔

فاروقی صاحب ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ انکی تحریروں میں سلاست کا رجحان زیادہ ملتا ہے۔ زبان سادہ اور بامحاورہ اور پیچیدگیوں سے مبرا تھی۔ مسائلِ ادب کو سمجھنے اور سمجھانے میں ایک خاص صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے معیاری رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ جن سے انکی علمی، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انکی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے پیشِ نظر جامعہ اُردو علی گڑھ نے انکی خدمات کا اعتراف کیا۔ اور دکتورِ ادب کے اعزاز سے نوازا۔

فاروقی صاحب آج ہم میں نہیں لیکن ان کی بے شمار تحریریں جو مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہیں۔ انہیں یکجا کیاجانا چاہئے اور میرے خیال میں انکو خراج عقیدت پیش کرنے کی یہی سب سے بڑی ٹھوس اور جامع صورت ہوسکتی ہے۔

مولانا فضل معبود
مرکزی اردو بورڈ۔ پشاور

شفیق و مہربان اُستاد

آج سے نصف صدی قبل سکولوں میں جو تعلیم دی جاتی تھی۔ اس میں فارسی زبان کی نوشت و خواند کا حصہ لازمی ہوتا تھا نصاب کے طور پر گلستانِ سعدی اور اس قسم کی دوسری مقبول و معروف کتابوں کے اسباق پڑھائے جاتے تھے۔ ان اسباق میں تعلیم و تربیت اور اُستاد و شاگرد کی اہمیت ضرور ہوتی تھی۔ اسی زمانہ کے طالب علم سعدیؒ کے ان الفاظ کے معنی کو کہ "جورِ اُستاد بہ زمہرِ پدر" خوب سمجھتے تھے۔ وہ تعلیم میں استاد کی شخصیت اور اس کی شفقت و محنت دونوں کا خود مشاہدہ کرتے۔ اسلئے تا زایست استاد کے قدر دان ہوتے۔

لیکن تعلیم جدید کے ساتھ اُستاد کی قدر دانی معاشرہ میں کم ہوئی۔ علامہ اقبال نے بانگِ درا کے مزاحیہ کلام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کہ اب طالبعلم

ع کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

اسی دور کے شاعر نے جو خود اُستاد تھا۔ اپنی ایک نظم میں اُستاد کے مقام کا تقابل کیا ہے۔

؎ نہاں ہے فطرتِ انساں میں جوہر عالی — ہنر سے اپنے ہے کرتا اُسے عیاں اُستاد
دلوں سے ہوتی تھی تعلیم فیض دل کی کبھی — زباں ہی آج تو شاگرد ہے زباں اُستاد
(گنج معانی)

منشی تلوک چند محروم نے اُستاد کے موضوع پر یہ نظم جس کے دو شعر اوپر درج ہیں، بیسویں صدی کے ربع اول میں، جب وہ میاں والی ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے لکھی ہوگی۔ ان کا مجموعہ کلام گنج معانی کے نام سے ۱۹۳۷ء میں زیر مطالعہ رہا۔ بیسویں صدی کے ربع ثالث میں پشاور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ یہ یونیورسٹی اُس مقام پر قائم ہوئی۔ جہاں سر سیدِ سرحد صاحبزادہ عبدالقیوم نے ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

صاحبزادہ عبدالقیوم نے اسلامیہ کالج کے لئے بہترین صلاحیتوں کے اساتذہ کا انتخاب کیا

تھا جن کی علمی، ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں نے جلد ہی اسلامیہ کالج پشاور کا سرِ افتخار بلند کیا تھا۔
خوش قسمتی سے پشاور، یونیورسٹی کے مختلف شعبوں خصوصاً شعبۂ اُردو کو بھی ایسے ہی اساتذہ ملے۔
جو منشی تلوک چند محروم کے ممدوح اساتذہ کے مثیل و جانشین ثابت ہوئے۔ اور جنہوں نے اپنے
خلوص محنت اور شفقت سے "دلوں سے فیض دل" کی تعلیم کی اس کہاوت کی صداقت کو ثابت کیا۔

میں نے ۱۹۶۰ء - ۱۹۶۲ء کے دوران تعلیم میں استاذی مرحوم طاہر فاروقی کو اس قسم
کا اُستاد پایا۔ جو شاگردوں کو اولاد کی طرح سمجھتے ہوں۔ اور جو خلوص دل سے اپنا علم دوسروں
کو منتقل کرنے کے خواہشمند ہوں۔ جو سادگی اور بے تکلفی میں سلف کا نمونہ اور محبت و شفقت کا پیکر
تھے۔ یونیورسٹی کو قائم ہوئے چند سال گزرے تھے۔ طلباء کی تعداد کم تھی، اور سہولتوں کا فقدان
تھا۔ فاروقی صاحب کے خلوص و شفقت نے شعبۂ اُردو کو طلباء کی کمی کا شکار نہ ہونے دیا۔ وہ جب
بیمار ہوتے تو طلباء کو گھر پر بلا کر تعلیم دیتے۔ کتابیں نہ ہوتیں تو خود مہیا کرتے۔ طلباء میں ملازمت پیشہ
افراد ہوتے تو اُن کے ساتھ نہایت نرمی کا سلوک کرتے، اور ان کو گھر پر مطالعہ جاری رکھنے کا
مشورہ دیتے۔ نصاب کی کتابیں اُن دنوں نایاب تھیں، سودا، ذوق اور کاکوروی کے قصائد
انہوں نے املا کرا کر طلباء کو دئیے۔ کراچی اور لاہور کے کتبخانوں میں تلاش کرکے کتابوں کا انتظام کرتے۔
۱۹۶۰ء میں شعبے کی سیمینار لائبریری میں اتنی کتابیں تھیں کہ ایک الماری بھی ان سے بھر نہ سکتی تھی
وائس چانسلر صاحب اور شعبہ کے پہلے چیرمین مولانا عبدالقادر مرحوم سے مختلف مدات کیلئے رقومات
منظور کراتے اور اہم ضروریات پوری کرتے۔ شعبہ کے دوسرے اساتذہ ان کے شاگرد تھے،
جو ان کے نئے شاگردوں کو تعلیم دیتے۔ سالہا سال تک ان کے فیض تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔
تاآنکہ وہ ریٹائر ہوکر ترکی تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے تین سال تک اردو تدریس کے
شعبے کو منظم کیا۔ واپسی میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوکر خانہ نشین ہوئے۔ تا زیست شعبۂ
اُردو اور اپنے شاگردوں سے خوشگوار تعلقات رکھے۔ تقریبات کے مواقع پر ان سے ملاقات
ہوتی۔ تو اپنی باغ و بہار شخصیت سے دلوں کو مسرور کرتے۔ اپنے شاگردوں کے پاس بے تکلفی
سے بازدید کے لئے تشریف لے جاتے۔ اور ان کی عزت افزائی اس قدر کرتے کہ وہ شرمندگی
محسوس کرتے۔

جناب فاروقی صاحب سے راقم الحروف کی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ جب میں نے
اُردو ایم اے میں داخلہ لیا، لیکن ان کی کتاب "سیرتِ اقبال" میں پاکستان سے پہلے پڑھ

چکا تھا۔ مرحوم سے ان کے نئے مکان میں جب آخری ملاقات ہوئی۔ جہاں میں ان کو نئے مکان کی تعمیر پر مبارکباد دینے حاضر ہوا تھا۔ وہ گھر میں تنہا تھے۔ اہل خانہ قریب کے مکان میں ان کے داماد قاسم امام صاحب ایڈوکیٹ کے ہاں گئے تھے۔ استاد محترم نے سارا مکان ایک ایک کمرے میں لیجاکر دکھایا۔ اور اس کے تعمیری حسن اور سہولتوں سے متعارف کرایا۔ لائبریری میں پہنچے تو میں نے درخواست کی کہ مجھے کتابوں کے پرانے ایڈیشن اور اخبارات و رسائل کے اولین نمبر دیکھنے اور جمع کرنے کا شوق ہے۔ کیا آپ اپنی تصنیف "سیرت اقبال" کے پرانے ایڈیشن مجھے بتا سکینگے؟ مرحوم بے حد خوش ہوئے۔ الماری کھول کر مجھے سیرتِ اقبال کا پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا ایڈیشن دکھایا۔ یہ بھی واضح کیا۔ کہ فہرست مضامین اور ابواب میں اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن مواد میں ہر ایڈیشن میں دُگنے سے زیادہ اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی تالیف کے نئے ایڈیشن میں نظرثانی اور اضافہ کرکے اُسے مزید بہتر بنانے کے اصول کے پابند تھے۔ اپنی دوسری تصانیف سے بھی متعارف کردیا۔ ساتھ ہی پرلطف ماضی کے حالات بھی بتاتے گئے۔ افسوس میں مختصر وقت کے ارادے سے گیا تھا۔ اور زیادہ وقت گزارنے کا خیال نہیں تھا۔ اسلئے یادداشت لکھ نہ سکا۔ گھر میں اکیلے ہونے کے باوجود میرے لئے پرتکلف چائے منگوائی۔ میں نے شرمندہ ہوکر کہا۔ آپ نے شعبۂ اُردو کی تدریس کے ایام میں مجھ ناچیز کو اپنی چائے میں شریک کرنے کی سنت کی پابندی کی ہے۔ لیکن خود مجھے خدمت کرنے کا موقع نہیں دیا۔

مرکزی اُردو بورڈ شاخ پشاور کی لائبریری میں جہاں راقم گزشتہ پندرہ سال سے کام کرتا ہے کبھی کبھار کتابوں کی تلاش میں تشریف لاتے۔ اور گھنٹوں اپنی پرلطف باتوں سے مسرور کرتے۔ یونیورسٹی بک ایجنسی جب تشریف لاتے۔ تو وہاں سے ٹیلیفون پر خیریت دریافت فرماتے۔ اور جب میں خواہش ظاہر کرتا کہ میں حاضر ہورہا ہوں۔ تو بے تکلفی سے کہہ دیتے۔ کہ تم دفتر سے نہ آؤ۔ میں کام ختم کرکے لائبریری آجاؤنگا۔ یہ انکا ایسا احسان تھا۔ جس کے بارے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہوسکیں گے۔

وفات سے چند ماہ قبل استاذی محترم مرکزی اُردو بورڈ تشریف لائے۔ ایک بڑی ضخیم دیدہ زیب مجلد کتاب ان کے ہاتھ میں تھی۔ ہنس کر فرمایا۔ یہ تمہارے مطالعے کیلئے لایا ہوں۔ اس کتاب کی نظرثانی میں نے کی ہے۔ میں نے شوق سے حضرت محدثؒ

علی پوری رحمۃ اللہ کی سوانح عمری ان سے لے لی، شوق سے پڑھی اور جب ان کو واپس کی، تو دیر تک حضرت کے مناقب بیان کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں طالب علمی سے حضرت علی پوری کو جانتا ہوں، جب وہ امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جگہ مسجد شہید گنج کی تحریک استخلاص مسجد میں امیر ملت بنائے گئے تھے۔ پھر کوہاٹ میں ۱۳۴۳ء میں مسجد حاجی بہادر میں نماز جمعہ کے موقع پر ان کی تقریر سنی تھی، لیکن ایک شعر کی وجہ سے خلجان رہتا ہے۔ جو لاہور میں ان کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ اور اس پر حضرت نے گرفت نہیں کی، حالانکہ وہ حافظِ قرآن تھے۔ محدث تھے۔ اور متبحر عالم دین تھے۔ دوسرے لوگوں کی آمد سے، یہ مسئلہ لاینحل ہی رہا۔ اور پھر دوسری محفل میں ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اُستادی ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری کے والد محترم سید ضیاء جعفری مرحوم سے فاروقی صاحب کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ برادرم جوہر براچہ کے توسط سے محترم فاروقی صاحب کی معیّت میں ان یگانۂ روزگار اہلِ دل حضرات کی محفلوں میں بھی بیٹھنے کا موقع ملا۔ اور ان کی علمی وادبی گفتگو سے جس میں تصوف اور روحانیت کی چاشنی ہوتی تھی، استفادہ کیا۔

ایک یادگار مجلس میں جس میں مولوی ریاض الدین صاحب مرحوم، مولوی الطاف علی بریلوی اور کراچی کے دوسرے اہلِ علم وادب شامل تھے، شریک ہونے کیلئے اُستادی محترم نے اپنے دوسرے شاگردوں کے ساتھ مجھے بھی دعوت دی تھی۔ پشاور صدر کے مکان میں یہ پُرلطف علمی مجلس چند گھنٹے تک رہی۔ اور ان قدآور معمارانِ قوم وادب کے ارشادات عالیہ سے ہم نے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس مجلس میں سید الطاف علی بریلوی نے مجھ سے موضع شامت پور ضلع مردان کے محل وقوع کے متعلق استفسار کیا۔ جہاں حافظ رحمت خان نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے سید صاحب کو بتایا کہ میں اُسی گاؤں کا رہنے والا ہوں اور وہاں کے متعلق آپ کو مزید معلومات فراہم کرادونگا۔ جس سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑجائیگی افسوس یہ وعدہ آجتک ایفا نہ ہوسکا۔

اُستادی محترم جناب محمد طاہر فاروقی کے شاگردوں اور دوستوں کا حلقہ بیحد وسیع تھا۔ اُنہوں نے آگرہ، ڈھاکہ اور پشاور میں سالہا سال تک اُردو فارسی کی

تدریس کی۔ وہ بیحد خوش اخلاق محنتی اور شفیق اُستاد تھے۔ شاگردوں کے ساتھ بے تکلف دوستوں اور بچوں کا سا سلوک کرتے۔ ان کی اس قدر عزت افزائی کرتے کہ وہ شرمندہ ہوتے۔ خاکسار راقم کے ساتھ ان کی بے پایاں محبت نے مجھے بے حد زیر بار کیا ہے۔ شعبہ میں کلاس لیتے وقت میرا استفسار فرماتے۔ کہ میں طویل مسافت سائیکل پر طے کرکے یونیورسٹی پہنچتا تھا۔ پھر عمر زیادہ ہونے کے باوجود علم کا شوقین ہونے کی بنا پر میری بیحد حوصلہ افزائی کرتے۔ مہمانوں سے میرا تعارف کراتے کہ انکی زبان پشتو ہے لیکن یہ اُردو سے مادری زبان کی طرح محبت رکھتے ہیں۔ اور موقعے تو کجا زبانی امتحان کے موقع پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کو بھی یہی کہا جب وہ ممتحن کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے پشاور یونیورسٹی آئے تھے۔ انہوں نے مجھے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد جو سرٹیفیکیٹ دیا ہے، وہ ان کے حسنِ اظہار، حسن نیت اور عزت افزائی کی نادر مثال اور آج کے اُستاد کے لئے کل کے ایک شفیق استاد کی شاگرد نوازی کا نمونہ ہے۔

اُستادی محترم محمد طاہر فاروقی نے اپنی علمی، ادبی اور تصنیفی خدمت سے اُردو زبان کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ لیکن جس طرح ان کے گرامی قدر والد پروفیسر محسن فاروقی نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء کی مشفقانہ تربیت کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے صوبہ سرحد کے پشتو بولنے والے طلباء کے دلوں میں اُردو زبان کیلئے وہ محبت پیدا کی جوان کو اپنی مادری زبان سے تھی۔ اس لئے کہ اُردو زبان صرف ایک زبان نہیں ہے۔ یہ اسلامی علوم وادبیات کی جامع اور بیش بہا دینی لٹریچر کی حامل اور وحدتِ ملی کا نشان ہے۔

خوشی محمد ناظر مرحوم نے کسی اور موقع کے لئے کہا تھا لیکن ان کا یہ شعر آج کے حالات پر جبکہ علاقائی عصبیتوں نے ملت کی وحدت پر یورش کر دی ہے، صادق آتا ہے ؎

نہ مجھ کو ہرگز اے رہرو مٹانا!
کہ میں وحدت کی منزل کا نشاں ہوں

اللہ تعالیٰ مرحوم کے علمی اور مجلسی آثار کو دائم وقائم رکھکر ان کو جزائے خیر دے۔ آمین

پروفیسر ظہور احمد اعوان

یادِ رفتگان

ڈاکٹر پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم

فاروقی صاحب بھی کوچ کر گئے۔ اس شہر میں ان کا جی نہ لگا۔ اس شہر سے اٹھ گئے، اٹھنا تو سب کا مقدر ہے۔ آگے بھی اٹھنا پیچھے بھی اٹھنا۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ سب نے خاک کا پیوند ہونا ہے۔ سب نے اسی راہ پہ جانا ہے۔ فاروقی صاحب بھی چلے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مگر فاروقی صاحب کو مرحوم کہنے سے خوف آتا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ دل نہیں مانتا۔ کانوں کو اعتبار نہیں آتا۔ ایک معصوم سی آرزو سسکتی ہے۔ کہ کاش یہ سب جھوٹ ہو۔ مگر یہ جھوٹ کہاں ہے۔ آنکھیں بند کرنے سے حقیقتیں گم تھوڑی ہوتی ہیں۔ پروفیسر صاحب کی موت علمی ادبی ثقافتی حلقوں میں صف ماتم بچھا گئی ہے۔ جانے والے کی یادیں رو رو کر آنکھیں بلنے لگتی ہیں۔ ان کا وہ نورانی، ذہین اور بشاش چہرہ آنکھوں کے سامنے بار بار پھرتا ہے۔ قیامت دم نہیں لیتی کہ وقتِ سفر پھر یاد آجاتا ہے۔ پروفیسر صاحب اردو کی دنیا کی وہ قندیل تھے جو ہمیشہ فروزاں رہے گی۔ اور جس کی ضو سے علم و ادب کی راہیں ہمیشہ منور رہیں گی۔

طاہر فاروقی محقق، معلم، مدبر، ادیب، نقاد، ماہر تعلیم، غرض عالم بے بدل تھے انہوں نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کیلئے وقف کردی تھی۔ اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا اپنا ایک مقام تھا۔ ان کی مشہور تصنیف "سیرت اقبال" علامہ اقبال کی سیرت و شخصیت پر اولین تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ اسکے علاوہ سیرتِ سرکار دوعالم، سیرتِ امیر ملت، سیرت جوہر، اقبال اور محبتِ رسول، تاریخ فارسی ادبیات بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے سینکڑوں مقالات، مضامین اور مقدمات بھی تحریر کیے۔ جن کا علمی مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی تالیفات میں خیابانِ اقبال اور پاکستان میں اردو نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ موخرالذکر تالیف پر انہیں اور پروفیسر خاطر غزنوی کو انعام بھی مل چکا ہے۔ فارسی زبان و ادب کی مختصر

تاریخ پر بھی حکومتِ ایران کی طرف سے آپ کو تعریفی سند دی گئی ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر جامعۂ آگرہ نے دکتورادب کی ڈگری عطا کی۔ پروفیسر صاحب زندگی بھر درس و تدریس و تصنیف و تالیف کے عمل سے وابستہ رہے، ہر سطح کی درسی کتب تصنیف کرتے رہے۔ پرائمری سے لیکر یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین درجوں تک ان کی تحریر و تالیف کردہ کتب پڑھائی جاتی رہیں۔ درسی کتب کے اندر بھی انہوں نے علم و ادب کے معیار کو قائم رکھا۔ سستی شہرت اور بزنس کا کوئی خیال نہیں رکھا، معیار و وقار ان کے اصول تھے۔

اُردو زبان و ادب کی خدمت ان کی زندگی کا دستورالعمل تھا۔ یہ ان کا فیض نظر اور ان کے مکتب کی کرامت ہے کہ آج صوبہ سرحد کے گوشے گوشے میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ ان میں سے بہتیرے شعبۂ تعلیم سے بھی وابستہ ہیں، کچھ بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ ان کے سبھی شاگرد اپنے عظیم اُستاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے گیسوئے اُردو کو تابدار بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا مقام صحیح معنوں میں استاذالاساتذہ کا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی کئی نسلیں ان کی تحریروں کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہیں، اور ان کا یہ چشمۂ فیض قائم و دائم و جاری و ساری رہے گا۔

اُردو کے علاوہ وہ عربی فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے، فارسی زبان و ادب پر انتہائی گہری نظر تھی۔ اس کے ماضی و حال کا کوئی گوشہ ان کی نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ سینکڑوں اشعار نوکِ زبان پر تھے۔ عربی زبان سے دلی لگاؤ تھا اور اسکے رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں عربی و فارسی کی قدرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ انگریزی زبان سے البتہ کد تھی۔ اپنی تقاریر کے اندر انگریزوں کے خوب لتے لیتے تھے۔ انگریز قوم کو وہ چالاک و مکار قرار دیتے تھے۔ اور انگریزی زبان کے تسلّط کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑی سازش قرار دیتے تھے۔

پروفیسر صاحب خلیق تھے ملنسار تھے، بامروت تھے باحیا تھے، خوش وضع، خوش لباس خوش اطوار، خوش کردار، خوش گفتار و خوش طبع تھے۔ قدرت نے حسن و جمال کی دولت سے بھی خوب مالامال کیا تھا۔ چہرے پہ صباحت تھی، بشاشت تھی، ذہانت تھی۔ قد لوٹا جسم نفیس، شخصیت باوقار، چال متین، رفتار برنا تھی۔ وہ رعنائی و شادابی کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ چہرے پہ سفیدی و سرخی جھگڑتی تھی۔ کبھی ایک کو برتری تو کبھی دوسری کو فوق۔ ہر لباس ان پہ خوب سجتا تھا۔ انگریزی سوٹ میں تو پورے انگریز نظر آتے تھے۔ جناح کیپ اور شیروانی میں کچھ اور ہی روپ

دکھاتے۔ ڈاڑھی رکھنے سے قبل ہر وقت کلین شیو رہتے۔ اور سچ ہے پوری سج دھج سے رہتے۔ پان کھاتے تھے۔ اور قرینے سے کھاتے تھے۔ پان کا استعمال ان کے ہونٹوں کو کچھ اور سرخی بخش دیتا تھا۔ پان کے علاوہ ایک خوبصورت سجی سجائی تھیلی میں بھُنی ہوئی سونف اور سپاری ہر وقت ساتھ رکھتے اور دوستوں عزیزوں اور شاگردوں سب کو بڑھ بڑھ کر محبت و خلوص سے پیش کرتے رہتے۔ طلباء بڑے ذوق و شوق سے یہ تبرک حاصل کرنے میں کوشاں رہتے۔

لباس کے معاملے میں بڑے باذوق واقع ہوئے تھے۔ آج تک کسی نے ان کو بدوضع اور بدرنگ لباس میں نہیں دیکھا۔ تن کے بھی اجلے اور من کے بھی اجلے تھے۔ براق لباس کی طرح براق دل بھی پایا تھا۔ لباس وہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ پہنیں۔ تھے وہ اول و آخر مشرقی۔ آخری عمر میں چہرے پہ ڈاڑھی بھی سجالی تھی۔ ڈاڑھی تو واقعی ان کے چہرے پر ہی سجی تھی۔ اس سے ان کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ ان کے رعب و وقار میں اضافہ ہوگیا تھا۔ بات کرتے تو مسکراہٹوں اور مسرتوں کی سوغات بانٹتے۔ پاس بیٹھتے تو فضا کو اپنے وجود سے پرکردیتے تھے۔ دلچسپ و معصوم باتوں میں علم و دانش کے موتی رم جھم کرتے برساتے رہتے۔

استاذی المکرم دیانت، شرافت اور وضع داری کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ زندگی کو سلیقے سے نبھانے کا گر جانتے تھے۔ قناعت ان کی بات بات سے ٹپکتی تھی۔ ان کو کبھی رنجیدہ و مایوس نہیں پایا گیا۔ دوسروں کے معاملات میں بھرپور دلچسپی لینے والے اس عظیم معلم نے کبھی اپنے بکھیڑے دوسروں کے آگے نہیں بکھیرے۔ اپنے مسائل سے دوسروں کے مصائب میں اضافہ نہیں کیا۔ وہ حتی الوسع دوسروں کے راستے کے کانٹے چننے میں مصروف رہتے تھے۔ زندگی ایک شان سے گزاری اور وضع داری اور خودداری کو نبھاتے رہے۔ کسی کے آگے دست طمع دراز نہیں کیا۔ جھکنا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ آن بان بانکپن ان کی شخصیت کے لازمی اجزاء تھے۔ تونگر گر دیتے۔ مگر خودنگر اور خودگر ضرور تھے۔ چھوٹوں سے جھک کر مگر بڑوں سے تن کر ملتے تھے۔ دولت و اقتدار کی پوجا کی نہ ان کے آگے سر جھکایا۔ علم کے پیاسے اور اہل علم کے قدرداں تھے۔ عالم فاضل شخص کی ہمیشہ قدر کرتے تھے۔ سماجی رتبوں سے کبھی مرعوب نہ ہوتے والے تھے۔ بے باک بے غرض بے ریا اور بے دھڑک انسان تھے۔ ڈر خوف پاس سے گزر کر بھی نہیں گئے تھے۔ بات وثوق سے کہتے کہ یقین سے کہتے تھے۔ مگر ہر بات میں حسن تھا۔ وزن تھا۔ دلیل تھی۔ وقار تھا۔ لوگ ان کو کٹ کھنا بھی کہتے ہیں۔ جابر

وقاہر بھی کہتے ہیں۔ مگر وہ صرف ریاکاروں، منافقوں اور بدکاروں کے لیئے شمشیر برّاں تھے۔ زندگی بھر بدی کی قوتوں کے خلاف اپنی بساط کے مطابق برسرپیکار رہے۔ غرضوں کے پجاری اپنے بھی ان سے خفا اور بیگانے ناخوش ضرور رہتے۔ کیونکہ وہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہہ سکتے تھے۔ چاہے اس کیلئے خود کیوں نہ زہر ہلاہل پینا پڑتا ہو۔ وہ سخت گیر بھی مشہور رہے۔ مگر یہ سخت گیری اصول پرستی کی وجہ سے تھی۔ اصولوں پر سودے بازی کیلئے وہ کبھی تیار نہیں ہوئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی ہمدردی اور طبعی شرافت سے بھی معمور رہے۔ دوسروں کے دکھوں پر تڑپ تڑپ بھی اُٹھتے تھے۔ مشورے ہمیشہ صائب اور دیانت دارانہ دیتے۔ کوئی طالبعلم اپنا ذاتی مسئلہ ان کے سامنے چھیڑ لیتے۔ بس اس کے بعد استاد مکرم اُس مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا کر اس گتھی کو سلجھانا شروع کر دیتے۔ غریب طلباء کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی مالی اخلاقی اور انتظامی معاونت خاص طور پر فرماتے۔ داخلے کے خواہشمند سرکاری ملازمین کی مشکلات کا بہت خیال رکھتے۔ کسی کی چھٹی کا غم تو کسی کی حاضری کی فکر۔ اللہ اللہ! ان کی یہی شفقتیں آج دلوں کو برما رہی ہیں۔ آج دل رنجیدہ خاطر کبیدہ، اور آنکھیں گریاں ہیں۔ ہمارا مشفق بزرگوار اور باپ ہم سے رخصت ہو گیا۔ ہماری کامیابیوں پر خوشیاں منانے والا اور ناکامیوں پر دل گرفتہ ہونے والا مہربان گزر گیا۔ محبت و دیانت کی تلقین آدمی اب کہاں سے لائیں۔ رو اے دل رو! برس اے آنکھ برس، آج نہیں برسے گی تو کب برسے گی۔ صبر کی تلقین کرنے والا رخصت ہوا۔ ہمارا صبر و قرار بھی اب رخصت ہوا۔ ہم چراغ چشم گریاں لیکر انہیں ڈھونڈتے رہیں گے۔ جب کبھی ہمارا مقدور ہوا خاک سے ضرور پوچھیں گے کہ اے لئیم تو نے یہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے۔

فاروقی صاحب مکمل و مجسم مدرّس تھے۔ کلاس کے اندر ان کی نرالی ہی شان ہوتی تھی پڑھانے کا اسلوب بڑا ہی سجیلا تھا۔ اس اسلوب میں محبت و علمیت شیر و شکر کی طرح گھلی ملی ہوتی تھیں۔ ان کی باغ و بہار شخصیت کی تہیں کلاس کے اندر کھلتی جاتی تھیں۔ علم و فراست کی باتوں کو اس قدر خوش طبعی اور لطف و کرم سے بیان ہوتا کم ہی دیکھنے میں آیا ہوگا۔ ان کے انداز میں صداقت کے تحکم کے ساتھ ساتھ علم کا وزن اور خلوص کا لوچ بھی شامل ہوتا تھا۔ لفظ اور کو بڑے ہی دلآویز پیرائے میں طول دیکر شیرے کی تار بنا دیتے جس سے جملوں کی دروبست میں بے پناہ چسپیدگی پیدا ہو جاتی۔ ان کا یہ لہجہ شستہ رفتہ اور پاکیزہ تھا۔ جس پر

متانت و خوش دلی کی بدلتی دھوپ چھاؤں قوس قزح کے رنگ پیدا کر دیتی تھی۔ ان کی تدریس کا کمال یہ تھا کہ دل کھنچا جاتا تھا۔ دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ وقت گذرتا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس ختم ہوتا جاتا تھا۔ ان کی تدریس کے لمحات میں طالب علم ادب و علم کی دُنیا میں جا بستا تھا۔ غالب، میر، اقبال، درد اور سرسید کے دور کے سانسوں کی لیک محسوس ہونے لگتی تھی۔ موضوع سے محبت بڑھتی تھی۔ اُستاد سے عقیدت اور ادب سے چاہت میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان کے لیکچر میں تحقیق و تدقیق، تخلیق و تخییل، تعمیر، تنقید، تاکید سبھی کچھ ہوتا تھا۔ ہمارا ایک مرحوم دوست بابر پرویز شاد انہیں کم حقر العلوم کہتا تھا۔ ایک دوسرا ستم ظریف انہیں بابا طاہر عریاں کا لقب دیتا تھا۔ ہم انہیں بڑے بڑے ناموں سے پکارتے تھے۔ مگر کسی نام سے تحقیر یا تنقیص مراد نہ ہوتی تھی۔ بلکہ محبت و عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔

ہم ان سے ڈرتے بھی بہت تھے۔ ان کا غصّہ بھی محبت کی طرح شدید تھا۔ ان کی اس کیفیت کو جلال طاری ہونے سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس عالمِ جلال میں وہ بہت کچھ کہہ اور کر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسے ہی جبروتی لمحوں میں موصوف نے راقم السطور کو گلدان دے مارا تھا۔ جس نے میرا سر توڑنے کی بجائے دیوار سے اپنا سر پھوڑ لیا تھا۔ غصّے کے عالم میں شاید ہی کسی شخص کو اس قدر حسین پایا گیا ہو۔ ان کے غصّے یہ بھی پیار آتا تھا۔ مگر ان کا قہر و جبروت انتہائی عارضی ہوتا۔ چند ثانیوں یا گھنٹوں کے بعد مہر و محبت اور عفو و درگذر کی بے پایاں دھوپ نکل آتی تھی۔ اور مروّت و اخلاص کی چاندنی نمودار ہو جاتی تھی۔ جسمیں ہم سب نہا جاتے نہال ہو جاتے۔ جہاں ہم ان کی گرج و گونج کے آگے سہم جاتے تھے۔ وہاں ان کی محبتوں کی سرشاری سے بھی بقدر ظرف لطف اندوز ہوتے تھے۔ جس خوش نصیب پر وُہ بہت ناراض ہوتے۔ چند گھنٹوں بعد ایک محبت بھری فضا میں اسکی طلبی ہوتی۔ اور وہ شخص مسحور و مسرور ہو کر وہاں سے لوٹتا۔ محترم اُستاد عظیم! کہاں تک آپ کو یاد کریں۔ کس کس ادا کا ذکر کریں۔ آپ شعلہ و شبنم کا حسین امتزاج تھے۔ ان کے لیکچر، بات چیت اور گفتگو میں شوق اور ظرافت اور بذلہ سنجی کے ستارے جھلملاتے تھے۔ لطائف و ظرائف کی بھی بھرمار ہوتی تھی۔ جن کے اندر ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا تھا۔ اپنے طلباء کو وُہ اپنے پورے اعتماد کا مستحق جانتے تھے۔ کلاس کے دوران کا طرزِ تخاطب مکمل طور پر دوستانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔ دورانِ تدریس اکثر موج میں آ کر خوش طبعی کے نمونے پیش کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی شعر کو مکمل طور پر اُلٹی ترتیب سے پڑھتے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ

کونسی زبان بول رہے ہیں اور کیا پڑھ رہے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ چہرے پہ گہری سنجیدگی اور متانت سجائے کھڑے ہیں۔ سب کو حیران و پریشان کرکے پھر شعر کو صحیح پڑھتے اور پھر قہقہوں کی بارش شروع ہوجاتی۔ اسی طرح طلباء کے اصرار پر نہایت سنجیدگی سے چند ہندسے دہراتے اور کہتے کہ شعر ہے۔

اکہتّر بہتّر تہتّر چوہتّر ؛ پچہتّر چھہتّر ستتّر اٹھتّر

درسی و نصابی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ روزمرّہ اور زبان و بیان کی اصلاح بھی کرتے رہتے۔ غلط العوام الفاظ کا صحیح استعمال اور تلفظ سکھاتے۔ مثلاً وہ کہتے کہ روح و رواں لفظ کو اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی روحِ رواں پڑھتے ہیں۔ حالانکہ درست روح و رواں ہے۔ اسی طرح مُعَنْوَن بہ کو صحیح زیر و زبر کے ساتھ پڑھواتے۔ بہت لوگ اسے بلا پیش و زبر پڑھتے ہیں۔ ان نکات کے ساتھ وہ اخلاق و کردار کی پختگی اور صفائی پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ وُہ خود بھی خوبصورت تھے مرتے دم تک خوبصورت رہے۔ آخری عمر کے فالج نے بھی ان کو بدصورت نہیں بننے دیا۔ وُہ زندگی بھر خوبصورتیوں کی قدر کرتے رہے۔ ڈھونڈتے رہے۔ لباس میں۔ اخلاق میں، الفاظ میں، ادب میں، زندگی میں، جمال پرستی ان کی شان تھی۔

انہوں نے بلند اخلاقی معیار کو سینے سے لگائے رکھا۔ شائستگی کی رفعتوں سے کبھی نیچے نہیں اُترے۔ طلباء و طالبات کو وُہ اپنے بچے اور بچیاں سمجھتے رہے۔ ان کے شعبے کی طالبات شعبے کو اپنے گھر سے بھی زیادہ پرسکون اور عافیت سمجھتی تھیں۔ طلباء کی طرف سے ذراسی شرارت پر بھی وہ غیظ و غضب سے تمتما اُٹھتے تھے۔ اور حرکتیں وہ شاید برداشت کر لیتے مگر شعبے کی بچیوں کی طرف اُٹھنے والی آنکھ پھوڑنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ اور اس معاملے میں مار پیٹ تک بھی نوبت پہنچانے سے شاید وہ نہ چوکتے۔

فاروقی صاحب آپ زندہ ہیں۔ آپ کی یادیں زندہ ہیں، آپ کی محبت زندہ ہے، آپ کی مار نے بڑے بڑوں کے اندر کے عفریتوں کو مار دیا تھا۔ آپ کی مار آپ کے پیار سے بڑھ کر تھی۔ اور پیار بے کراں اور لامتناہی تھا۔ آپ کی مخلصانہ راہنمائی نے زندگی کے طوفانوں سے بھڑ جانے، لڑ جانے کا حوصلہ دیا۔ آپ نے جینے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ زندگی نام ہے موت سے لڑ جانے کا۔ عزتِ نفس کا۔ احترام آدم کا۔ موت کچھ بھی نہیں سوائے بے حسی، بے غیرتی اور ریاکاری کے۔ آپ مثبت قدروں کے بے باک ترجمان تھے۔ آپ

تعلیم کے شعبے کی آبرو تھے۔ زندگی بھر پڑھتے رہے، پڑھاتے رہے، لکھتے رہے لکھاتے رہے۔ اور اُردو کا علم اٹھائے آگے بڑھتے رہے۔ ناز تھا اپنی مشرقیت پر۔ ناز تھا اپنے اسلام پر۔ ناز تھا اپنی زبان پہ۔ وہ مشرق اسلام اور اُردو کے سپاہی تھے۔ ان کا رویہ ان معاملات میں معذرت خواہانہ ہرگز نہیں تھا۔ سپاہیانہ تھا۔ قلندرانہ تھا۔ جارحانہ تھا۔ بڑے بڑے پلیٹ فارموں سے وہ بانگ درا کی صورت میں کلمۂ حق کہنے کا یارا رکھتے تھے، اور کسی بھی طرح کی محفل میں اپنا ما فی الضمیر صداقت و دیانت سے کہہ سکتے تھے۔

اپنے شاگردوں پر ہمیشہ شفقت کی نگاہ رکھتے تھے۔ اچھے اور قابل طلباء کی حوصلہ افزائی اور اُنکی کارکردگی پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ شاگردوں کے کارنامے مزے لے لے کر اپنے دوستوں شناساؤں کو سنایا کرتے۔ پشاور اُردو کانفرنس کے موقع پر راقم الحروف نے ایک مضمون پڑھا جو بس واجبی سا تھا۔ مگر اُستاد مکرم کو شاید پسند آگیا۔ یا میری دلجوئی مراد تھی۔ چنانچہ چائے کے وقفے کے دوران موصوف میرا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر سید عبداللہ اور دوسرے زعماء علماء کے پاس لیکر پھرتے تھے اور کہتے تھے یہ میرا شاگرد ہے۔ مقالہ اس نے پڑھا ہے۔ اب ہم محجوب اور وہ مسرور۔ ان کے چہرے پر ایسے مواقع پر ایک روحانی مسرت پدرانہ مہر اور ملکوتی ماورائیت مسکراتی تھی۔

فاروقی صاحب شاگردوں اور چھوٹوں پر ہمیشہ مہربانی فرمایا کرتے تھے۔ جہاں کہیں مل جاتے بڑی محبت سے سینے سے لگاتے۔ حال احوال پوچھتے، حوصلہ بڑھاتے داد دیتے کچھ کر گزرنے کی امنگ پیدا کرتے۔ ساتھ ساتھ اصلاح بھی فرماتے جاتے۔ عید بقرعید پر ملاقات کی صورت میں نہال ہو جاتے۔ بڑھ بڑھ کر ملتے۔ مٹھائی اٹھا اٹھا کر کھلاتے۔ خوش طبعی کے پھول برساتے۔ محفل کو زعفران زار بناتے جاتے۔ رخصت ہوتے وقت ایسے رخصت کرتے جیسے کوئی متاعِ عزیز خدا کو سونپ رہے ہوں۔

فاروقی صاحب جیسے عالم و فاضل لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ وُہ گزرے زمانے کے تاج محل ہیں۔ وہ سانچے اب ٹوٹ گئے ہیں، جن میں یہ ہستیاں ڈھلا کرتی تھیں۔ مروت و وفا کے یہ پیکر اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ حرص و آز کے بندے تو ہزاروں ہیں۔ مگر تدبر و تہور کی یہ تصویریں کہاں پیدا ہوں گی۔ خدا مرحوم کو پہلو پہلو جنت نصیب کرے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بیگم منور رؤف
اسسٹنٹ پروفیسر ہوم اکنامکس کالج
پٹنہ یونیورسٹی

مخزنِ اُردو

پروفیسر طاہر فاروقی اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ کسے خبر تھی کہ ایسی گھن گرج کی شخصیّت کو موت اتنی آسانی سے زیر کرلیگی — ! اور دوسروں کو زندگی کا عزم و حوصلہ دینے والا یوں چپ چپاتے دُنیا سے رخصت ہو جائے گا — !!

فاروقی صاحب مرحوم نے تہتر برس کی (۱۹۰۵ء — ۱۹۷۸ء) عمر پائی۔ لیکن زندگی کے آخری لمحے تک رواں دواں رہے۔ کیونکہ انکے نزدیک زندگی کا مفہوم ہی یہ تھا کہ —

ع   جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

انکی طبیعت کی شگفتگی اور شستگی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی نے زندگی کے آخری دور میں بھی کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ موت کا مہیب سایہ انکے گرد کہیں نزدیک ہی منڈلا رہا ہے۔ میں نے انکو ہمیشہ حاق و چوبند چست اور کام کیلئے مستعد پایا۔

مرحوم میرے اُستاد تھے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ بلکہ یوں سمجھئے سب کچھ سیکھا۔ گفتگو کا سلیقہ، الفاظ کا صحیح انتخاب اور اشعار پڑھنے کا صحیح انداز۔ یہ سب کچھ فاروقی صاحب کا ہی سکھایا ہوا تھا۔ تلفظ کی صحیح ادائیگی کے معاملے میں وہ انتہائی محتاط تھے۔ ادھر کسی کے منہ سے کوئی غلط لفظ نکلا اُدھر فاروقی صاحب نے اپنی عینک کے شیشے میں سے گھورا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن سے گفتگو کرنے سے قبل میں بزرگوں کے اس قول پر عمل پیرا ہو جاتی تھی کہ "پہلے تولو۔ پھر بولو"۔ اور ان کی موجودگی میں الفاظ خود بخود احتیاط کی چھلنی میں چھنکر مُنہ سے نکلتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انکی اس عادت نے میری اُردو کی بہت حد تک تصحیح کی۔

انسان حیوانِ ناطق ہے۔ باتیں کرنا خوب جانتا ہے۔ لیکن ان باتوں کو سلیقہ سے ادا کرنا اور لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ سے گفتگو کو مؤثر بنانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس سلیقہ اور تہذیب کیلئے ہمیں اکثر فاروقی صاحب رہنمائی فرماتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں زبان دانی کے ایسے اہم نکتے بیان

کرجاتے تھے۔ کہ ہم خرما و ہم ثواب ـــــ !

پروفیسر طاہر فاروقی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ جسکی جلوہ آرائیوں سے محفلِ ادب جگمگا رہی تھی ـــ اِس انجمن سے نہ صرف بزمِ سخن فیض پا رہی تھی بلکہ ہزاروں تشنگان اُردو بھی رہنمائی حاصل کر رہے تھے۔ انکی وسیع القلبی اور وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ ہر اس شخص کی اعانت کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے جو انکی مدد کا جُویا ہوتا۔ میرے نزدیک انکی حیثیت علم وفضل کے ایک دریا کی سی تھی کہ جس سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنی علمی و ادبی پیاس بُجھا رہے تھے۔ السنۂ شرقیہ میں انکو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ انہوں نے کم وبیش نصف صدی تک ہند و پاک اور ترکی کی پانچ مختلف یونیورسٹیوں (آگرہ، ڈھاکہ، پنجاب، پشاور، انقرہ) میں اُردو فارسی ادب کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ اور اس سب کے پسِ منظر میں ان کا تعلیمی ریکارڈ بھی بے مثل تھا۔

حسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں یکتا۔ علم وفضل کا وہ منبع جس سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں تشنگانِ علم وادب فیض یاب ہو رہے تھے، یکایک بند ہو گیا ـــ ! زندگی کے سوتے جو اسکی آواز کی گھن گرج سے پھوٹتے تھے خشک ہو گئے ـــــ ! اور یُوں انجمنِ اُردو کی یہ جھلملاتی ہوئی شمع ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بجھ گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

فاروقی صاحب کی وفات سے صوبہ سرحد ایک عظیم دانشور اور دُنیائے ادب ایک عظیم ادیب، شاعر، نقاد اور سیرت نگار سے محروم ہوگئے۔ مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرنا نہ صرف مشکل بلکہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ اسکے لئے ہمیں انکی کتاب زندگی کے ان اوراق کی ورق گردانی کرنا ہوگی جب وہ عین عنفوانِ شباب میں تھے جو بیس پچیس کا سن تھا۔ علم کی لگن اور ادب کی خدمت کا شوق شباب پر تھا۔ نگارِ عجم (۱۹۲۷ء)، بہارِ ادب (۱۹۲۸ء) مخزنِ اُردو (۱۹۳۰ء) سیرت محمد علی جوہر (۱۹۳۱ء) اور سرکارِ دو عالم (۱۹۳۲ء) یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آرہی تھیں۔ اسکے بعد ایم۔ اے فارسی کی تیاری کیلئے کچھ توقف کیا۔ ۱۹۳۴ء میں ایم۔ اے فارسی فسٹ کلاس پاس کر لینے کے بعد یہ سلسلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا ـــ کلید قواعد اور گنجینۂ قواعد ۱۹۳۵ء میں روح قواعد و انشاء اور ادبیاتِ ایرانِ نو ۱۹۳۶ء میں اور چمنستان اُردو ۱۹۳۷ء میں بالترتیب منظرِ عام پر آئیں۔

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال پر ان کی زندگی میں پہلی کتاب "سیرت اقبال" فاروقی صاحب نے ہی لکھنا شروع کی تھی۔ جو علامہ کی وفات کے بعد جنوری ۱۹۳۹ء میں تیار ہو کر شائع ہوئی۔ "سیرت اقبال" ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ میں سمجھتی ہوں اُردو ادب کے طالب علم اور اقبال کے مبتدی کیلئے اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب نہیں ہو سکتی۔

علامہ اقبال کی وفات کے چند ہی روز بعد مئی ۱۹۳۸ء میں فاروقی صاحب نے اقبال دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے آگرہ میں انکی یادگار کے طور پر بزم اقبال قائم کی، جس کا مقصد حکیم الامت کے افکار و خیالات کی اشاعت اور انکے پیغام کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ طور پر اُردو ادب کی ترقی و ترویج بھی تھا۔ آپ ہی کی کوشش و مساعی کی بدولت بزم اقبال ترقی کرتے کرتے جامعہ اُردو میں تبدیل ہوئی اور موصوف اس جامعہ کے پہلے رجسٹرار منتخب ہوئے۔ فاروقی صاحب نے بڑی جانفشانی سے اس جامعہ کی خدمت کی۔ اور جب آپ اسکو مضبوط بنیادوں پر استوار کر چکے تو ملک تقسیم ہو گیا۔ اور قبلۂ موصوف نے پاکستان میں رہائش اختیار کرنیکا فیصلہ کیا۔ جامعۂ اُردو جسکو انہوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا، اپنے مُربّی کی شفقتوں سے محروم ہوئی جا رہی تھی۔ یہ بات فاروقی صاحب کو گوارا نہ ہوئی۔ چنانچہ آگرہ چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اس ادارے کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل کر دیا۔ اور وہاں پروفیسر ظہیر الدین علوی جو نہایت دیانت دار محنتی اور قابل انسان تھے انکی سپردگی میں دے دیا۔ پروفیسر موصوف اس جامعہ کیلئے انتہائی موزوں سرپرست ثابت ہوئے۔ ان کی زیرِ نگرانی یہ جامعہ حکومتِ ہند کا تسلیم شدہ ادارہ بنا۔ جو اب اُردو یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اس ادارے کے تحت ادیب۔ ادیب فاضل اور ادیب کامل وغیرہ کے امتحانات ہوتے ہیں، اور کثیر تعداد میں طلباء ان امتحانات میں شریک ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور بورڈوں کا تسلیم شدہ یہ ادارہ آج بھی اُردو ادب کے شائقین کو فیض پہنچا رہا ہے۔

ایجاداتِ سائنس (۱۹۴۲ء) اور چمنستانِ ادب (۱۹۴۹ء) فاروقی صاحب کی بعد کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔ ۱۹۴۷ء انتشار کا دور تھا۔ ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان منتقل ہوئے۔ پاکستان تشریف لانے کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں آپ نے مخزنِ اُردو کا پورا سیٹ ترتیب

دیا، جو درجہ اول سے درجہ ہشتم تک کیلئے صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ، کراچی اور بلوچستان تک سب جگہ شامل نصاب ہوا۔ اسی سال نگارستانِ اُردو منظر عام پر آئی۔ پھر ۱۹۵۴ء میں بہارِ ادب اور روحِ قواعدِ انشاء اور ۱۹۵۷ء میں سفینۂ اردو ترتیب دیں۔ ان کی بیشتر کتابیں مختلف اوقات میں مختلف درجوں کیلئے ہندوستان سے لیکر پاکستان تک شاملِ نصاب رہی ہیں۔ نگارِ عجم (دو حصے) یو۔ پی۔ سی۔ پی، راجپوتانہ اور بھوپال کے اسکولوں میں ساتویں آٹھویں جماعتوں کے نصاب میں داخل تھیں۔ بہارِ ادب ٹیچرز کورس کیلئے یو۔ پی کے نصاب کیلئے منظور ہوئی تھی۔ اور ادبیاتِ ایرانِ نو بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے فارسی کیلئے منتخب کی گئیں۔ چمنستانِ اُردو آگرہ یونیورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہوئی۔ اسکے علاوہ سفینۂ اُردو پشاور بورڈ کے ایف۔ اے، ایف۔ ایس سی اور فصاحت و بلاغت بی۔ اے اور ایم۔ اے کے درجوں میں آج بھی شاملِ نصاب ہیں۔

علاوہ ازیں فاروقی صاحب کے لاتعداد ادبی مضامین ہیں جنہیں دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی قلم اور کلام پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ مختلف کتب کے پیش لفظ (جن میں میری کتاب "دیدہ ور" کا پیش لفظ بھی شامل ہے) دیباچے مقدمات، ترجمے اور ریڈیو۔ ٹی وی کی نشری تقاریر و مذاکرات ان کے علاوہ ہیں، جو حسنِ کلام اور قدرتِ بیان کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے، خوب لکھتے تھے۔ بے تکلف اور بلا تکان لکھتے تھے۔ ایسے قادرالکلام ادیب، محقق، انشا پرداز اور شاعر کو ابوالکلام کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

ادبی خدمات سے قطع نظر زبانِ اُردو کے فروغ کے سلسلے میں بھی فاروقی صاحب کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ وہ ریڈیو پاکستان پشاور سے تقریباً دو سال تک (۱۹۵۰-۵۱ء) ہفتہ وار پروگرام "اُردو سیکھئے" پیش کرتے رہے۔ فصاحت و بلاغت کے مصنف کی کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان کے یہ سلسلے صوبہ سرحد کے لوگوں میں بیحد مقبول ہوئے، یہ پروگرام اس خطے کے لوگوں کے لئے انتہائی دلچسپ اور مفید ثابت ہوا اور اس سے خواص بھی مستفید ہوئے۔ اور عوام نے بھی پورا پورا استفادہ کیا۔

فاروقی صاحب کم و بیش چالیس سال تک درس و تدریس کے پیشے سے

منسلک رہے۔ اتنے طویل عرصہ کے دوران اس خلوص و محبت کے پیکر اور شرافت و انسانیت کے مرقع نے ہر اس شخص کے ساتھ دلی ہمدردی اور شفقت کا سلوک روا رکھا جسکو اُن سے سابقہ پڑا۔ ان کی مشفق و مہربان شخصیت ہر ایک کیلئے باعث سکون و طمانیت تھی۔ وہ سب کے ہمدرد، سبکے ہی خواہ، سب کے دوست اور سب کے خیر خواہ تھے ـــ!

وہ ایک اُستاد تھے۔ بڑے پائے کے اُستاد ـــ!! جو شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ سلوک روا رکھتے تھے۔ لیکچر شروع ہونے سے قبل بڑی محبت سے سونف کا بٹوہ پیش کرتے۔ لیکن ضیافت سونف کے بعد لیکچر شروع ہوتا تو ماحول ہی بدل جاتا۔ انتہا عالمانہ اندازِ بیان اور انتہائی اہم نکات لیکچر کے دوران ـــ! یہ سب کچھ فاروقی صاحب کا ہی حصہ تھا۔ کوئی دوسرا شخص کبھی یہ انداز اختیار نہ کرسکا ـــ!!

فاروقی صاحب نے صوبہ سرحد میں بطور معلّم تقریباً پچیس سال بسر کیے۔ اس عرصہ میں وہ سرحد کے تقریباً تمام معلّمین و متعلّمین اُردو کے اُستاد رہے۔ انکے دوستانہ سلوک اور بے تکلفانہ رویّہ کے باوجود انکی شخصیت کا رعب اور دبدبہ کچھ ایسا تھا کہ انکی موجودگی میں کبھی کسی شاگرد کو کوئی نامعقول بات کرنیکی جرأت نہ ہوتی تھی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان ایک حدِ فاصل ضرور قائم رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ برصغیر پاک و ہند کے اُن روشن چراغوں میں سے تھے جن کے دم سے اُردو ادب کی شان اور قدیم وضع داری کی آن قائم تھی۔

ملازمتوں کے چکر سے سبکدوش ہو جانے کے بعد زندگی کے آخری دور میں بھی فاروقی صاحب نے اُردو ادب کے سرمائے میں مزید اضافہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں "نثر نگاری کا فن" اور ۱۹۷۵ء میں 'سیرت امیرملت' (پیر جماعت علی شاہ) لکھی جو سیرت کی کتابوں میں اعلیٰ پائے کی کتاب تصور کیجاتی ہے۔ علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں حکومت کی فرمائش پر آپ نے "اقبال اور محبتِ رسول" تحریر فرمائی۔ اسکے علاوہ اقبال پر ایک اور کتاب "افکار اقبال" پھر 'ہماری زبان' 'گرد کارواں' (اپنی سوانح) ایک سفرنامہ اور ایک بیاض ہے۔ جو ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ـــ ایک دلچسپ ڈائری "طاہر فاروقی بقلم محمد طاہر فاروقی" بھی ان کے قلمی نسخوں میں سے دستیاب

ہوئی ہے۔ یہ انکی زندگی کے اُن واقعات پر مشتمل ہے جن سے پڑھنے والے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

مرکزی اُردو بورڈ کی لغت کی تیاری میں بھی فاروقی صاحب نے قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ وہ ایک زمانہ میں اس بورڈ کے ممبر رہ چکے تھے۔ اسی لئے انکی علمیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس لغت کی تیاری میں مدد لی گئی۔ پشاور ریڈیو سٹی کا کیلنڈر (۱۹۵۵ء) بھی فاروقی صاحب سے مرتب کرایا گیا تھا۔

میں سمجھتی ہوں فاروقی صاحب اپنی ذات میں ایک ایسا ادارہ تھے جس میں اُردو، فارسی، اور عربی ادبیات کے علاوہ تاریخ، طب (ہومیو پیتھک) اور معلوماتِ عامہ کے اعتراف میں جامعہ اُردو علی گڑھ نے ان کو ڈکتورِ ادب (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا۔

مختصر یہ کہ اُردو زبان و ادب کیلئے فاروقی صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ قدرت نے انکے روپ میں اردو ادب کو ایک ایسا انسائیکلو پیڈیا بخش دیا تھا جس سے خواص وعوام، تعلیم یافتہ و ناخواندہ، شعراء ادباء اور طلباء یکساں طور پر مستفید ہو رہے تھے۔

فاروقی صاحب مرحوم بڑی باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بڑے خوش خُلق، متواضع اور خلیق انسان تھے۔ اُنکی صحبتیں بڑی پُرلطف اور دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اُنکو کبھی افسردہ یا مضمحل نہیں دیکھا۔ انکی موجودگی میں زندگی بڑی رواں دواں نظر آتی تھی۔

مگر اب کچھ نہیں رہا۔ زمانہ بدل گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی سب کچھ بدل گیا۔ "چمنستان اردو" کا چمن اور "بہار ادب" کی بہار خزاں نصیب ہوگئی۔! وہ پُرلطف صحبتیں جنہیں "جوہر اُردو" کے جوہر کھلنے تھے ختم ہوگئیں۔!! "نگارستانِ اُردو" نگارِ عجم اور ادبیاتِ ایران کی نگار آرائیاں، اور عالمانہ شان کی گفتگو کے وہ سلسلے بھی ختم ہوئے جو "مخزنِ اُردو" کے مخزن سے وابستہ تھے۔!! "روحِ قواعدِ انشاء" کی روح نے کیا پرواز کی اسکے ساتھ ہی نثر نگاری کا فن بھی تمام ہوا۔ اور "فصاحت و بلاغت" سے مزین فصیح و بلیغ تقریریں اور تحریریں سبھی کچھ فنا ہوگیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

پروفیسر بشیر الدین
سابق صدر شعبۂ انگریزی پشاور یونیورسٹی

جناب طاہر فاروقی کے ساتھ ایک شام

مجھے بارہا بزرگوں سے ایسی شفقت، دوستوں سے ایسی محبت اور چھوٹوں سے ایسا احترام ملا ہے جس کا میں قطعی حقدار نہ تھا۔ اس سے میرا یہ عقیدہ راسخ سے راسخ تر ہوتا جا رہا ہے کہ اللہ بےحد رحیم و کریم ہے اور ان صفاتِ خداوندی کی ایک جھلک اُسکے نیک بندوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

ایسے ہی اللہ کے نیک بندے جناب طاہر فاروقی بھی تھے۔ وہ میرے حق میں ایک مشفق بزرگ اور بامروت دوست ثابت ہوئے۔ انہوں نے مجھے اپنے دل میں وہ مقام دیا جو میری توقعات سے بہت بالا تر تھا۔ اپنی گفتگو میں اپنے بچوں، عزیزوں اور بزرگوں سے اتنا ہی قریب جان کر بات کی جتنے قریب وہ خود تھے حتیٰ کہ اُنکے بعض ایسے عزیزوں کی تصویر میرے دل پر کھنچ گئی جن سے میری ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ مثلاً افشاں میاں کو ملاقات ہونے سے بہت پہلے ہی میں ایک نہایت عزیز شخصیت کے طور پر جانتا تھا۔ ممتاز میاں، تو خیر میرے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ مگر یہ محترم فاروقی صاحب کی محبت تھی کہ میں انہیں ان کے سرکاری نام اطہر فاروقی کی بجائے ان کے خاندانی نام سے جانتا تھا۔ اپنائیت کی یہ محبوب ادا جناب طاہر فاروقی سے مخصوص تھی۔

ایک اور پیارا پہلو اس اپنائیت کا یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے تمام مشاغل خصوصاً علمی مشاغل میں برابر کا شریک سمجھ کر بات کرتے تھے۔ گویا میں بھی ان کا کوئی ہم پلہ شاعر، ادیب یا عالم ہوں۔ کبھی انہوں نے اس پیرائے میں مجھ سے خطاب نہیں کیا کہ "تم نہیں جانتے، آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں"۔ ہمیشہ اس طرح گفتگو کی جیسے

در عالم کسی مشترک دلچسپی کے موضوع پر بات کر رہے ہوں۔ ایسے میں اکثر مجھے اپنی جہالت کا اعتراف کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور بات کو اسی انداز سے جاری رکھا جیسے عالم عالم سے بات کر رہا ہو۔ علم عطا کرتے وقت :

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

کا اُسلوب تو کجا، یُوں لگتا تھا جیسے دو اُمراء ایک دوسرے کو تحائف پیش کر رہے ہیں۔ ان حالات میں' میں اُمیر مفروض' اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا تو کس دل سے کرتا؟ ۔

ایک تیسری بات جو 'اپنائیت' ہی کے تحت آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میری کوئی دعوت انہوں نے رد نہیں کی۔ اگر یہ کہا کہ جائے غریب خانے پر نوش فرمائیے تو خود پہنچے اور سب شریک محفل احباب سے کھُل کر گپ کی۔ اگر کہا کہ چپلی کباب کھانے چلتے ہیں تو فقیر آبادی کی چارپائی پر بیٹھ کر کباب وقہوہ میں شریک ہوئے۔ اگر کہا کہ جائے ہوگی اور احباب شعر سُنائیں گے تو بیاض سمیت آگئے۔ بلا تکلف شعر سُنائے اور دوسروں کے اشعار سنکر دل کھول کر داد دی۔ آخری عمر میں کچھ ضعف آگیا تو دعوت کے جواب میں اپنے مخصوص انداز میں فرماتے تھے کہ "خود تو نہیں آسکتا لیکن اغوا کئے جانے پر کوئی اعتراض بھی نہیں"۔

ایسے ہی ایک موقع پر میں انہیں 'اغوا' کرکے اپنے ہاں لے آیا۔ تقریب یہ تھی کہ کہنہ مشق شاعر جناب صبا اکبرآبادی جو مجھ پر فاروقی صاحب کی طرح مہربان ہیں پشاور آئے ہوئے تھے، ایک اور بزرگ شاعر جناب خورشید فرید آبادی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بڑے شعراء اور مجھ جیسے متشاعر کے مل بیٹھنے کا اچھا موقع تھا۔ کیمپس کے شعراء کو دعوت دی گئی لیکن صرف محسن احسان تشریف لاسکے۔ اور جب فاروقی صاحب کو اغوا کرکے لایا گیا تو کُل چار شاعر اور ایک متشاعر ایک چھوٹی سی بے تکلف محفل میں جمع ہوگئے۔ تین چار گھنٹے تک ہم لوگ شعر، پان، جائے اور گپ میں مصروف رہے۔ اتنا لطف آیا کہ جی چاہتا ہے کہ اس گھریلو مشاعرے کے وہ اشعار نقل کردوں جو مرحوم فاروقی صاحب نے سُنائے، کاش صفحۂ قرطاس میں ایسی گویائی ہوتی کہ قارئین مرحوم کی آواز کا زیر و بم بھی سُن سکتے۔ ان کے بے ساختہ قہقہوں سے لطف اندوز ہوسکتے، جہاں تک ممکن ہے فاروقی صاحب کے وہ الفاظ بھی نقل کئے دیتا ہوں جو انھوں نے اس محفل میں وقتاً فوقتاً نثر میں برجستہ فرمائے تاکہ اس محفل کی پوری فضا ایک حد تک قارئین تک منتقل ہوسکے۔

کلام فاروقی نقل کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کر دی جائے تو بہتر ہوگا۔ اُن کا بیشتر کلام آگرہ اور انقرہ کے ادوارِ زندگی کا ہے۔ بیچ میں پشاور کا طویل زمانہ پڑتا ہے جو زیادہ سخن خیز نہ تھا۔ خود فاروقی صاحب کی اصطلاح میں ان کی غزلیں یا تو Made in AGRA تھیں یا Made in ANKARA۔

اس گھریلو مشاعرہ میں شعراء جس ترتیب سے بیٹھ گئے تھے، اُسی ترتیب سے اپنی اپنی غزل پڑھتے رہے۔ کوئی اور تکلّف تقدیم و تاخیر کا ملحوظ نہ رکھا گیا۔ تاہم محض حسنِ اتفاق سے نوجوان پہلے آئے اور ہر عمر کے مطابق بزرگ و بزرگ تر اساتذہ سب سے پہلے محسن احسان کی باری آئی۔ وہ اپنی غزل

شنکار دشنۂ رہزن ہیں راہبر میرے ؛ سفر کریں تو کریں کیسے ہمسفر میرے

سُنا کر داد حاصل کر چکے تو فاروقی صاحب نے فرمایا کیوں بھائی بشیر صاحب اب میں سُنا لُوں اُستاد بعد کو' ـــ غالباً فانی کی زمین ہے۔

دم کی غفلت گناہ ہوتی ہے ۔۔۔ کیا خبر کب نگاہ ہوتی ہے
خلش گاہ گاہ ہوتی ہے ۔۔۔ یہ بھی الفت کی راہ ہوتی ہے
آؤ تم بھی تو اِک نظر دیکھو ۔۔۔ دل کی دُنیا تباہ ہوتی ہے
جب کہیں بھی نہ ہو پناہ نصیب ۔۔۔ ہم کو اس کی پناہ ہوتی ہے
راہِ الفت بہت ہی نازک ہے ۔۔۔ ایک لغزش گناہ ہوتی ہے
بے کہے بھی ہے سب انہیں معلوم ۔۔۔ دل کو دل سے جو راہ ہوتی ہے
شرم گر ہو گناہ میں شامل ۔۔۔ مغفرت دادخواہ ہوتی ہے
کاش وہ اب بھی ملتفت ہوتے ۔۔۔ شامِ دل بے پناہ ہوتی ہے
ڈوب جاتی ہے جو رگ و پے میں ۔۔۔ جانِ دل وہ نگاہ ہوتی ہے
مسکرا کر نہ دیکھنا دیکھو! ۔۔۔ یوں بھی حالت تباہ ہوتی ہے

بارگاہِ جمال میں طاہر!
لب کشائی گناہ ہوتی ہے

غزل کے دوران فاروقی صاحب نے حاضرین سے بہت داد حاصل کی۔ پانی کا وقفہ بھی ہوا اور بہت سی پُر لطف گفتگو بھی ہوئی۔ آخر میں خورشید صاحب نے

مطلع مکرر پڑھنے کی فرمائش کی۔ فاروقی صاحب نے سُنانے سے پہلے فرمایا" وہ ہے نا،

یک چشم زدن غافل ازآں ..... شاید کہ نگاہے کند آگاہ نہ باشی

اور پھر مطلع دوبارہ ارشاد فرمایا ؎

دم کی غفلت گناہ ہوتی ہے ؏ کیا خبر کب نگاہ ہوتی ہے

اس کے بعد شرم والا شعر ؎

شرم ہو گر گناہ میں شامل ؏ مغفرت دادخواہ ہوتی ہے

خورشید صاحب کی فرمائش پر مکرر سنایا اور مقطع ؎

بارگاہِ جمال میں طاہر
لب کشائی گناہ ہوتی ہے

صبا صاحب کی فرمائش پر دوبارہ عطا کیا۔ اُس کے بعد فرمایا" اچھا یہ تو تھا Made in Agra اب Made in Ankara ۔ صاحب اِتنا لمبا لمبا گیپ آیا ہے۔ ابھی میں ان سے کہہ رہا تھا، صبا صاحب سے، کہ آگرے کے بعد بیس سال میں نے کچھ نہیں کہا اور بیس سال بعد انقرہ میں پھر بکواس شروع کر دی، (قہقہے) اور ہاں آگرے سے تو پانچ سال سے کم ڈگری ہے ڈھائی سال میں اتنا کہہ دیا۔ لیجئے ایک چھوٹی زمین نکل آئی ؎

اہلِ دل کی حیات باقی ہے ؏ یعنی اِن کو ثبات باقی ہے
نگہِ التفات باقی ہے ؏ اب اُمیدِ نجات باقی ہے
اُن سے ملنے کی آرزو موہوم ؏ ارتقائے حیات باقی ہے

پیری آئی۔ یہ تو کچھ حسبِ حال سا ہی ہے، بہر حال ؎

پیری آئی شباب بیت گیا ؏ دِن ہوا ختم رات باقی ہے
موت آتی ہے یاد وہ آتے ہیں ؏ ایک راہِ نجات باقی ہے
منزلِ شوق ایسی دور نہیں ؏ گر یہی التفات باقی ہے
حالِ بیمار پوچھتے کیا ہو ؏ بس کوئی دن کی بات باقی ہے
موت نے کھائی ہے یہاں پہ شکست ؏ کربلا میں حیات باقی ہے
شکر ایمان بچ گیا طاہرؔ ؏ اپنی کل کائنات باقی ہے

اس کے بعد سب نے فرمائش کی کہ القرہ کا کچھ اور کلام عنایت ہو۔ فاروقی صاحب نے فرمایا کہ القرہ ہی تو تھا، اچھا یہ لیجئے غالب و داغ کی شان میں گستاخی۔ یوں تو اوروں کی بھی غزلیں ہیں۔

ہو تناسب میں مکمل تو جمال اچھا ہے ہو توازن میں جو کامل تو جلال اچھا ہے
یہ زمانہ ہے طلسمات کا جال اچھا ہے پھر بھی سب کو یہی فانوسِ خیال اچھا ہے

(ذرا سی یہ بیچ میں عربی آگئی)

صِبغَۃُ اللّٰہ کے خوش رنگ سراپردوں میں ڈوب کر رنگ جو نکلے تو کمال اچھا ہے
گرتے پڑتے درِ محبوب تک آپہنچے ہیں کام ہو جو کوئی فرخندہ مآل اچھا ہے
دستِ قدرت نے بنایا انہیں سرکارِ وجود ان کی ممکن نہیں کوئی بھی مثال اچھا ہے
ماضی و حال پہ کردار کی تعمیر کرو حال اچھا ہے تو جانو کہ مآل اچھا ہے

(اور آخری شعر میں محض شاعری کی ہے کہ)

شاعری نام ہے اسلوبِ ادا کا پھر بھی شعر اچھا ہے وہ جس میں کہ خیال اچھا ہے
وہ پریشان و پشیمان سے نظر آتے ہیں اب تو شاید یہی کہنا ہے کہ حال اچھا ہے

غزل ختم کرتے ہی فرمایا: "اچھا واقعی جب سے القرہ سے آیا ہوں غزل کی دُم بھی نہیں کہی۔ وہاں مرزا رشید تبسم صاحب جن کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کی وجہ سے شاعری ہوتی تھی یعنی وہ طرحی مشاعرے کراتے تھے۔ خود واقعی بہت اچھا کہتے تھے۔

اس کے بعد مائیکروفون جناب صبا کے سامنے آیا۔ انہوں نے تین غزلیں سنائیں، پھر جناب خورشید فرید آبادی کی باری آئی۔ اس کے بعد راقم الحروف نے دو تین چیزیں اصلاح کیلئے پیش کیں۔ پھر محسن احسان کی باری آئی اور ان کے بعد پھر محترم فاروقی صاحب نے اپنا کلام اس تمہید کے بعد عنایت فرمایا، ہاں شبیر صاحب، خانہ پری کیلئے۔ مومن کی زمین ہے:۔

تمہارے لطف میں بیشک کوئی کمی تو نہیں
دلِ فسردہ میں لیکن وہ تازگی تو نہیں
ہلے نہ ہونٹ یہ اظہار مدعا معلوم
نظر نظر سے ملی ہے یہ خامشی تو نہیں

مجنوں پہ جان بھی دیتے ہو خوف حشر بھی ہے
خلوص جس میں نہیں ہے وہ بندگی تو نہیں
ہزار کعبے سے ہو آئے حضرت واعظ
بتوں کے ذکر کی عادت مگر گئی تو نہیں
خرد نے چاند کو تسخیر کر لیا لیکن
مقام زیست نہ پایا یہ آگہی تو نہیں
ہر ایک گام پہ ہے تجھ پر غیر کا احسان
یہ موت ہے تری غیرت کی زندگی تو نہیں
ترے عمل میں سے ہے مضمر جہانِ نو کی اُمید
کشادکار کی راہیں رکی ہوئی تو نہیں
وہاں تو سب کیلئے فیض عام ہے طاہر
تمہارے صدق میں دیکھو کوئی کمی تو نہیں

یہ اس گھریلو مشاعرے میں فاروقی صاحب کی آخری غزل تھی اُسکے بعد خورشید فریدآبادی اور جناب صباؔ اکبرآبادی نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں اور اس طرح یہ محفل اختتام کو پہنچی۔ خورشید صاحب اور صباؔ صاحب تو بفضل خدا اب بھی بقید حیات ہیں پھر کبھی کسی محفل میں ان دونوں کا کلام سُنا جا سکتا ہے۔ فاروقی صاحب داغِ مفارقت دے گئے، لیکن اُنکی آواز، اُنکے شعر اُنکے لطیفے، اُنکے قہقہے اب بھی گوش تخیل میں گونجتے ہیں اور ایک حد تک اس خلا کو پُر کر رہے ہیں، جو اُن کے جانے سے پیدا ہو گیا ہے۔

اطہر فاروقی
شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج
گجرانوالہ

والدِ محترم

وہ ایک منحوس صبح تھی۔ طبیعت رات بھر بےچین رہی تھی۔ کئی دفعہ سوتے سے آنکھ کھلی۔ عجیب سی ہڑکل تھی۔ ہر دفعہ لاحول پڑھ کر سونے کی کوشش کی تھی مگر وحشت تھی کہ طبیعت پہ سوار تھی۔ ابھی کالج پہنچا ہی تھا کہ چپڑاسی نے آکر اطلاع دی کہ آپ کا ٹیلیفون آیا ہے۔ ٹیلیفون کا نام سنتے ہی بےچینی اور بڑھ گئی۔ دھڑکتے دل سے دفتر پہنچا اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ فون پر پشاور سے اطلاع دی گئی کہ والد صاحب رات کو سوتے میں ہم سب کو تنہا چھوڑ گئے۔ اتنی دور چلے گئے کہ جہاں سے کوئی بھی کبھی واپس نہیں آیا۔ کیا کہوں کسی طرح یقین نہیں آیا۔ سوچا ابھی پرسوں ہی تو پشاور سے واپس آیا ہوں۔ وہ تین دن ہسپتال میں داخل رہے تھے۔ اور پھر ہم ان کو ۱۸ ستمبر کو گھر واپس لے آئے تھے۔ وہ بظاہر ٹھیک تھے۔ بلڈ پریشر اور شوگر دونوں نارمل ہوگئے تھے۔ صرف کمزوری تھی تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائیگی۔ یہ کسے خبر تھی کہ دم آخر آ پہنچا ہے۔ چراغ کی لو بجھنے سے پہلے ایک بار ضرور ٹمٹماتی ہے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ پھر حواس مجتمع کر کے چلنے کا سوچا تو شام تک پشاور پہنچنے کی کوئی ترکیب نظر نہ آئی۔ بہرحال خدا کی مہربانی سے عین اس وقت گھر پہنچ گیا جب جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ وہ بھی ایک عجیب منظر تھا۔ ہماری دادی صاحبہ جنازے کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔ رات بھر اور پھر دن بھر رونے کے بعد بھی اُن کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ برابر یہی کہے جا رہی تھیں، "ارے اِسے مت لیجاؤ۔ مجھے لیجاؤ۔ اس کا ابھی وقت نہیں آیا۔" گلی میں لوگ ہی لوگ تھے۔ برابر عزیز اظہر جس کو طیارے سے کراچی سے آنا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی پہنچا۔ شکر ہے اس دن کراچی کی پرواز لیٹ نہ تھی۔ ورنہ ہم دونوں کو آخری بار نہ دیکھنے کا قلق ساری عمر رہنا۔

مجھے اب بھی یہ بات اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ۱۸ ستمبر کی رات

کو ہسپتال میں میں ان کے ساتھ رہا تھا۔ انہیں اپنے آرام کی نہیں، فکر یہ تھی کہ میں کہاں سوؤنگا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ آپ میرے سونے کی فکر نہ کریں مجھے نیند نہیں آرہی لیکن جب تک انہوں نے میرے سونے کا بندوبست نہ کر دیا خود نہ سوئے۔ پھر سوتے سے اُٹھے۔ شاید بارہ کا عمل ہوگا۔ بولے تمہیں یاد ہے۔ لیکن تمہیں کہاں یاد ہوگا تم تو اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ وہ فلاں لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ بارات ابھی رخصت ہو کر گھر سے چند میل ہی گئی ہوگی کہ لڑکی کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ بڑی بی ایک عرصے سے بیمار تھیں۔ صرف اپنی بچی کی رخصتی کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے جواب دیا۔ جی ہاں مجھے یاد ہے۔ بولے۔ اب میرے بھی سارے فرائض پورے ہو چکے ہیں۔ مجھے بھی اب چلا جانا چاہیئے (برادر خورد طیب فاروقی کی شادی ۹ ستمبر کو ایبٹ آباد میں کی تھی) یہ سنکر میں چونک اٹھا۔ میں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہاں وہ تیس سال پرانی بات اور کہاں آپ کی یہ عارضی بیماری۔ ان دونوں واقعات کا آپس میں کیا تعلق۔ ان کو مت جوڑیئے۔ آپ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ یہ سنکر حسب عادت خوب زور کا قہقہہ لگایا۔ جیسے کہہ رہے ہوں میاں میں خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن پھر کچھ کہا نہیں۔ اور لیٹ گئے۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ ان کو ہونے والے واقعے کا علم ہے۔ بتانا نہیں چاہتے کہ ہم لوگ پریشان ہوں گے۔

اب لکھنے بیٹھا ہوں تو ذہن میں پرانی یادوں کی ایک یلغار ہے۔ قسم قسم کی باتیں یاد آرہی ہیں اور ہر ایک کا تقاضا ہے کہ پہلے اسی کو لکھا جائے۔

ان کا دل ہر ایک کی محبت سے سرشار تھا۔ اور یہ بات دوستوں اور عزیزوں تک ہی محدود نہ تھی۔ وہ ہر ایک کے مخلص اور دردمند دوست تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کی خدمت کرنا تھا۔ دامے، درمے، سخنے جس طرح بھی ممکن ہو وہ دوسروں کی مدد کے لئے ہر دم تیار رہتے تھے۔ ان کی دونوں آنکھوں میں ۱۹۶۲ء میں موتیا بند اترا تھا اور اس کا بہت کامیاب اپریشن امریکن مشن ہسپتال ٹیکسلا کے ڈاکٹر کرسٹی نے کیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کرسٹی کی قابلیت اور حسنِ اخلاق سے اتنے متأثر ہوئے تھے کہ اپنے ان سارے دوستوں اور عزیزوں کو جن کو آنکھوں کی کوئی بھی شکایت لاحق ہوئی، اصرار کرکے بلاتے (حتیٰ کہ کراچی اور ڈھاکہ جیسے دور دراز شہروں سے لوگوں کو بلایا) ان کے ساتھ خود

ٹیکسلا جاتے۔ وہاں رہتے اور ان کی تیار داری کرتے۔ کالج اور یونیورسٹی کے بہت سے طلبا ایسے تھے، جن کی فیس اور کتابوں کا خرچ وہ برداشت کرتے تھے۔ عزیزوں اور غیروں میں کئی ایسے تھے جن کو ماہ بہ ماہ ان سے مالی امداد پہنچتی تھی۔ وہ اردو علم و ادب کا ایک بہتا سمندر تھے جس سے ہر وہ شخص جس کا جی چاہے حسب توفیق فیض یاب ہو سکتا تھا ایسے بہت سے طالب علم تھے جنہوں نے ملازمت کے دوران ان کے مشورے اور مدد سے السنۂ شرقیہ کے امتحان پاس کئے۔ پھر یونیورسٹی میں آئے اور ان ہی کے مدد سے ڈگری لی۔ اور آج اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔

ان کے ملنے والوں میں چپڑاسی سے لیکر کمشنر اور اس سے اوپر تک کے لوگ تھے۔ وہ انسان کی دُنیاوی حیثیت پر کبھی نہ گئے۔ ان کا سلوک سب کے ساتھ یکساں تھا۔ مجھے یاد ہے، ان کے جاننے والوں میں ایک صاحب کالو خان تھے (جن کو عرف عام میں سب لوگ گلو بھائی کہتے تھے) یہ صاحب ریلوے میں چوکیدار تھے۔ اور معلوم نہیں والد صاحب سے انکی رسم و راہ کیسے ہو گئی تھی۔ وہ آتے اور کئی کئی گھنٹے گپ لگاتے۔ والد مرحوم نے ان کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ان کا اپنا وقت بہت قیمتی ہے اور کالو خان صاحب کو اب چلا جانا چاہئے۔ یہ بھی یاد ہے کہ کالو خان صاحب بیمار پڑے تو والد مرحوم نے ڈاکٹروں سے کہہ سنکر انکا بہترین علاج کروایا۔ اور ان کو یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ تنہا ہیں۔

یوں تو والد مرحوم کی ساری زندگی اُردو زبان و ادب کی خدمت کرتے گذری۔ مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ جو بلاشبہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ "جامعہ اُردو آگرہ" کی تاسیس ہے۔ جامعہ اُردو آگرہ ایک اُردو یونیورسٹی تھی جس کو وجود میں لانے کے لئے والد مرحوم نے سر توڑ کوشش کی تھی اور بالآخر کامیاب ہوئے تھے۔ اس کا قیام ۱۹۳۹ میں عمل میں آیا تھا۔ والد گرامی اسکے مؤسس اور اعزازی رجسٹرار تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہی بلا شرکت غیرے اس کے کرتا دھرتا تھے۔ (یوں اگرچہ کہ کچھ اور چھوٹے بڑے نام بھی کاغذ کے زینت تھے) جامعہ اُردو ایک امتحانی ادارہ تھا۔ جس کے سالانہ تین امتحان ہوتے تھے۔ ادیبہ (میٹرک) ادیب ماہر (ایف اے) ادیب کامل (بی اے)۔ (قیام پاکستان کے وقت تک راجپوتانہ بورڈ اجمیر، الہ آباد بورڈ۔ علی گڑھ۔ آگرہ۔ اور لکھنؤ یونیورسٹیوں نے اسے تسلیم کرلیا تھا۔) طلباء

ان امتحانوں کو پاس کر کے اور مزید صرف انگریزی میں میٹرک۔ ایف اے اور بی اے (علی الترتیب) پاس کر کے میٹرک۔ ایف اے اور بی اے کی سند لے سکتے تھے۔ جامعہ اُردو کا دفتر آگرہ میں ہمارے گھر میں تھا۔ سارا کام والد صاحب خود کرتے تھے، گو ان کی مدد کے لئے ایک جزوقتی کلرک بھی تھا۔ پورے نو سال انہوں نے اس کو اپنا خونِ جگر پلا کر ایک توانا اور مضبوط ادارہ بنا دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہم لوگ پاکستان چلے آئے تو یہ ادارہ والد صاحب نے علی گڑھ منتقل کر دیا۔ جہاں اس کا اب اپنی عمارت ہے اور باتنخواہ بیشمار عملہ ہے۔ امتحانی مراکز کی تعداد اب بھارت بھر میں سات سو سے زیادہ ہے۔ اور امتحانات میں شرکت کرنے والے امیدواروں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ستر کے قریب ایسے تعلیمی ادارے ہیں جہاں صرف جامعہ اُردو (علی گڑھ) کے امتحانات کی تیاری کروائی جاتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بھارت میں اُردو کی ترقی اور ترویج کے لئے جتنا کام جامعۂ اُردو نے کیا ہے، شاید انجمن ترقی اُردو نے بھی کیا ہو۔

والد صاحب نے ۹ سال بلامعاوضہ جامعہ کا کام کیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ کے کانووکیشن کا خطبہ صدارت پڑھنے کے لئے رجسٹرار جامعہ نے والد گرامی کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی اور وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کو اجازت طلبی کا خط لکھا۔ (وائس چانسلر صاحب نے بخوشی جانے کی اجازت دی) جامعہ اُردو نے زادِ راہ کی پیشکش بھی کی تھی جس کو والد مرحوم نے یہ کہکر مسترد کر دیا تھا، کہ جب میں نے پہلے کبھی جامعہ سے ایک پیسہ نہیں لیا تو اب کاہے کو لوں گا۔ چنانچہ بخوشی اپنے خرچ پر علیگڑھ تشریف لے گئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم جو بعد میں ہندوستان کے صدر بنے اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے والد مرحوم کے اعزاز میں خصوصی عشائیہ دیا تھا۔ اس سفر کی تفصیلی روداد والد صاحب نے "گرد کارواں" میں درج کی ہے۔

علامہ اقبال سے ان کی عقیدت والہانہ تھی۔ وہ ان کو نہ صرف اُردو ادب بلکہ ادب عالم کے آسمان کا ایک جگمگاتا ستارہ سمجھتے تھے۔ ان کی کتاب "سیرت اقبال" اقبال پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب ہے جو جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اور اب تک اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب کی افادیت میں ماہ و سال کی گردش سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اقبال پر ان کے

مضامین کا ایک مجموعہ "اقبال کے افکار" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ خدا پبلشر صاحب کو توفیق دے کہ وہ جلد اسے منظرِ عام پر لے آئیں۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر مرکزی حکومت کی فرمائش پر والدِ مرحوم نے "اقبال اور محبت رسولؐ" لکھی جس کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

وہ شدید مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ اور آنحضرت سے والہانہ محبت تھی۔ کئی نعتیں جو آنحضورؐ کی شان میں کہیں اب ان کی بیاض کی زینت ہیں اور حضرت پیغمبرؐ سے ان کی محبت کی غماز۔ کہا کرتے تھے کہ میرے ترکی جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں سے حج پر جا سکوں اور روضۂ پر حاضری دے سکوں۔ اور یہی ان کی ہمیشہ کی تمنا تھی۔ نماز بڑی باقاعدگی سے پڑھتے تھے رمضان کے روزے بھی ہمیشہ پورے رکھے۔ آخری دو تین سالوں میں البتہ بیماری کے سبب چھوڑ دئے تھے۔ اُن کی خالہ صاحبہ ان کی وفات کی خبر سُنکر باوجود اپنی بیماری اور بڑھاپے کے لاہور سے جنازے میں شرکت کیلئے تشریف لائی تھیں۔ وہ ایک نہایت پہنچی ہوئی بزرگ ہستی ہیں۔ انہوں نے آتے ہی کہا تھا "وہ ایک ولی تھا" والدِ محترم کے روحانی کمالات کا احساس تھوڑا بہت ہم جیسے دُنیا داروں کو بھی ہوتا رہا۔ یہاں محض دو واقعات جو خود میری زندگی میں بیتے، بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں F.Sc. کا امتحان دے رہا تھا۔ فزکس میرا سب سے کمزور تھا۔ پہلا ہی پرچہ اتنا خراب ہوا کہ کامیابی کا خواب ادھورا رہتا نظر آیا۔ چھتیس نمبروں میں سے بمشکل دس نمبر کا پرچہ صحیح ہوا تھا۔ گھر آیا تو والد صاحب نے پوچھا "پرچہ کیسا ہوا؟" میں نے روداد بیان کی اور اس یقین کا اظہار کیا کہ اب پاس ہونا ناممکن ہے۔ وہ مسکرائے اور بولے۔ ابھی تو دوسرا پرچہ باقی ہے۔ اس کی تیاری کرو۔ میں نے عرض کیا کہ فزکس میں مَیں پہلے ہی بہت کمزور ہوں صرف ایک پرچے کے بل بوتے پر پاس ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بولے تم فکر مت کرو۔ تیاری کرو۔ خدا بہتر کریگا۔ چار دن بعد فزکس کا دوسرا پرچہ تھا۔ جو بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی اور بالکل معجزہ لگتی ہے وہ یہ ہے کہ پرچے میں کُل چودہ سوال تھے اور خدا کے فضل سے مجھے سب آتے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا دوبھر ہوگیا تھا کہ کونسے چھ سوال کروں اور کون سے چھوڑ دوں۔

اس دوسرے پرچے میں اچھے نمبروں کی بدولت میں F.Sc. میں پاس ہوگیا تھا۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے، جس کا تعلق کھیل سے ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں کرکٹ بہت کھیلی۔ میں جب فورتھ ائیر میں آیا تو کالج ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔ University inter college cricket championship. کے فائنل میچ میں ہمارا مقابلہ ایڈورڈز کالج کی ٹیم سے ہوا۔ ہماری ٹیم مخالف ٹیم سے بہت اچھی تھی۔ مگر اُس دن نہ جانے کیا ہوا کہ پہلی اننگز میں ساری ٹیم بہت کم اسکور پر آؤٹ ہوگئی۔ کچھ ہمارے کھلاڑی خراب کھیلے اور کچھ امپائر حضرات نے غلط فیصلے دئے۔ ایڈورڈز والوں نے پہلی اننگز ہی میں کوئی اسّی رن کی برتری حاصل کرلی۔ اور ان کی جیت کے امکانات بہت روشن ہوگئے۔ میں شام کو گھر آیا تو طبیعت انتہائی پژمردہ تھی۔ والد صاحب نے میچ کا حال پوچھا۔ میں نے بتایا کہ اب جیتنا ناممکن ہے۔ فرمایا ہمّت نہیں ہارا کرتے۔ ابھی تو دوسری اننگز باقی ہے۔ میں نے کہا مجھے میچ ہارنے کا افسوس تو ہوگا ہی۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہوگا کہ لوگ کہیں گے کہ اطہر کی کپتانی کے زمانے میں اسلامیہ کالج کی ٹیم فائنل میچ ہاری تھی۔ (لڑکپن کی سوچ بھی کتنی احمقانہ ہوتی ہے) بولے کوئی بات نہیں خدا بہتر کرے گا۔ دوسری اننگز میں ہمارے کھلاڑی خوب جم کر کھیلے۔ میری اور برادرِ عزیز مطہر کی شراکت میں کافی رن بنے اور ٹیم نے خاصا بڑا اسکور بنایا۔ ایڈورڈز والوں کا دوسرا اننگز میں وہی حشر ہوا جو پہلی اننگز میں ہمارا ہوا تھا۔ اور وہ بہت تھوڑے اسکور پر آؤٹ ہوگئے۔ اور ہم نے میچ جیت لیا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ یہ دونوں کامیابیاں والدِ گرامی کی "نظرِ کرم" کا نتیجہ تھیں ورنہ دونوں دفعہ حالات نہایت ناسازگار تھے۔

انہیں قوالی سننے کا بہت شوق تھا۔ آگرہ میں تو مستقل ایک قوال ہی کو گھر پر رکھ لیا تھا (ویسے وہ صاحب پیشہ ور قوال نہ تھے۔ غالباً میونسپل کمیٹی میں ملازم تھے اور شوقیہ قوالی بھی گا لیتے تھے۔) اور ہر دس بارہ دن بعد قوالی کی محفل آراستہ ہوا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے والد صاحب قبلہ کو نعت سُنکر کبھی کبھی حال بھی آجاتا تھا اور وہ سر کو بُری طرح پٹکنے لگتے تھے۔ ایسے وقت میں قریب بیٹھے ہوئے لوگ ان کے آگے گاؤ تکیہ رکھ دیتے تھے تاکہ چوٹ نہ لگے۔ پشاور آکر بھی قوالی کی محفلوں میں شرکت

کرتے تھے۔

اُستاد محترم ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب مرحوم ہر سال جنوری کے مہینے میں اپنے دولت خانے پر یوم رومی کا اہتمام کرتے تھے۔ اور بہت اعلیٰ قوالی کا انتظام ہوتا تھا۔ ان قوالی کی محفلوں میں والد مرحوم کی شرکت لازمی قرار پائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت پہلے سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے دولت خانے پر بھی بہت سی قوالی کی محفلوں میں شرکت یاد ہے

شعر کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور خود بھی اچھا شعر کہہ لیتے تھے۔ آگرہ میں سینٹ جانس کالج کا سالانہ مشاعرہ بڑا شاندار ہوا کرتا تھا اور اس میں شرکت کرنے بڑے بڑے شعراء آتے تھے۔ یہ بھی ایک دستور سا بن گیا تھا کہ جس رات سینٹ جانس کالج میں مشاعرہ ہوتا تھا اس سے اگلے دن ان میں سے چیدہ چیدہ شعراء ہمارے ہاں مدعو ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ دن میں ہوتا تھا۔ اکثر سارا دن نشست رہتی۔ جاں نثار اختر۔ شکیل بدایونی۔ نخشب جارچوی۔ راز مرادآبادی۔ شعری بھوپالی۔ محشر بدایونی اور ساغر نظامی وغیرہ کو میں نے گھر کے ان مشاعروں میں سُنا۔ (میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا اور ان شعراء کے نام بعد میں پوچھنے پر معلوم ہوئے) والد مرحوم کے ایک شاگرد ہیں ڈاکٹر مغیث فریدی (آجکل شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں) وہ خود بڑے اچھے شاعر تھے۔ اور زمانہ طالب علمی میں فی البدیہہ شعر گوئی کے مقابلوں میں اول انعام پاتے تھے۔ وہ مزاحیہ قسم کی غزلیں لکھ کر مجھے دیتے اور میں ان کو ترنم سے مشاعروں میں پڑھتا تھا۔ میری عمر اس وقت کوئی آٹھ نو برس ہوگی۔ آگرہ میں ان دنوں مشاعروں کا بڑا رواج تھا۔ ایک دو مشاعروں میں جو میں نے مغیث صاحب کی لکھی ہوئی غزلیں پڑھیں تو پھر تو والد گرامی سے ہر مشاعرہ منعقد کرنے والے کی فرمائش ہونے لگی کہ اطہر میاں کو ضرور لائیے گا۔ والد صاحب عذر بھی کرتے کہ بھئی بچہ ہے، رات بھر کیسے جاگے گا۔ لیکن لوگوں کا اصرار اپنی جگہ قائم رہتا تھا۔ ویسے رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مشاعرہ کے شروع ہی میں مجھ سے غزل سُن لی جاتی اور اس کے بعد میں ملازم کے ساتھ گھر آجایا کرتا تھا۔ سینٹ جانس کالج کا ہال بہت بڑا تھا اور وہاں مائیک ہوتا تھا۔ یہ بھی یاد ہے کہ میں اتنا چھوٹا تھا کہ مائیک تک میرا مُنہ نہیں پہنچتا تھا۔ چنانچہ اکثر گاؤتکئے پر بیٹھ کر غزل پڑھتا تھا۔ مغیث صاحب کی لکھی ہوئی غزلوں کی تعداد پچیس تیس ضرور ہو گئی تھی اور ان کو مولانا حامد حسن قادری صاحب مرحوم نے اپنے دست مبارک سے میری بیاض میں نقل کیا تھا۔ وہ بیاض بھی اب

معلوم نہیں کیا ہوئی۔ اتنا یاد ہے کہ بچپن میں میرے چھوٹے بھائی مقطع میں سے میرا نام نکال کر اور اس کی جگہ اپنا نام شامل کرکے ان غزلوں کو بچوں کے رسالوں "تعلیم و تربیت" اور ہدایت وغیرہ میں چھپواتے رہے۔

والدِ محترم کو ہومیوپیتھی سے بڑا شغف تھا۔ اور اس کے باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر تھے۔ آگرہ میں ایک طبی ادارہ تھا اورینٹل ہومیوپیتھک اسکول۔ یہ ۱۹۲۵ء میں (غالباً) قائم ہوا تھا اور حکومت سے منظور شدہ تھا۔ اب تو خاصا بڑا کالج بن چکا ہے۔ والد صاحب اس کے اوّلین گریجویٹس میں سے تھے۔ اس زمانے میں کالج کا دو سال کا کورس تھا جو انہوں نے اس نمایاں طریقے سے پاس کیا تھا۔ کہ دونوں سال کے امتحانوں میں اول آئے تھے۔ انہوں نے ہومیوپیتھی کی پریکٹس کبھی نہ کی۔ گھر میں ہر قسم کی ہومیوپیتھک دوا موجود رہتی تھی۔ اپنا علاج تو وہ ہومیوپیتھک کرتے ہی تھے گھر کے دوسرے افراد اور جاننے والوں کو بھی دوا دیتے رہتے تھے۔ اچھی خاصی دسترس تھی اور خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی۔ اسلئے محلہ کے لوگ بھی دوا لینے آجاتے تھے۔ ہم لوگ کبھی کبھی مذاق میں کہتے کہ آپ تو یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر اپنا کلینک کھول لیجئے۔ بہت مریض آئیں گے۔ جواب میں صرف مسکرا دیتے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کو گردے میں پتھری کی شکایت ہوئی۔ اور تین دن میں یہ حال ہوگیا کہ کمزوری کی وجہ سے آدھے رہ گئے۔ بعض احباب نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ اور پشاور CMH کے کسی بڑے ڈاکٹر کا نام لیا۔ لیکن انہوں نے ہسپتال جاکر اپریشن کرانے کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔ انہیں ہومیوپیتھی پر پورا اعتقاد تھا۔ ان کے دوست پروفیسر درانی صاحب (سابق پرنسپل انجنیرنگ کالج پشاور) خود بڑے اچھے ہومیوپیتھ ہیں۔ انہیں اطلاع کروائی۔ وہ فوراً تشریف لائے اور انہی کے علاج سے مہینہ بھر میں بالکل صحتیاب ہوگئے۔

برج اور شطرنج بہت اچھا کھیلتے تھے۔ اب تو دس بارہ سال سے دونوں ہی کھیل چھوڑ دئے تھے۔ مگر اس سے پہلے ان کھیلوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ مجھ سے چھوٹے دونوں بھائی مطہر اور اظہر بھی شطرنج بہت اچھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے آتی ضرور ہے مگر شوق کبھی نہیں رہا۔ ایک زمانے میں (تقریباً بیس سال پہلے) یہ تقریباً روز کا معمول بن گیا تھا کہ سہ پہر کو سو کر اٹھتے تو مطہر یا اظہر سے شطرنج کی ایک دو بازیاں ہوجاتیں ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ یہ دونوں لڑکے گھر پر نہ تھے۔ مجھ سے بولے آؤ آج تم سے ایک بازی ہوجائے۔ میں نے بہت رسّی تڑائی اور

بہت حیلے بہانے کیئے۔ مگر کچھ پیش نہ گئی۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ بیٹھنا پڑا۔ بساط بچھائی گئی مہرے جنے گئے۔ میں چونکہ زبردستی پکڑا گیا تھا۔ اس لئے میں نے کوشش کی کہ جلد سے جلد بازی ختم ہو اور جان چھوٹے۔ چنانچہ وہ جو شطرنج کا طریقہ ہے کہ کھیل کے آغاز میں پہلے قلعہ بنایا جاتا ہے۔ اور بادشاہ کو اس میں حفاظت سے بٹھاکر مزید پیش قدمی پر غور و خوض شروع ہوتا ہے۔ تو میں نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی اور اوندھے سیدھے جو بھی مہرہ سامنے آیا نتائج کی پرواہ کیئے بغیر مارنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی اناڑی کا وار بھی صحیح پڑجاتا ہے تو اتفاق ایسا ہوا کہ والد صاحب کے کئی مہرے میرے اس اناڑی پن کی نذر ہوگئے۔ اور انہیں مات ہوگئی۔ اپنی اس اچانک اور قطعاً غیر متوقع شکست پر خوب ہنسے اور بولے۔ تم بالکل اناڑی ہو۔ تمہیں مطلق کھیلنا نہیں آتا۔ کہیں ایسے کھیلا کرتے ہیں۔

برج کا لطیفہ بھی خوب ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایف اے کے زمانے تک تاش کھیلنا ہمارے لئے شجرِ ممنوعہ تھا۔ اور کسی صورت میں بھی تاش کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن ہوا یوں کہ میرے ماموں زاد بھائی امین مفتی آئے اور بولے۔ آؤ برج کھیلیں۔ اس زمانے میں ہم لوگ (میں اور مظہر) بی اے میں پڑھتے تھے۔ اور امین ہمارے کلاس فیلو تھے۔ ہم نے کہا کہ بھئی ہمیں تو برج آتا نہیں۔ بولے آؤ میں سکھاتا ہوں۔ انہیں خود بھی کہاں ایسا بہت سا آتا تھا۔ غرض ابھی وہ سکھا ہی رہے تھے کہ والد صاحب قبلہ یونیورسٹی سے واپس آگئے۔ اب تو صاحب پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ آج بچنا مشکل ہے۔ ان کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے کہا برج کھیل رہے ہیں۔ برج کا لفظ سُن کر ایک دم غصہ کا تاثر چہرے سے غائب ہوگیا۔ بولے تمہیں برج کہاں سے آتا ہے۔ ادھر آؤ میں سکھاؤں۔ پھر انھوں نے کاغذ پر برج کے موٹے موٹے اصول اپنے ہاتھ سے لکھے اور کہا کہ ان کو Cyclostyle کر والو اور اچھی طرح یاد کرو پھر برج کھیلنا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ انہوں نے اپنے ساتھ بٹھا کر کھلایا۔ ان کا اپنا ایک برج گروپ تھا۔ جس کی نشست ہر اتوار کی (اس زمانے میں اتوار کو چھٹی ہوتی تھی) شام کو باری باری سب ممبران کے گھر ہوتی تھی اس دن شام کا کھانا بھی میزبان کے گھر ہی

ہوتا تھا۔ میں ملازم ہوگیا تو چھٹیوں میں جب گھر جاتا ہوتا تو میں بھی اتوار کو ہونے والی ان برج پارٹیوں میں ان کے ساتھ جاتا۔ اور لطف لیتا۔ انہوں نے برج کھیلنے کی اجازت ضروردی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ Stakes کے ساتھ ہرگز نہیں کھیلا کروگے۔

لڑکپن اور جوانی میں انہیں کرکٹ اور ہاکی کھیلنے کا شوق رہا تھا۔ میں نے ان کو یہ دونوں کھیل کھیلتے خود کبھی نہیں دیکھا۔ سُنا ہے اچھا کھیلتے تھے۔ البتہ اسلامیہ کالج پشاور کے اسٹاف کلب میں ٹینس کھیلتے ضرور دیکھا۔ ٹینس شوق سے کھیلتے تھے۔ اور اتنی مہارت تھی کہ اپنے اکثر رفقائے کار کو ہرا دیا کرتے تھے۔

والد مرحوم شروع میں پان بہت کھاتے تھے۔ پھر اپنے برادر عم زاد (اور ہمارے بزرگ) مولانا عابد حسن فریدی صاحب کے انتقال پر ایسا چھوڑا کہ پھر کبھی نہ کھایا۔ مگر تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی تھی اور محض تمباکو کھانا ذرا مشکل کام ہے۔ چنانچہ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ سونف کے ساتھ ملا کر تمباکو کھایا جائے۔ سونف کے ساتھ تمباکو کھانے کی عادت آخر وقت تک رہی۔ الماری میں ایک بڑے سے مرتبان میں گھی میں بھنی ہوئی سونف اور چھالیہ رکھی رہتی تھی۔ اور گھر کا ہر فرد آتے جاتے مٹھی بھر بھر کے کھاتا رہتا تھا۔ گھر کے باہر بھی یہ سونف بہت مقبول تھی۔ والد صاحب کے بٹوے کے دو خانے تھے۔ ایک میں سونف اور دوسرے میں تمباکو ہوتا تھا۔ وہ مزاحاً سونف کو اُردو اور تمباکو کو فارسی کہتے تھے۔ ہر ملنے والا علیک سلیک کے بعد سونف کی فرمائش کرتا۔ پوچھتے اُردو سے شوق کروگے یا فارسی سے؟ یونیورسٹی میں چپراسی سے لیکر وائس چانسلر تک سب ہی ان کی سونف کے دلدادہ تھے۔ وہ دوسروں کو سونف پیش کرتے وقت کہتے کہ بھئی اس سے ہاضمہ درست ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ تو اس کو ہاضمہ ہی کہنے لگے تھے۔ اور فرمائش کرتے کہ جناب فاروقی صاحب ہاضمہ خراب ہو گیا ہے لائیے دوا (سونف) کھلائیے۔ وہ سونف کا بڑا مرتبان جو ان کی زندگی میں کبھی خالی نہیں ہوا تھا اب ان کے جانے کے بعد ہمیشہ کیلئے خالی ہو گیا ہے۔

سُنا ہے شروع زمانے میں سگریٹ بھی پیتے تھے۔ مگر ہم لوگوں نے انہیں سگریٹ بطور عادت پیتے نہیں دیکھا۔ آج سے کوئی پچیس سال پہلے وہ کوئی کتاب لکھ رہے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور یونیورسٹی بند تھی۔ اسلئے یونیورسٹی جانے کی کوئی پابندی

نہ تھی۔ وہ کتاب انہوں نے ایسی لکھی کہ ساری رات کتاب لکھتے تھے اور پھر دن میں چار چھ گھنٹے سوتے تھے۔ رات بھر میں دو پیکٹ Gold flake سگریٹ پی لیتے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جب کتاب ختم ہوئی تو سگریٹ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

نہاری کھانے کا بڑا شوق تھا۔ کراچی جاتے تو وہاں ان کی نہاری کی بہت دعوتیں ہوتیں۔ کراچی میں ان کے بڑے پرانے ملنے والے اور دوست رہتے ہیں۔ ان سے مل کر پرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ وہ فطری طور پر بہت شگفتہ مزاج تھے۔ زندہ دلی اور خوش مزاجی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہر محفل میں وہ جانِ محفل ہوتے ان کے ذہن میں لطائف اور دلچسپ واقعات کا کبھی ختم نہ ہونے والا ایک ذخیرہ تھا جس میں ہر ایک کی دلچسپی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور موجود تھا۔ یہ بات بھی ان میں بہت عجیب دیکھی کہ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بزرگوں میں بزرگ تھے۔ انہیں کسی بھی محفل میں چاہے وہ جوانوں کی ہو یا بزرگوں کی، کبھی بور ہوتے نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ وہ کراچی گئے وہاں جناب حبیب مفتی صاحب (ہمارے ماموں) جناب سید نفیس صاحب اور جناب سید واصف صاحب کے ساتھ ٹیکسی میں کہیں جا رہے تھے۔ چاروں حضرات بچپن کے بے تکلف دوست اور عزیز، چاروں باریش اور ملازمتوں سے ریٹائرڈ۔ ہنسی مذاق کرتے جا رہے تھے۔ جب یہ ہنسی مذاق کا سلسلہ کسی طور ختم نہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور سے نہ رہا گیا۔ اور بولا کہ صاحب میں نے اپنی ساری زندگی میں سفید ڈاڑھیوں والے بزرگوں کو اتنا ہنستے نہیں دیکھا جتنا ماشاءاللہ آپ سب ہنس رہے ہیں۔ بوڑھے لوگ تو چڑچڑے اور بدمزاج سُنے گئے ہیں۔ مگر آپ لوگ تو بہت خوش مزاج ہیں۔ زندگی کی مشکلوں اور پریشانیوں کو ہنس کر جھیل جانے کا فن انہی میں دیکھا۔ وہ کسی بڑی سے بڑی مشکل میں بھی مایوس اور بد دل نہیں ہوتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی ان کی زندگی سے یہی سبق ملتا تھا کہ جوانمردی سے مشکلوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

اور ڈاڑھی کی بات آئی۔ تو اس کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ پاکستان آنے سے پہلے آگرہ میں ڈاڑھی تھی مگر اس میں سفید بال قبل از وقت آ گئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے چھٹی پر پشاور آئے تو اس کو صاف کر دیا۔ (مولانا حامد حسن قادری صاحب مرحوم نے والد محترم کے ڈاڑھی صاف کرنے پر ایک بہت خوبصورت نظم کہی تھی۔ اس کے

کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔ ؎

مشاطۂ الاحنظ قدرت کو تم نے | کیا ریزر سے کلک رخ کو تاراج
یہی تھی مرد مومن کی نشانی! | یہی زینت یہی سہرا یہی تاج
صفائی کی ہوئی کیا صاف تاریخ | خس و خاشاک ڈاڑھی کا نہیں آج

ہم سب اس وقت بچے تھے۔ خوب یاد ہے کہ ان کی شکل دیکھ کر بہت ہنسی آتی تھی۔ اسلئے کہ ہمیشہ ان کو باریش دیکھا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں جب ترکی سے حج کرنے گئے۔ تو وہاں سے ایک بار پھر باریش لوٹے مگر اس دفعہ ڈاڑھی کو صاف کرنے کا خیال تک نہ کیا۔

والد صاحب کی ڈاک کافی زیادہ تعداد میں آتی تھی۔ چار چھ خط آنا روز کا معمول تھا۔ وہ خود بھی بہت خط لکھتے تھے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے کسی کے خط کا جواب نہ دیا ہو۔ مفصل اور فوراً جواب لکھنا ان کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ ان کا خط پورا نیوز بلٹن ہوتا تھا۔ جس میں وہ ساری باتیں اور واقعات جو اُن پر یا عزیزوں پر تازہ تازہ بیتے ہوتے تھے تفصیل سے درج ہوتے تھے۔ خط کا انداز بالکل ایسا تھا، جیسے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہوں۔ خط بہت خوبصورت اور پختہ تھا۔ صفحے کے صفحے لکھ جاتے تھے مگر شین قاف میں ذرا سا بھی فرق نہیں آتا تھا۔ اب ایسے خط کون لکھے گا۔ ان کی ڈاک گھر کے سب لوگ پڑھتے تھے۔ اور اکثر یہ ہوتا تھا۔ کہ ابھی وہ یونیورسٹی سے واپس آئے بھی نہیں ہوتے تھے کہ گھر کے سب لوگ اِن کی ڈاک پڑھکر فارغ بھی ہو گئے ہوتے۔ انہوں نے کبھی اس بات کا بُرا نہ مانا اور نہ ہی کبھی منع کیا۔

خاصے خوش شکل اور وجیہہ تھے۔ رنگ خوب گورا اور جسم متناسب تھا۔ سیاہ اور سلیٹی رنگ کے سوٹ میں بہت سجتے تھے۔ میرے اکثر دوستوں نے جب پہلی بار انہیں اس لباس میں دیکھا تو کہا یار تمہارے والد صاحب تو بالکل ترک یا ایرانی لگتے ہیں۔ بازار سے کپڑا کبھی خود خریدنے نہیں گئے۔ شاید انہیں اچھے بُرے کپڑے کی پہچان نہ تھی۔ والدہ صاحبہ ہی کسی نہ کسی سے بازار سے منگوا لیا کرتی تھیں۔ اور پھر اکثر ان کی اطلاع کے بغیر وہ سلنے کے لئے بھی چلا

جاتا تھا۔ درزی کے ہاں ناپ تو تھا ہی۔ وہ جیسا بھی سی دیتا بہن کر ہمیشہ یہی کہتے بہت فرسٹ کلاس سلا ہے۔ لفظ فرسٹ کلاس وہ بہت خوبصورت انداز سے کہتے تھے۔ ہر وہ چیز جو انہیں پسند ہو، وہ اسے فرسٹ کلاس کہتے تھے۔ یہ ٹائی کیسی ہے؟ کہتے بہت فرسٹ کلاس۔ یہ قمیص کیسی سلی ہے جواب ملتا بہت فرسٹ کلاس۔

یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران یہ دستور رہا کہ جب موسم گرما ختم ہونے کے قریب ہوتا تو غزالہ سے (سب سے چھوٹی بیٹی) اپنی ساری بش شرٹوں اور پتلونوں کا پارسل بنواتے اور پھر اپنے ساتھ یونیورسٹی لے جاتے۔ معلوم نہیں وہاں کس کا پتہ اس پر لکھتے (غالباً کراچی یا حیدرآباد وغیرہ کا پتہ ہوتا ہوگا کیونکہ وہاں سارے سال موسم معتدل رہتا ہے۔ اور ٹھنڈے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں) اور پارسل کو منزلِ مقصود کی طرف روانہ کر دیتے۔ ہمیں کبھی نہ معلوم ہوا کہ ہر سال یہ پارسل کس کس کو جاتے ہیں۔ لطف جب آتا کہ کبھی اپنی کپڑوں کی الماری کھول کر جائزہ لیتے اور پھر نہایت بھولپن اور معصومیت سے کہتے کہ میرے پاس تو کپڑے ہیں ہی نہیں۔ ایسے موقع پر والدہ صاحبہ کبھی کبھی چڑ جاتیں اور کہتیں آپ کپڑے رہنے دیں تو ہوں۔ آپ کو بانٹنے سے کب فرصت ہے۔

جوانی میں سوٹ پہنتے تھے۔ ان کی شروع کی تصویروں میں ان کو سوٹ میں دیکھا ہے۔ پھر ڈاڑھی کی مناسبت سے سوٹ ترک کیا اور شیروانی کی عادت ڈالی۔ پاکستان آکر جب ڈاڑھی صاف کی تو ایک بار پھر سوٹ پہننا شروع کر دیا۔ اور آخر تک سوٹ اور شیروانی دونوں ہی استعمال میں رہے۔

پشاور یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ انقرہ یونیورسٹی صدر شعبہ اُردو ہو کر چلے گئے تھے۔ انہیں تنہائی سے سخت وحشت ہوتی تھی۔ مگر انقرہ گئے تو تنہا ہی جانا پڑا۔ والدہ صاحبہ پشاور چھوڑنے پر کسی طور رضامند نہ تھیں۔ اور ہم لوگ اپنی اپنی ملازمتوں کی وجہ سے ساتھ جانے سے معذور تھے۔ انہیں ترکی بہت پسند تھا اور ترک قوم سے بھی بڑی محبت تھی۔ لیکن تنہائی نے ایسا ستایا کہ تین سال بعد ہی واپس چلے آئے۔ اگرچہ کنٹرکٹ کی رو سے ابھی دو سال اور وہاں رہ سکتے تھے۔ ان کے خط وہاں سے بڑی باقاعدگی سے آتے۔ ہم سب بہن بھائی خط لکھنے میں ذرا چور واقع ہوئے ہیں۔ ہماری طرف سے جواب میں عموماً تاخیر ہوتی جس کی

وجہ سے انہیں وہاں تردّد لاحق ہوتا۔ آخر وہاں سے ایک دفعہ خط میں یہ اشعار لکھے ہوئے آئے تو ہم سب کو بڑی ندامت اور شرمندگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد جواب لکھتے ہیں قدرے باقاعدگی آگئی تھی۔ اشعار یہ تھے ؎

عالمِ غربت میں گھر سے خط اگر آتا رہے
قلبِ مضطر ہجر میں کیسا سکوں پاتا رہے
اور جب ہفتوں نہ گھر کی خیریت معلوم ہو
کیوں نہ ہر اِک کا خیال آ آ کے تڑپاتا رہے

لکھنے پڑھنے کا شوق آخر وقت تک رہا۔ ترکی سے واپس آنے کے بعد فرصت ہی فرصت تھی، یہ فرصت کا وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ "سیرتِ امیرِ ملّت" اور" اقبال اور محبت رسولؐ" اسی آخری زمانے کی تصنیف ہیں۔ علی الصبح اٹھنے کی عادت تھی۔ نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں اخبار پڑھتے بیٹھ جاتے۔ پھر اس کے بعد وہیں لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے والدہ صاحبہ چائے کی پیالی بنا کر لاتیں۔ ذیابیطس کی وجہ سے چینی تو ڈالتے ہی نہ تھے۔ رکھے رکھے جب ٹھنڈی ہو جاتی تو پی لیتے۔ پھر وہیں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر کچھ دیر کو سو جاتے۔

انہیں اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں سے بڑی محبت تھی۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر بیقرار ہو جاتے۔ انہیں خوب پیار کرتے۔ گپ شپ لگاتے اور بازار سے کھانے پینے کی چیزیں لا کر دیتے۔ ہم لوگوں سے اپنی محبت کو انہوں نے کبھی ظاہر نہ کیا تھا۔ اور نہ ایسے لوٹ کر پیار کیا تھا۔ جیسے اپنے بچوں کے بچوں کو کرتے تھے۔ زندگی کے آخری دن بھی شام کو وفات سے چند گھنٹے قبل گلگونہ (نواسی) سے خوب باتیں کی تھیں۔ گلگونہ کو بحث کا بہت شوق ہے۔ کسی مذہبی مسئلے پر اپنے نانا سے سوال جواب کر رہی تھی۔ اور وہ بڑی محبت سے اسے ساری بات سمجھا رہے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی اس بچّی سے آخری بات چیت ہے۔ اور پھر اس کا موقع کبھی نہیں آئے گا۔ رات ۹ بجے کے قریب یہ کہہ کر لیٹ گئے کہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ ۹½ بجے والدہ نے دوا دینے کے لئے جگانا چاہا تو ہاتھ ایک طرف ڈھلک گیا۔ ۹ اور ۹½ کے درمیان وہ کسی وقت خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے۔" ایسے سوئے کہ پھر سحر نہ ہوئی"۔ جانے والے کبھی لوٹ کر

تھوڑی آتے ہیں مگر یہ کیسی جدائی ہے کہ دل کو ان کے چلے جانے کا کسی طرح یقین نہیں آتا۔ بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی کہیں سے آجائیں گے۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہیں گے۔ " اچھا تو یہاں سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے ہیں اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں"۔ لوگ چلے جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے سسکتی یادیں چھوڑ جاتے ہیں جو کسی طرح چین نہیں لینے دیتیں۔ ہمیشہ چیز کو کھو کر اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ سر پر جب تک ان کا سایہ تھا زندگی کی دھوپ کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ ہم سب مطمئن تھے کہ وہ ہیں اور ہمارے لئے دعا کر رہے ہیں اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد ایک ایسے عدم تحفّظ کا احساس ہونے لگا ہے جس سے ہم پہلے نا آشنا تھے۔ میں آخر میں اپنے عزیز دوست محسن احسان کے وہ اشعار نقل کرتا ہوں جو انہوں نے والدِ محترم کی وفات کے دن ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہونے والے تعزیتی پروگرام میں پڑھے تھے۔

"اب اُس آواز کو ترسیں گے میرے دیدہ و دل
چاک پیراہنِ جاں جس سے کبھی سِلتا تھا
وہ شجر ٹوٹ گیا جس کے گھنے سائے میں
مجھ سے کتنوں کو بصیرت کا سبق ملتا تھا"

پروفیسر نسیم حسین اختر
لکچرر گورنمنٹ کالج برائے خواتین ۔ مانسہرہ

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

چند یادیں

فاروقی صاحب جیسی ہمہ گیر و بے نظیر شخصیت کو پیرایۂ الفاظ میں پیش کرنا مجھ ناقص العلم کے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ لیکن "خیابانِ فاروقی" میں جگہ پانے کی سعادت حاصل کرنے کا شوق بار بار اُن یادوں کو سمیٹنے پر مصر ہے۔ جو قبلہ طاہر فاروقی سے وابستہ ہیں ـــ یادیں تو اَن گنت ہیں جنہیں پندرہ سولہ سالوں کی دھول بھی دھندلا نہیں سکی۔ مگر یادوں کے اس خزانے میں سے کچھ یادوں کی مہک میں اپنے دل و دماغ تک محدود رکھنا چاہوں گی ۔ کیونکہ میرے خیال میں دوسروں کے نزدیک شاید نہ وہ اہم ہوں اور نہ اُن میں کسی دلچسپی کا سامان ہو۔ مگر میرے لئے وہ بہت اہم بھی ہیں اور بے حد عزیز بھی۔ میں اور میرے میاں اکثر "گاہے گاہے باز خواں آں قصۂ پارینہ را" کے مصداق اُن کے تذکرے سے محظوظ ہوا کرتے ہیں۔

میں فاروقی صاحب کو اپنا اُستادِ محترم ہی نہیں بلکہ مربی و رہنما بھی سمجھتی ہوں اس لئے کہ انہوں نے نہ صرف علم و ادب کے میدان میں بلکہ میری نجی زندگی کے خارزار میں بھی اکثر مجھے راہ سجھائی۔ جو میرے خوشگوار مستقبل کی ضامن بنی۔ اُن کے تصور کے ساتھ ہی میری چشمِ تخیل کے سامنے اس راہب کا سراپا ابھر آتا ہے۔ جو قندیل لئے بیابان کی شبِ تاریک میں بھولے بھٹکوں کو راہ دکھاتا پھرے۔

فاروقی صاحب کے اسم گرامی سے میرے کان اس زمانے میں آشنا ہوئے جب میں ابھی پانچویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھی۔ اور پشاور کے الزبتھ ہائی سکول میں محسنہ فاروقی کی ہم جماعت تھی۔ عرصۂ دراز کے بعد شعبۂ اُردو میں داخلہ لینے پر فاروقی صاحب سے متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا تو محسنہ کے والد خود میرے محسن بن گئے۔ میری زبانی یہ جان کر کہ میں ان کی دخترِ عزیز کی ہم جماعت رہی ہوں فاروقی صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور بعد میں اس

ہم جماعتی کے ناتے ہمیشہ مجھے اپنی ہی بیٹی ہونے کا احساس دیا۔ میں ہی کیا شعبۂ اُردو میں داخلہ لینے والی ہر لڑکی اُن کی بیٹی تھی۔ مگر میں نے اُن کی بیٹی کی ہم جماعتی کا حوالہ اس لئے دیا کہ میرے ساتھ جب بھی فاروقی صاحب کی گفتگو ہوئی اُنہوں نے محسنہ اور اسماء کا ذکر اکثر کیا۔ جو شادیوں کے بعد اپنے اپنے گھر شاد و آباد تھیں۔

میرے تصور کے جو کھٹے میں فاروقی صاحب کی بے شمار تصویریں آویزاں ہیں۔ کہیں بڑے ترنگ میں سودا کا لامیہ قصیدہ پڑھاتے ہوئے۔ کہیں والہانہ انداز سے ذکرِ اقبال کرتے ہوئے۔ کہیں ہماری کسی کوتاہی پر محبت آمیز ناراضگی سے سرزنش کرتے ہوئے کہیں ناصح مشفق کے روپ میں کہیں خوش دلی سے گپ شپ کے موڈ میں۔ کہیں ڈاکٹر مظہر علی خان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے قمر جلالوی کے اشعار پر واہ واہ کرتے ہوئے۔ تو کہیں اپنی کڑک دار آواز سے شعبۂ اُردو کے درو دیوار ہلاتے ہوئے —— یہ سب کی سب تصویریں یکساں طور پر دلکش و دلنواز ہیں۔ کیونکہ ان سب میں جو رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنائیت و یگانگت کا رنگ ہے۔ جو بے اختیار قلب و نظر کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ کہ ہم سب طالبات فارغ اوقات میں دفتر صدر شعبہ کے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی ہوتیں۔ تو ہماری عین خواہش ہوا کرتی تھی کہ موصوف ہمارے پاس آکر بیٹھیں تاکہ ہم اُن کی پُر لطف گفتگو کے ساتھ ساتھ اُن کی بٹوہ نما تھیلی میں سے سونف اور چھالیہ پر بھی ہاتھ صاف کریں۔ ہماری یہ خواہش بیشتر پوری ہو جایا کرتی تھی۔ فاروقی صاحب بڑی فراخدلی سے تھیلی ہماری جانب بڑھا دیتے اور ہم تبرکاً اُس میں سے اپنا حصہ لے لیتے اور کبھی جو موڈ شوخی کا ہوتا تو کوئی وقتوں کا کوٹہ اُڑا لیا کرتے۔ صدر شعبہ ہونے کے باوجود وہ ہم سے بہت گھل مل کر باتیں کیا کرتے تھے۔ دورانِ گفتگو ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ مزے مزے کے چٹکلے اپنی کتاب زیست کے صفحات میں سے نکال کر ہمیں سناتے۔ اُن کے لب و لہجے میں کچھ ایسا خلوص اور اُنسیت ہوتی کہ ہم طالبات اپنے تمام مسائل بغیر ہچکچاہٹ کے اُن کے سامنے رکھ دیتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ طالبات کی مشکلات کا انہیں خود بھی احساس رہتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ احساس بچوں کو انگلی سے پکڑ کر چلانے کے مترادف ہوتا۔ سالِ آخر کے امتحان کی بات ہے کہ ہمارا زبانی امتحان لینے لاہور سے سید وقار عظیم صاحب تشریف

لائے۔ کئی طالبات کچھ گھبرا رہی تھیں۔ کہ سید صاحب کو کبھی دیکھا نہیں۔ اُن کے سامنے بولتے ہوئے کہیں نروس نہ ہو جائیں۔ چنانچہ فاروقی صاحب نے لڑکیوں کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے خود ہی یہ دعوت دی۔ کہ "کل تم لوگ میرے ہاں آجانا سید صاحب وہیں ٹھہریں گے۔ گھر کے ماحول میں اُن سے بات چیت کرلو گی تو کمرۂ امتحان میں اجنبیت محسوس نہیں ہوگی"۔ ہم سب حسبِ ارشاد دوسرے دن اُن کے دولت کدے واقع صاحب سنگھ بلڈنگ پر جا پہنچے۔ اور یوں امتحان سے قبل وقار عظیم صاحب سے ملاقات کے بعد امتحان دیتے وقت کچھ خاص جھجک محسوس نہ ہوئی۔ میری مزید خوش بختی یہ ہوئی کہ سال بھر بعد جب میں نے لاہور میں پبلک سروس کمیشن کا انٹرویو دیا تو ماہرِ مضمون کی حیثیت سے وہاں سید وقار عظیم صاحب کو پایا۔ وہاں بھی میں بغیر کسی دقت کے بولتی رہی۔ اور نتیجۃً پہلے ہی انٹرویو میں منتخب ہوگئی۔

سچ تو یہ ہے کہ طالبات کے ساتھ فاروقی صاحب کا سلوک ترجیحی ہوتا تھا۔ ہم لوگوں کو وہ اکثر اپنی گھریلو تقریبات میں بھی مدعو کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہمیں اُن کے اہلِ خانہ سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوتا رہتا تھا۔ درونِ خانہ کا سادہ اور تکلف و بناوٹ سے پاک ماحول ہمیں اچھا لگتا تھا۔ اُن کے ہاں منعقد ہونے والی ایک تقریب میرے ذہن پر نقش ہے۔ وہ تھی فاروقی صاحب کے نواسے کی رسمِ بسم اللہ۔ جس کی ادائیگی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کیلئے سنہری حروف میں لکھے ہوئے دعوت نامے چھپوائے گئے تھے۔ اور اچھے خاصے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایسی رسم میں شرکت کا میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاں یہ رسم اس انداز اور اس خصوصی اہتمام سے منعقد نہیں ہوتی۔

طالبات سے فاروقی صاحب کے ترجیحی سلوک کے سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ شعبے میں طلباء اور طالبات کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔ فریقین کے درمیان پردہ حائل ہونے کا فائدہ طالبات نے یہ اُٹھایا کہ گھر سے اشعار کے شروع کا ایک ایک لفظ پرچوں پر لکھ لائیں۔ اور خوب زور شور سے لڑکوں کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ جیت لڑکے ہی گئے۔ مگر فاروقی صاحب نے مقابلے کے اختتام پر لڑکیوں کی بھی بہت تعریف کی مگر بعد میں ہمیں چپکے سے کہہ گئے

کہ " تم لوگوں کو میں دیکھ رہا تھا پرچوں کا استعمال جاری تھا۔ مگر لڑکوں نے تو کمال کر دیا۔ محض یاد داشت کے بل پر مقابلہ کرتے رہے۔ تم لوگوں کی عزت کے پیش نظر میں خاموش رہا۔ ورنہ لڑکوں کو پتہ چل جاتا۔ تو تم لوگوں کی کرکری ہو جاتی۔"

فاروقی صاحب مشرقی تہذیب و روایات کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ طالبات کا برقعے میں رہنا انہیں بہت پسند تھا۔ مختلف گھرانوں سے آنے والی طالبات پر وہ اپنی پسند ٹھونسنے سے تو قاصر تھے۔ تاہم اشاروں کنایوں میں اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کلاس میں طلباء اور طالبات کے درمیان پردے کی حد فاصل کھینچنے کے علاوہ شعبے میں طلباء اور طالبات کے آزادانہ میل جول بلکہ رو برو گفتگو کی بھی سختی سے ممانعت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قدغن کے باوجود لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے کتابوں اور نوٹس کا تبادلہ بھی کر لیا کرتے تھے۔ اور موقع ملنے پر بات چیت بھی کر لیا کرتے۔ مگر روایت سے اس بغاوت کے وقت دل میں خوف کے سائے ضرور لہراتے رہتے تھے۔ شعبے کے چپڑاسی ایوب کو خاص طور پر ہدایت تھی کہ وہ چوکس رہے۔ چنانچہ وہ برآمدے اور کمروں میں ہر وقت چکر لگا لگا کر بغاوت کی بو سونگھتا پھرتا۔ پردے کے معاملے میں فاروقی صاحب کی یہ سخت روی اُن دنوں تو یقیناً ہمیں کھلتی تھی۔ کیونکہ اردگرد دوسرے شعبوں کی چہل پہل اور آزادانہ فضاؤں کو دیکھ دیکھ کر ہمیں اپنے شعبے میں گھٹن اور بے رونقی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ مگر آج اُن احتیاطی تدابیر کی افادیت کا کھل کر اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ جوانی کے منہ زور جذبوں کو بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کیلئے ماحول میں کچھ نہ کچھ پابندیاں ہونی چاہئیں۔

اگرچہ شگفتہ مزاجی فاروقی صاحب کا وصف خاص تھی۔ مگر ریشم کی طرح نرم رہنے والے فاروقی صاحب میں ہمیں فولاد کی سختی دیکھنے کا اتفاق بھی بارہا ہوا ہے۔ وہ جمال اور جلال کا مرقع تھے۔ جس دن یہ جلالی روپ جلوہ دکھاتا۔ اس دن پورے شعبے پر موت کا سناٹا طاری رہتا۔ اور کسی متنفس کی مجال نہ ہوتی کہ سرگوشی سے بڑھکر کوئی بات کر سکے۔ فاروقی صاحب کی شخصیت کا یہ بھی قابل ذکر پہلو ہے کہ اُنہیں غصہ آتا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتے۔ ایسے حادثات عموماً

اس وقت رونما ہوتے جب فاروقی صاحب کو کہیں اخلاقی اقدار و ضوابط کی خلاف ورزی نظر آتی ہے ۔ ہم تک پہنچے والی سینہ بہ سینہ روایت کی زبان میں موصوف اپنی "اُردوئے معلیٰ" سے اس شخص کا "عرس" کر دیتے ، جو اُن کے زیرِ عتاب آجاتا ۔ یہ دونوں اصطلاحات اُن کے چاہنے والوں نے وضع کر رکھی تھیں ۔ گویا اُن کے عقیدت مند گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوتے تھے ۔ بلکہ انہیں اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے ۔

فاروقی صاحب ہمارے اندر یہ احساس زندہ رکھنے کی کوشش میں رہتے کہ "تم میں بہت صلاحیتیں ہیں" ۔ اُن کا یہ مثبت انداز شاگردوں کے حق میں تازیانۂ عمل ثابت ہوتا ۔ اور کچھ کر دکھانے کی اُمنگ دل میں بیدار ہوتی ۔ دل شکنی کرنا انہیں نہیں آتا تھا ۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے ۔ مجھے وہ واقعہ اکثر یاد آتا ہے ۔ جب سالِ اول کے امتحان کے پہلے روز افسانوی ادب کے پرچے میں داستانوں کے بارے میں ایک سوال کا جواب میں نے اتنی تفصیل سے لکھا کہ باقی سوالات کیلئے میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ۔ اور میں اُن کے جواب اطمینان بخش طور پر نہ دے پائی ۔ کمرۂ امتحان سے نکل کر اپنی دو ساتھیوں کے ہمراہ سیدھی فاروقی صاحب کے دفتر پہنچی ۔ اور آنکھوں میں آنسو لئے باقی پرچے نہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ وہاں اُس وقت میرے ایک اور محترم اُستاد بھی تشریف فرما تھے ۔ جنہوں نے ہمیں پہلا پرچہ پڑھایا تھا ۔ اِن دونوں صاحبان نے پہلے تو مجھ سے سارے سوالوں کے جواب پوچھے جو میں لکھ آئی تھی ۔ پھر فاروقی صاحب مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے : "بیٹی مجھے اتنا بھروسہ تم پر ہے کہ اگر تم پاؤں کی انگلیوں سے بھی پرچہ حل کر کے آئی ہو تمیں ۔ تو پاس یقیناً ہو جاؤ گی" ۔ اُن کا یہ ارشاد میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا ۔ اگرچہ میری علمی استعداد کے بارے میں یہ مبالغہ آرائی محض میری حوصلہ افزائی کیلئے تھی ۔ اس کا علم مجھے اُس وقت بھی تھا ۔ اور آج بھی ہے ۔ مگر اس فقرے نے میری اتنی ڈھارس بندھائی کہ باقی دونوں پرچے میں نے دلجمعی سے دئے ۔ اور امتحان بہت اچھے نمبروں سے تو نہیں مگر اچھا خاصا پاس کر لیا ۔

ہم نے سکول اور کالج میں سیکھا تھا ۔ کہ خطوط تین قسم کے ہوتے ہیں ، نجی ، تجارتی اور سرکاری ۔ اور یہ بھی کہ سرکاری کاموں کیلئے سرکاری چٹھی لکھی جاتی ہے ۔ چنانچہ ایم ۔ اے کر لینے کے بعد سند منگوانے کیلئے میں نے صدر شعبۂ اُردو کے نام ایک سرکاری چٹھی لکھی ۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد ندامت ہوئی کہ سند کے ساتھ فاروقی صاحب کا عنایت نامہ بھی منسلک تھا ۔

جس میں انہوں نے بڑے دلپذیر انداز سے مجھے اس بات پر ڈانٹا تھا کہ میں ...
طرح سرکاری چٹھی کیوں لکھی۔ تکلف و تصنع انہیں کسی لمحے کسی رنگ میں بھی گوارا نہ تھا۔
کسی کو نیک نیتی سے اچھا مشورہ دینا بھی بڑی بات ہوتی ہے۔ اور ...
تو اکثر اچھے مشوروں اور اچھے گروں سے اپنے ملنے والوں کو نوازتے رہتے تھے۔ ...
مشوروں میں ایک مشورہ وہ بھی ہے جو انہوں نے مجھے ملازمت کے سلسلے میں دیا ...
ملازمت کے سلسلے میں ایک مرتبہ میرا پشاور آنا ہوا۔ تو میں شعبے میں بھی اپنے اساتذہ کرام
سے ملنے چلی آئی۔ فاروقی صاحب دفتر میں موجود تھے۔ احوال پوچھتے رہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پشاور یا جہلم کے آس پاس کہیں ملازمت کروں۔ چاہیے سکول میں ہی کیوں نہ ملے۔ انہی دنوں مجھے میونسپل کالج گوجرہ سے بلاوا آیا ہوا تھا۔ دور افتادہ مقام ہونے کی وجہ سے میں وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ فاروقی صاحب نے سُنا تو مجھے فوراً وہاں جانے کو کہا۔ اور مشورہ دیا کہ "بیٹی جہاں جاؤ گی وہاں سہیلیاں مل جائیں گی۔ دل لگ جائیگا۔ اور پھر گوجرہ میں نے دیکھ رکھا ہے۔ بُری جگہ نہیں"۔ اُن کے حکم کے بموجب میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے گوجرہ چلی گئی۔ جہاں لڑکیوں کا نیا کالج کھلا تھا۔ میرے سوا سب لاہور سے پڑھی ہوئی لڑکیاں تھیں مگر وہاں ایسا دل لگا کہ کچھ عرصہ بعد وہاں سے آتے ہوئے آنکھیں اشکبار تھیں۔ اب سوچتی ہوں کہ اگر فاروقی صاحب حوصلہ نہ دلاتے تو نہ جانے ملازمت کی تلاش میں کتنے برس یونہی بیت جاتے۔

فاروقی صاحب کی محبتوں اور شفقتوں کی فہرست اتنی طویل ہے۔ کہ صفحات کے صفحات سیاہ کرنے پر بھی اُن کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اُن کی جھولی میں نہ جانے محبتوں کا کتنا خزانہ تھا۔ جو وہ اپنے شاگردوں میں بانٹتے رہتے مگر وہ ختم ہونے میں نہ آتا ــــ وہ دوسروں کو دل کے قریب رکھتے تھے۔ تو دلوں کے قریب رہنا بھی جانتے تھے۔ بقول شمیم صبائی :-

"حاضرِ بزمِ جہاں ظاہر ہوئے"

۱۹۷۸ء

لیکن بزمِ جہاں میں وہ آج بھی اپنے شاگردوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

پروفیسر حسین اختر
صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج مانسہرہ

نقش کارِ رنگِ ثبات

ایک شخصی خاکہ

نام طاہر، کردار مطہر — ظاہر حسین، باطن حسین تر — اگر خلوص اور ایثار کی تجسیم عمل میں آجائے تو فاروقی صاحب صورت پذیر ہونگے۔

وہ میرے اُستاد تھے۔ مگر اس رشتے کے تقدس میں دوستانہ اُنس کی آمیزش روزِ اول سے شامل رہی۔ مجھے ابھی تک خوش فہمی ہے کہ میں ان کے عزیز ترین طلباء میں سے تھا۔ ان کے بہت سے دوسرے طلباء بھی شاید اپنے متعلق یہی گمان کرتے ہوں کیونکہ اپنے شاگردوں سے ان کا برتاؤ اکثر و بیشتر ایک سا رہا — باپ کی مانند شفیق اور دوست کی طرح ہمدرد و غمگسار!

فاروقی صاحب کی شخصیت بڑی جاذب اور پرکشش تھی۔ ان سے جس کا ایک بار تعلق پیدا ہوا، ہمیشہ قائم رہا — یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اور میری بیگم دونوں کو فاروقی صاحب کے تلمیذ ہونے کا شرف حاصل ہوا — وقت کا پہیہ کتنی تیزی سے گھوم رہا ہے! اٹھارہ برس پہلے ہم بھی شعبہ اُردو کے طالب علم تھے اور فاروقی صاحب ہمارے اُستاد! — اتنے برس بیت گئے۔ مگر لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو — ایک خوبصورت سا خواب — شبِ گذشتہ کا خواب! — میں اپنی طالب علمی کے ان دو سالوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو شعبہ اُردو میں گذارے۔ کیونکہ اُنہی پر میرے حال کی دیواریں استوار ہوئی ہیں۔

ادبیات کی تدریس کیلئے ضروری ہے کہ پڑھانے والا نہ صرف ترسیل علم کا ذریعہ ہو بلکہ تلامذہ میں صاف و پاکیزہ ادبی ذوق بھی تخلیق کر سکے۔ شاعروں اور ادیبوں کے محض حالات و واقعات بیان کر دینے اور ان کے فن کے بارے میں مستعار تنقید پیش کر دینے سے طلباء کو اچھے نمبروں سے امتحان میں کامیاب کر

صحیح خطوط پر ادبی تربیت ممکن نہیں۔ میرے نزدیک ادبیات کے معلم کا اولین منصب تلامذہ میں ان خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے جو ادب و شعر کی تخلیق کا سبب بنتی ہیں۔ اس اعتبار سے فاروقی صاحب بہترین استاد تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کی اس طرح تربیت کرتے تھے، کہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ دوسروں سے نظریات مستعار لینے کی بجائے اپنی ذاتی پسند و ناپسند کا اظہار بے باکی سے کر سکیں۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہیں وہ طلباء اچھے نہیں لگتے جو امتحان میں تو اچھے نمبر لیکر دکھا دیں لیکن جب چار بھلے آدمیوں کی موجودگی میں کسی ادبی موضوع پر اظہارِ خیال کی زحمت انہیں دی جائے تو وہ بغلیں جھانکتے نظر آئیں۔ وہ ایسے طلباء کو بیحد عزیز رکھتے تھے، جو اپنا زاویہ نظر بیان کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ فاروقی صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ طلباء اظہارِ خیال کرنا سیکھیں۔ اس مقصد کیلئے وہ سیمینار اور مذاکروں کا بکثرت اہتمام کیا کرتے تھے۔ جن کیلئے ہمیں مقالات لکھنے کو بھی کہا جاتا اور تنقید و تبصرہ پر بھی مجبور کیا جاتا تھا۔ اس معاملے میں وہ ڈانٹ ڈپٹ سے دریغ نہ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شروع میں ہم بھی ڈانٹے گئے تھے۔ مگر ایک بار جب مہرِ سکوت ٹوٹی تو پھر فاروقی صاحب کو حدود متعین کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ طلباء تو کجا اساتذہ کے مقالات کے بھی بخیئے ادھیڑنے لگے تھے۔ اور ان اساتذہ میں خود فاروقی صاحب بھی شامل تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ سالِ اوّل کے کسی طالبعلم نے قدیم داستانوں پر کوئی مقالہ سیمینار میں پڑھا۔ سیمناروں کی صدارت عموماً فاروقی صاحب خود ہی کیا کرتے تھے۔ مگر اس روز وہ وائس چانسلر صاحب کے پاس کسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ اور سیمینار کی صدارت ایک اور اُستاد فرما رہے تھے۔ جیسا کہ طلباء عام طور پہ کرتے ہیں۔ اس مقالے میں بھی دیگر مصنفین کی آراء پیرا گراف در پیرا گراف بطور حوالہ مستند نقل کی گئی تھیں ان حوالوں کے بوجھ نے مقالے کو بے حد طویل اور بے ربط بنا دیا تھا۔ لہٰذا اِدھر مقالہ مکمل ہوا اُدھر اعتراضات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جب یہ ہنگامہ عین عروج پر تھا۔ فاروقی صاحب [illegible]

[illegible] تشریف لے آئے۔ اس وقت میں اپنی تنقید پیش کر رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں [illegible] گزری کہ ان کا مزاج ایسا برہم ہوا کہ سنبھلنے میں نہ آتا

تھا۔ جس سختی سے انہوں نے مجھے ڈانٹا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید خاموشی میں ہی اپنی عافیت سمجھتا۔ مگر میں نے انہیں مخاطب کرکے کہا کہ "اُستادِ محترم! آپ چونکہ دیر سے تشریف لائے ہیں اور مقالے کا بیشتر حصہ نہیں سن پائے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ میرے اعتراضات ہرگز بے جا، لغو اور بے ہودہ نہیں ہیں"۔ خوش قسمتی سے اساتذہ نے بھی میری بات کی تائید کردی۔ لہٰذا فاروقی صاحب خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔ اور ہمیں تنقید کرتے سنتے رہے۔ میں اس وقت بہت پریشان تھا کہ فاروقی صاحب کہیں مجھ سے خفا نہ ہوگئے ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد میں کم و بیش خاموش ہی رہا۔ سیمنار ختم ہونے پر میں سر جھکائے باہر آرہا تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ یہ فاروقی صاحب ہی تھے کہنے لگے "تم نے بہت سخت تنقید کی"۔ میں نے عرض کیا کہ یہ خود انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ہنس کر کہنے لگے۔ "وہ تو ٹھیک ہے پر تمہاری تنقید کا انداز کچھ زیادہ ہی معاندانہ ہوگیا تھا"۔

کلاس میں ان کی یہی کوشش رہتی تھی کہ طلباء شعر کے مفہوم کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس سے محظوظ بھی ہوسکیں۔ جب اور جہاں کہیں موقع ملتا وہ ہمارے سامنے اس تہذیبی ماحول کی تصویر کشی کرتے کہ جس میں ہماری شاعری نے جلا پائی۔ شاعری کی دیگر اصناف کے علاوہ قصائد بھی ہم نے انہی سے پڑھے۔ مگر اس طرح کہ قصائد کے بوجھل پن کا انہوں نے بہت کم احساس ہونے دیا۔ سودا کا لامیہ قصیدہ وہ جس لے میں پڑھا کرتے تھے وہ لے ہی اتنی دلچسپ ہوا کرتی تھی کہ ہمیں سُن کر مزا آتا تھا۔

عربی اور فارسی کا علم رکھنے کی وجہ سے ان کا تلفّظ بے مثل تھا۔ اس معاملے میں وہ ہماری صوتی ادائیگی پر بھی پوری توجّہ دیتے تھے۔ جہاں کسی نے تلفظ کی غلطی کی، وہیں اس کی اصلاح کردی۔ خاص طور پر سیمنار میں اس کا بہت موقع ہوا کرتا تھا۔ مقالے کے دوران وہ ایسی غلطیاں نوٹ کرتے جاتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم نے تلفظ کی جس قدر "حماقتیں" کرنی ہیں ان دو سالوں میں کرلو تاکہ اصلاح ہوجائے۔ اس وقت اسمیں شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن کل کو جب تم ایم اے کی ڈگری لیکر عملی زندگی میں آؤگے اور پھر ایسی "حماقتیں" کروگے تو لوگ صرف تم پر نہیں ہنسیں گے بلکہ تمہارے اساتذہ کا بھی مذاق اڑایا جائے گا۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ انہوں نے ہماری اصلاح نہ فرمائی ہوتی تو آج ہم یقیناً نشانۂ تضحیک بنتے۔

فاروقی صاحب کو عمومی اعتبار سے بھی زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ سلاست روانی اور شستگی جیسی میں نے ان کی تقریر میں دیکھی ہے، اور کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ تقریر کرتے وقت ذہنی اور اعصابی تناؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ سامعین کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُن سے الفاظ گر رہے ہیں۔ مگر جنہوں نے فاروقی صاحب کو بولتے سُنا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق فرمائیں گے کہ فاروقی صاحب کی تقریر میں نہ رکاوٹ تھی اور نہ ہی کسی طرح کا عصبی تناؤ۔ وہ ایک شگفتہ بیان مقرر تھے۔

فاروقی صاحب کو حضرت علامہ اقبال سے عشق کی حد تک عقیدت تھی۔ اقبال کا فلسفہ، شخصیت و کردار، شاعری، نظریات ہر چیز کے مداح تھے۔ چنانچہ اقبال پر تنقید پسند نہ فرماتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اکثر بے حد جذباتی ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے موقع پر اُن کا چہرہ غصّے سے تمتما اٹھتا تھا۔ اور ان کا اندازِ گفتگو بے حد جوشیلا اور تند ہوتا تھا، جس سے انکی برہمی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ وہ اقبال کے معاملے میں تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعتراض اگر محض مخاصمت کی وجہ سے نہ کیا گیا ہو تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے سنتے تھے۔ اور اپنے جواب سے معترض کی تسلّی کر دیا کرتے تھے۔ بلکہ اقبال کو پڑھاتے ہوئے انہوں نے خود چند ایک مقامات پر اقبال کے بعض شعری نقائص کی نشاندہی ہمارے سامنے کی تھی ——

—— اقبال کی شخصیت اور فن پر انکی تصنیف "سیرتِ اقبال" حضرت علامہ سے ان کی والہانہ محبّت کا تحریری نقش ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے اقبال پر وقتاً فوقتاً مضامین لکھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب وہ "خیابان" کا پاکستانی ادب نمبر مرتب فرما رہے تھے تو انہوں نے محسوس کیا کہ مقالہ نگار حضرات نے ہر زاویئے سے پاکستانی ادب کا جائزہ مرتب کر ڈالا تھا مگر اقبالیات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اقبالیات پر بہت کچھ شائع ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کا ایک خاکہ سا ترتیب دیا جائے۔ یہ کام انہوں نے میرے سپرد کیا۔ ان دنوں ہمارے امتحانات بہت قریب تھے۔ اور یہ کام بھی خاصا کٹھن طویل تھا۔ نگران کے حکم کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ اس لئے میں نے ایک جائزہ مرتب کیا جو "خیابان" کے پاکستانی ادب نمبر میں "اقبالیات کا خاکہ" کے عنوان سے شامل کیا گیا۔ اس جائزے کی تیاری میں انہوں نے خود بھی میری مدد کی اور بعض مفید مشورے دیئے۔

فاروقی صاحب ہماری روایتی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کے زبردست مؤید تھے۔ شعبۂ اُردو کے معمولات اور اپنی روزمرہ زندگی میں ان قدروں کا مکمل احیا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب تک وہ شعبے کے سربراہ رہے کسی کو ان کے نافذ کردہ اخلاقی ضوابط پر معترض ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

ان کی شخصیت نہایت پروقار اور بارعب تھی۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ انہیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ باوجودیکہ وہ اکثر ہمارے ساتھ بے تکلفی کا رویہ اپنائے رکھتے لیکن ہمیں جرأت نہ ہوتی تھی کہ کوئی ایسی بات کہیں جس سے ان کے اور ہمارے رشتے کا تقدس اور احترام ختم ہو جائے۔ تہذیب اور شائستگی کے دائرے کے اندر رہ کر چھیڑ خانی کا انہوں نے کبھی برا نہ مانا۔ مجھے ایک بار ضروری کام کے سلسلے میں ان کے گھر پر جانا پڑا۔ سہ پہر کا وقت، خیال تھا کہ سو رہے ہونگے مگر کام ضروری تھا۔ گھنٹی بجانے پر ان کے صاحبزادے انور فاروقی باہر آئے۔ میں نے فاروقی صاحب کا پوچھا۔ کہنے لگے "سو رہے ہیں"۔ میں نے عرض کی "کام بہت ضروری ہے آپ جگا نہیں سکتے؟" انور صاحب نے فوراً کہا "ارے صاحب نہیں۔ انہیں جگانا شیر کی مونچھ سے مذاق ہے"۔ محاورے کے اس قدر برمحل استعمال اور پھر فاروقی صاحب کے مقابل شیر کے لفظ نے بڑا مزا دیا۔ ہم دونوں ابھی اس محاورے کے برمحل استعمال سے محظوظ ہو ہی رہے تھے۔ کہ فاروقی صاحب خود تشریف لے آئے۔ مجھے اپنے ساتھ بیٹھک میں لے گئے۔ پوچھا کس بات پر اتنا ہنس رہے تھے؟ — ان کا موڈ خوشگوار پاکر میں نے بات بتا دی۔ محاورہ سُنکر یقین جانئے وہ ہم سے زیادہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔

وہ یوں تو بہت کم غصے میں آتے تھے۔ اور اکثر بڑے سے بڑی بات بھی خندہ پیشانی سے سُن اور سہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن کبھی طیش میں آجائیں تو قیامت برپا کر دیا کرتے تھے۔ مجھے یوں تو کئی بار انکے زیرِ عتاب آنے کی "سعادت" نصیب ہوئی۔ مگر ایک بار تو وہ مجھ پر ایسے برہم ہوئے تھے۔ خیریت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہوا یوں کہ سالِ آخر کے طلباء کو الوداعیہ دینا تھا۔ مجھ سے انہوں نے تقریر لکھ کر لانے کو کہا۔ اور ساتھ ہی تاکید کر دی کہ یہ تقریر کسی کو مت دکھانا۔ میں اگلے روز تقریر لکھ کر لے گیا۔ فرمایا تم کلاس میں میں جاؤ۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں بلا لوں گا۔ میں ابھی کلاس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ

شمشاد صدیقی صاحب جو اس وقت سالِ آخر میں تھے، آئے اور مجھ سے کہا کہ ذرا میں اپنی تقریر انہیں دے دوں تاکہ وہ پڑھ لیں۔ کیونکہ انہوں نے اس کے جواب میں تقریر کرنا تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے فاروقی صاحب نے منع کر رکھا ہے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ شمشاد صاحب اس تقریر کو پڑھیں گے نہیں تو اسکے جواب میں تقریر کیسے کر سکیں گے۔!

میں انکار نہ کر سکا اور تقریر اُنہیں دیدی۔ اس بات کو ابھی پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہونگے کہ چپڑاسی فاروقی صاحب کا بلاوا لیکر آگیا۔ اُنکے دفتر میں پہنچا۔ میرے جاتے ہی وہ اُٹھے۔ اپنا بریف کیس بھی لیا اور ساتھ والے کمرے کی جانب یہ کہتے ہوئے چلدیئے کہ آؤ وہیں بیٹھ کر تمہاری تقریر سنتے ہیں۔ میں نے بے دھیانی سے کہہ دیا "ذرا ٹھہریئے میں مسودہ لے آؤں"۔ فرمایا کس کو دیا ہے تم نے؟" ـــ میں سمجھ گیا کہ اب شامت آئی ڈرتے ڈرتے بتایا کہ شمشاد صاحب کو دیا ہے تاکہ وہ اس کا جواب تیار کر سکیں۔ ان کا ارادہ شاید شمشاد صاحب سے فی البدیہہ تقریر کرانے کا تھا۔ جو میری وجہ سے گڑبڑ ہوگیا۔ چنانچہ میرے یہ بتانے کی دیر تھی کہ وہ ایک دم طیش میں آگئے۔ اپنا بریف کیس اٹھا کر دے مارا میں سمجھا مجھے مارنے لگے ہیں۔ مگر وہ میز پر جا گرا۔ اور مجھ پر اس زور سے گرجے کہ سارا شعبہ سن رہا تھا۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا مگر کیا کرتا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، سر جھکائے نادم کھڑا رہا۔ ان کا بریف کیس میز پر سے پھسلتا ہوا پرلے کنارے سے نیچے فرش پر جا گرا۔ اور اپنے ساتھ میز پر رکھی ہوئی اشیاء قلمدان، ٹیبل کیلنڈر وغیرہ کو بھی لیتا گیا۔ میں اسے اٹھانے کیلئے جھکا تو پھر ان کی آواز گونجی۔ "اسے یہیں رہنے دو۔ تقریر لے کر آؤ"۔ میں نے بھی اسی میں عافیت سمجھی۔ فوراً باہر کی طرف لپکا۔ مجھے یاد نہیں کہ شمشاد صاحب تھے یا کوئی اور بہر حال دروازے کی چوکھٹ سے لگے کھڑے تھے۔ وہیں انہوں نے مسودہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور میرے لئے واپس آنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ میں آکر سر جھکائے بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک وہ غصے میں کھولتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کا موڈ ٹھیک ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ غصے نے معمولی فہمائش کی صورت اختیار کر لی۔ پھر مجھے تقریر پڑھنے کو کہا میں پڑھتا گیا اور انکا موڈ خوشگوار ہوتا گیا۔ دس پندرہ منٹ پہلے وہ جتنے ناراض تھے، تقریر کے اختتام پر وہ اتنے ہی مسرور دکھائی دیئے۔ اور مجھے بسکٹوں کے ساتھ چائے پلا کر رخصت کیا۔

فاروقی صاحب شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ ادب کو وہ

اخلاقی اور تہذیبی اقدار کا آئینہ سمجھتے تھے۔ عریانیت، حسن پرستی اور اسی طرح کے بیسویں صدی کے دوسرے مخصوص رجحانات انہیں سخت ناپسند تھے۔ مغربی ادب کا مطالعہ انکا زیادہ وسیع نہیں تھا۔ تاہم اُردو ادب میں جو مصنفین مغربی ادب کی تقلید میں حقیقت نگاری کے پردے میں عریانی اور جنسی لذتیت کو موضوع سخن بنانے کے شائق تھے۔ انہیں وہ بُرا سمجھتے تھے۔ اس اعتبار سے شاید کچھ لوگ انہیں متعصب اور رجعت پسند کہیں۔ مگر یہ انکی اپنی رائے تھی۔ اور ایک ناقد کی حیثیت سے اس کے اظہار کا انہیں پورا پورا حق حاصل تھا۔ کلاس میں غزل پڑھاتے ہوئے ایسے اشعار کو ہمیشہ چھوڑ جایا کرتے تھے۔ جن میں معاملہ بندی اور گھٹیا جذباتیت کے مضامین ہوتے تھے۔ ایسے مواقع پر وہ طالبات کی موجودگی کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ وہ قنوطی ادیبوں کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ شاید اقبال کی تعلیمات کا اثر تھا۔ کہ انہیں صرف وہ ادیب محبوب تھے۔ جو پاکیزہ جذبات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دیتے ہوں۔ اور حرکت اور جوش و ولولہ سے بھرپور ہوں۔

شعبہ اُردو سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کچھ عرصہ کیلئے ترکی چلے گئے تھے۔ میری شادی کے وقت وہ وہیں تھے۔ اسلئے میں انہیں مدعو نہ کر سکا۔ حالانکہ وہ اس میں شرکت کے بوجوہ متمنی تھے۔ ترکی سے مراجعت کے بعد جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور انہیں میں نے بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ مجھے خوشی سے گلے لگایا۔ اور کہا "مجھے اس سے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ تمہاری آرزو پوری ہو گئی"۔ چند ہی روز بعد حسن اتفاق سے ریل گاڑی میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔ میری بیگم نسیم بھی میرے ساتھ تھیں۔ اور ہمارا بیٹا بھی۔ بچے کو لیکر پیار کیا۔ پھر نسیم کو ہومیوپیتھی کی ایک دوا (CALCARIA PHOS) بچے کے لئے تجویز فرمائی۔ اور کہا کہ اس کے باقاعدہ استعمال سے بچے کو دانت نکالنے میں بہت آسانی ہو گی۔ بعد میں ہم نے اس نسخے کو آزما کر دیکھا اور بہت مفید پایا۔ راستے میں ہم تو کیمبلپور اتر گئے اور وہ آگے چلے گئے۔ ترکی سے واپسی کے بعد انہوں نے ڈاڑھی بڑھائی تھی۔ جو اُن کے خوبصورت گورے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔ اور وہ اس میں پہلے سے زیادہ پُروقار نظر آتے تھے۔

ملازمت کی وجہ سے مجھے پشاور چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ ان سے ملاقات بھی دیر سے ہونے

لگی۔ جب بھی پشاور جانا ہوا اکثر امیر صاحب کی دُکان پران سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مہینوں بعد پشاور جانے کا موقع ملا تو امیر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اکثر میرے بارے میں اس سے دریافت کرتے رہتے تھے۔ یہ ان کی شفقت تھی ورنہ سینکڑوں شاگردوں میں بھلا میری کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔

وفات سے کوئی سال بھر پہلے وہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں میرے ممتحن اعلےٰ تھے۔ میں تب بھی یہیں مانسہرہ میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی نے انہیں مانسہرہ آنے کی دعوت دی۔ مگر بوجوہ وہ نہ آسکے۔ اس کے چند روز بعد پشاور میں ملے۔ میں نے دوسری بار گذارش کی۔ فرمایا "اس بار مشکل ہے۔ پھر کبھی سہی۔ مگر ایک شرط پر کہ تم آکر مجھے لے جانا۔ ورنہ میرے لئے نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ اور تم کہو گے، یہ بڈھا ٹال مٹول کرتا ہے" ـــــ زندگی کے جھمیلوں میں ایک سال بیت گیا اور مجھے اتنی مہلت نہ ملسکی کہ میں انہیں لیکر آتا۔

فاروقی صاحب بحیثیت انسان محبت کے لائق تھے۔ اُستاد ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے تو وہ لائق احترام ہستی بھی تھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس وقت میں جیسا بھی ہوں، میری شخصیت اور کردار کی تعمیر میں میرے اُستاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔

میرے کمرے میں فاروقی صاحب کا ہمارے ساتھ ایک گروپ فوٹو آویزاں ہے۔ جس میں اتفاق سے مجھے عین انکے قدموں میں جگہ ملی ہے ـــــ اور یہی ایک شاگرد کا صحیح مقام بھی ہے۔

پروفیسر صادق زاہد
شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

اُستادِ بزرگ

پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم

(چند یادیں، چند تاثرات)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے دل و دماغ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ اور قلم کا کلیجہ شق ہو رہا ہے۔ میر تقی میر نے غالباً ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم و مغفور اساتذۂ قدیم کی اس صف کے آخری نمائندہ تھے جنہوں نے درس و تدریس کے پیشہ کو بطور عبادت اپنایا تھا۔ وہ مسلمان قوم کے اس دور کے مدرس تھے جب کہ برصغیر میں آزادیٔ وطن کی تمام تحریکیں عروج پر تھیں اور مسلمان اساتذہ کرام اپنی قوم کو حالات کے تقاضوں کے مطابق تیار کرنے میں شب و روز مسلسل ریاضت میں مصروف تھے۔ انہی عظیم اساتذہ میں سے ایک پروفیسر فاروقی صاحب مرحوم کی ذات گرامی بھی تھی۔ وہ مسلمان قوم کے مدرس ہوتے ہوئے درویش صفت خدامست تھے۔

پروفیسر طاہر فاروقی صاحب کو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام اسلامیہ کالج پشاور کی علمی ادبی فضاؤں میں اپنے والد محترم کی زیر سرپرستی بسر کرنے کے مواقع میسر آئے۔ چنانچہ اس حوالہ سے جہاں تک پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب کی ذاتِ اقدس سے خاکسار کا تعارف ہونے کا تعلق ہے سکول کی طالب علمی کے دوران پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم و مغفور کا مرتب کردہ نصاب اُردو درس و تدریس کے تقاضوں کے پیش نظر مطالعہ کرنیکا موقع میسر آیا اور ہماری آٹھویں جماعت کی اُردو زبان کی کتاب میں قبلہ فاروقی صاحب

کی ایک نعت بعنوان رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ شامل نصاب تھی۔ جس مدرس نے یہ نعت پڑھانے کا فریضہ سرانجام دیا، وہ خلوص و عقیدت کے اِس انداز سے سرانجام دیا جسکی بدولت سب سے پہلے اُستاد بزرگ کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ بعدازاں نعت کے اشعار کی تشریح کی یوں ہم قبلہ محمد طاہر فاروقی صاحب مرحوم و مغفور سے غائبانہ طور پر متعارف ہو چکے تھے۔ سکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کالج کے ابتدائی مدارج میں داخلہ لیا۔ اور اُردو ادب سال اول سے سال چہارم تک بطور اختیاری مضمون شامل درس رہا۔ ان چار سالوں کے دوران پروفیسر صغیر احمد جان مرحوم و مغفور کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ مرحوم کا تعلق دلی کی خاک پاک سے تھا۔ اور دلی یونیورسٹی میں ایم اے اُردو کے مدارج کو پڑھا چکے تھے۔ انہوں نے ایبٹ آباد میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ایک اچھی خاصی تعداد تیار کر لی تھی۔ جس کے نتیجے میں اُردو زبان و ادب کی مقبولیت دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد جب مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو اُستاد گرامی پروفیسر صغیر احمد جان مرحوم سے رابطہ قائم کیا تو مرحوم فرمانے لگے میاں کہاں مختلف جھمیلوں میں پڑ رہے ہو پشاور یونیورسٹی کے ایم۔اے اُردو میں داخلہ لے لو وہاں طاہر فاروقی بھائی کے زیر سرپرستی آپ کو درس و تدریس اور دیگر امور کے سلسلے میں سہولتیں حاصل رہیں گی۔ چنانچہ ہم نے رختِ سفر باندھا اور پشاور کیلئے روانہ ہوگئے۔ اور وہاں قبلہ طاہر فاروقی صاحب سے براہ راست متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور خاکسار فاروقی صاحب کی شاگردی میں داخل ہوگیا۔ مسلسل دو سال تک ان کے زیر تربیت رہنے کا موقع ملا۔ اور اس مدت کے دوران قبلہ فاروقی صاحب جیسے بزرگ، عظیم دانشور اور مخلص انسان کے بارے میں ان کی وفات تک جو تأثرات ذہن میں مرتب ہوئے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

فاروقی صاحب بحیثیت ایک انسان انتہائی مخلص، حق گو اور بیباک قسم کے انسان تھے۔ اصولوں کی خاطر انہوں نے مصلحت اندیشی کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے کی اجازت نہ دی۔ اور سب سے بڑھکر وہ ایک مشرقی فکر و نظر کے انسان تھے۔ جسکی بناء پر وہ مشرقی اقدارِ زندگی اور روایات کے سختی سے پابند تھے اور اپنے

طلباء کو مشرقی اقدارِ زندگی اور روایات اپنانے کی بھرپور تلقین کرتے رہتے تھے۔ ان خصوصیات کی بنا پر قبلہ فاروقی صاحب اپنے طلباء کے دل و دماغ پر خلوص و عقیدت کی حکمران کرتے تھے۔ اور انہی خصوصیات کی وجہ سے ان کے طلباء استاذ بزرگ کے بےدام غلام تھے۔ فاروقی صاحب اپنے طلباء کی معمولی سی معمولی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اگر کسی کی رہائش کا مسئلہ درپیش ہوتا، تو اس کے حل کیلئے فاروقی صاحب رجسٹرار سے ملاقات کر رہے ہیں اور اگر وہاں بھی اس کے حل کی کوئی سبیل نہیں نکل رہی تو وائس چانسلر سے مذاکرات کیلئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ اگر ان تمام ملاقاتوں کے بعد یہ مسئلہ حل ہوگیا تو پھر ہاسٹل کے وارڈن سے سفارش کی غرض سے ملاقات کر رہے ہیں کہ دیکھئے صاحب یہ برخوردار دور دراز مقام سے تشریف لائے ہیں لہٰذا رہائش کیلئے ان کو بہتر سے بہتر کمرہ عنایت کیجئے۔ فقط اس جدوجہد تک اُستادِ گرامی کا جذبہ ہمدردی محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ ہمدرد تھے۔

فاروقی صاحب نو وارد طلباء کو اکثر اپنے دولت خانے پر مدعو کیا کرتے تھے۔ تاکہ ان کو اجنبیت کا احساس نہ رہے۔ اور ان دعوتوں کے دوران خالص یو۔پی کے عمدہ کھانوں سے ان نو وارد طلبہ کی تواضع کی جاتی تھی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی قبلہ فاروقی صاحب کی ہمدردی، درویشی، بزرگی اور خودداری کی، تو ایک دفعہ بندہ ہاسٹل میں اچانک بیمار ہوگیا۔ دیکھتا کیا ہوں، فاروقی صاحب مع اپنے احباب کے بیمار پرسی کیلئے تشریف لا رہے ہیں۔ ادویات سے لیکر کھانے پینے کی اشیاء تک ہر بات کا مکمل خیال کر رہے ہیں۔ اتنی فکر اپنی صحت کی مریض کو نہیں جتنی فاروقی صاحب کو تھی۔ بار بار اس بات کی تلقین کرتے میاں پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ اس سے اس بلند کردار انسان کی شخصیت کا وہ لازوال پہلو سامنے آتا ہے۔ کہ وہ اپنے طلباء کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ ان کے دکھ کو اپنا دکھ انکی راحت کو اپنی راحت اور ان کی ہر خوشی کو اپنی ذاتی خوشی سمجھتے تھے۔ طلباء کے خطوط کے جواب انتہائی باقاعدگی سے دیا کرتے تھے۔ ان کے احسانات طلباء پر والدین سے زیادہ ہوا کرتے تھے۔ وہ طلباء کو ان کی نجی زندگی کے بارے میں بھی گرانقدر اور پُرخلوص مشوروں سے نوازتے تھے۔ جن مشوروں کی حقیقت و صداقت کے پیش نظر طلباء زندگی کے کٹھن سے کٹھن مراحل

سے انتہائی ثابت قدمی سے گذر جاتے تھے۔ فاروقی صاحب ایک عظیم رہنما اور مخلص دوست بھی تھے۔ علوم شرقیہ کے تمام شعبوں پر ان کو استادانہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے اپنے معاصرین سے دوستانہ مراسم تھے۔ اور وہ سب بزرگ فاروقی صاحب کو اپنا مخلص ساتھی تصور کرتے تھے۔ برصغیر کے بلند پایہ علوم شرقیہ کے ماہرین سے جہاں انہوں نے بہت کچھ سیکھا وہاں وہ برصغیر کے ہر بڑے شاعر ادیب و نقاد کے دوست اور مخلص رہنما بھی تھے۔ اپنے عہد کے لوگوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس کی ایک مثال علامہ اقبال مرحوم اور پروفیسر فاروقی صاحب مرحوم کا اکٹھا سفر ایران کا پروگرام تھا لیکن علامہ اقبال کی اچانک وفاتِ حسرت آیات کی وجہ سے سفر ایران کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔

تحقیق و تنقید کی دُنیا میں قبلہ پروفیسر طاہر فاروقی مرحوم مولانا حامد حسن قادری، مولانا عریدی مرحوم ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم اور حافظ محمود شیرانی مرحوم سے متأثر تھے۔ اپنے درس و تدریس کے دوران مرحوم اکثر ان بزرگوں کی تصانیف کے حوالے دیا کرتے تھے۔ قبلہ طاہر فاروقی مرحوم نے فارسی درسیات کا فریضہ بھی احسن طریقہ سے سرانجام دیا تھا۔ اس عہد میں جبکہ فارسی کی شاعری کی تشریحات اور تمام نقد و نظر انگریزی زبان میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن ان کی سب سے زیادہ دلچسپی اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج اور درس و تدریس سے جنون کی حد تک تھی۔

اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا یہ نتیجہ تھا۔ جس کے پیش نظر قبلہ فاروقی صاحب پشاور سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اُردو فارسی میں بحیثیت ریڈر اُردو تشریف لے گئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کے دوران ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم اور ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم کے ہمراہ مشرقی پاکستان میں اُردو زبان و ادب کی تحریک مقبول بنانے کیلئے علمی ادبی مجالس کا انعقاد کرتے رہے۔ اور اُردو مشاعرہ کی روایت کا آغاز کیا۔ جسکی بناء پر اقبال عظیم نے اپنی مشہور و معروف تصنیف "مشرقی پاکستان اور اُردو" میں فاروقی صاحب کی علمی ادبی خدمات کا اعتراف کے طور پر ایک مخصوص باب قائم کیا۔

بعد ازاں صوبہ سرحد کے سنگلاخ خطے میں اُردو زبان و ادب کو مقبول بنانے

کیلئے قبلہ فاروقی صاحب نے اپنی خدمات اسلامیہ کالج پشاور کو بحیثیت اُستاد اُردو زبان وادب کے پیش کیں۔ بعد ازاں شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی کا قیام آپکی مساعی جمیلہ کی بدولت عمل میں لایا گیا۔ آپ شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے جس کے نتیجے میں اُردو زبان وادب کی تحریک کو مقبول بنانے کیلئے ہر سال یوم اقبال پر تاریخی اجتماعات کا آغاز کیا۔ اور کئی ایک ادیب و شاعر ملک کے دوسرے حصوں سے ان اجتماعات میں شرکت کی غرض سے تشریف لایا کرتے تھے۔ آج صوبہ سرحد کے ہر گوشے میں فاروقی صاحب کے شاگردانِ رشید اُردو زبان وادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ اور فاروقی صاحب کا فیضِ تربیت آج ہزارہ کی بلند و بالا چوٹیوں سے چترال تک اور چترال سے خیبر تک اُردو زبان وادب کا پرچم بلند کئے ہوئے ہے۔ اس تمام تر کامیابی کا سہرا سرحد کے بابائے اُردو، اُردو زبان کے مستند استاد اور شاعر و ادیب پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم کے سر ہے۔ جس شخص نے اُردو زبان وادب کی تحریک کو مقبول بنانے کیلئے اپنی خدمات انتہائی پُرخلوص انداز سے پیش کرکے اُردو زبان کی تحریک کو ایک عالمگیر تحریک کی صورت میں اربابِ فکر ونظر کے سامنے پیش کیا ہے۔ آج اُردو زبان وادب کا قافلہ پورے ذوق وشوق سے رواں دواں ہے۔

جہاں تک فاروقی صاحب کا بحیثیت اُستاد کے تعلق تھا انہوں نے ہمیں ایم۔اے سال اول کے دوران غزل کا پرچہ پڑھایا تھا۔ استادِ گرامی جس شاعر کا دیوان شروع کرتے تھے، تو سب سے پہلے اس شاعر کا عہد تاریخ کی روشنی میں متعین کرتے تھے۔ اس عہد کے اہم حالات و واقعات، شاعر کے فکر و فن پر جو مرتب ہوتے تھے، ان کا متوازن تجزیہ کرتے تھے۔ اس عہد کی تاریخ کے ساتھ جب اشعار کی تشریح فرماتے تو اِس دوران اس موضوع کے مطابق اُردو، فارسی، عربی کے جو اشعار ان کو یاد آتے بطورِ تقابلی مطالعہ کے اپنے لکچر کے دوران پیش کرتے تھے۔ اس طرح اشعار کی تشریح کی بدولت طلباء میں ذوقِ سخن جلا پاتا تھا۔ اور ان کا نقد و نظر کا شعور ایک متوازن صورت اختیار کرتا تھا۔ قبلہ فاروقی صاحب نے انگریزی ادب اور تنقید کا مطالعہ بڑی گہرائی اور گیرائی سے کیا تھا، لیکن وہ کلیم الدین احمد کی طرح

ہر ادب پارے کو خالص مغربی اصول تنقید کے پیمانوں سے ماپنے کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ مشرقی ادبیات پر تنقید کرتے ہوئے خالص مشرقی اصول نقد و نظر بروئے کار لایا کرتے تھے۔ بحیثیت محقق و نقاد برصغیر کی علمی، ادبی تاریخ میں اپنا مستند مقام رکھتے تھے۔ ان کے جو تنقیدی مقالات اردو مرثیہ اور مثنوی کے ارتقاء پر شائع ہوئے تھے۔ ان کو برصغیر کے ہر بڑے ادیب نے سراہا۔ اور ان مقالات کو ملک گیر شہرت نصیب ہوئی تھی۔

قبلہ فاروقی صاحب نے بحیثیت ایک محقق اپنے لئے تحقیق کے دو موضوعات کا انتخاب کیا تھا ایک مرزا جان طپش کا عہد اور شاعری اور دوسرا اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء یہ دونوں موضوعات مسودوں کی صورت میں قبلہ فاروقی صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہونگے۔ آئندہ کا محقق و نقاد ان ہر دو موضوعات کو مزید وسعت دے سکتا ہے۔ اسیطرح قبلہ فاروقی صاحب نے چند کتابوں کے جو مقدمات لکھے ہیں وہ بھی تحقیق و تنقید کی دُنیا میں خاصے کی چیز ہیں ان میں سے ایک مقدمہ "تذکرہ شاعرات اُردو" پر فاروقی صاحب نے سپردِ قلم کیا ہے۔ جو کہ موضوع کی ندرت کے لحاظ سے تحقیق کی دُنیا کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اسیطرح مولانا محمد علی جوہر کے مجموعہ کلام پر فاروقی صاحب کا مقدمہ دُنیائے نقد و نظر میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ جن کا مُطالعہ ادب اور تحقیق و تنقید کے طالب علم کیلئے بے حد ضروری ہے۔

مندرجہ بالا "تذکرہ شاعراتِ اُردو" آج سے چالیس سال قبل قومی کتب خانہ بریلی سے شائع ہوا تھا۔

ایم۔ اے اُردو کے آخری سال کے دوران فاروقی صاحب ہمیں اقبال کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ درس و تدریس کے دوران سب سے پہلے وہ علامہ اقبال کے تمام مجموعہ ہائے اُردو کلام کی تشریح سبقاً سبقاً کرتے تھے۔ بعد ازاں اقبال کی شاعری کے تمام موضوعات پر مکمل لیکچر معہ نوٹس کے دیا کرتے تھے۔ جسکی بدولت کئی کتابوں کی علمی وسعت اور مطالعہ کا نچوڑ فاروقی صاحب کے لیکچرز میں ہوتا تھا۔ فاروقی صاحب برصغیر کے چند مستند ماہرینِ اقبالیات میں سے تھے۔ جنہوں نے علامہ اقبال کی وفات

کے فوراً بعد سب سے پہلی کتاب اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر بعنوان "سیرتِ اقبال" پیش کی تھی۔ یہ کتاب اپنے موضوعات کی تشریح اور تحقیق و تنقید کے نقطہ نگاہ سے سلسلہ اقبالیات میں سب سے اول اور ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ آج بھی اقبالیات کا مطالعہ کرنے والے طلباء و اساتذہ کرام "سیرتِ اقبال" کو بطور حوالہ اپنے زیرِ مطالعہ رکھتے ہیں۔ آج نصف صدی کا عرصہ گذرنے کے باوجود "سیرتِ اقبال" کے موضوع اور فکر و فن پر کہیں بھی کہنگی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اپنے موضوع کی انفرادیت اور ندرت کی بناء پر یہ ایک سدا بہار گلستان ہے، جو کہ اپنے مصنف کے نام کو قیامت تک زندہ رکھے گا۔

سلسلہ اقبالیات کی دوسری اہم تصنیف "اقبال اور محبت رسولؐ" ہے، جو کہ فاروقی صاحب نے اقبال کے "صد سالہ جشنِ ولادت" کے موقع پر شائع کی ہے۔ یہ غالباً ان کی آخری تصنیف ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں قبلہ فاروقی صاحب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ وہ ایک انسان تھے اور انسان ہوتے ہوئے عظیم انسان تھے۔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ پیشہ ور شاعروں اور ادیبوں کی طرح انہوں نے اپنے لئے کسی انجمن کے پلیٹ فارم کے حصول کی تمنا نہیں کی تھی، وہ انجمن ستائش باہمی قسم کے فضول اداروں سے دور رہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ملک کی مستند انجمنوں اور علمی ادبی اداروں کے ممبر تھے۔ وہ ایک عرصہ دراز تک اُردو لغت بورڈ کے ممبر رہے اور انجمن ترقی اُردو کراچی کے رکن تھے۔ اُنہیں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ہمراہ ادبی کام کرنے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ ان کی رائے کو ادب کی دُنیا میں ان کے رفقاء سند کا درجہ دیتے تھے۔ ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں برِّصغیر کے چوٹی کے اہلِ قلم میں سے ہوں، وہ اپنے چھوٹوں اور بڑوں سب کو بے تکلفی کے انداز سے مخاطب کرتے تھے۔ قدم قدم پہ شرافت و نجابت کا احساس ہوتا تھا۔ فاروقی صاحب سے سب سے پہلی بار ملاقات کرنے والا شخص بھی یہ سمجھتا تھا کہ گویا سالہا سال کی رفاقت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ایک ایسے انسان تھے۔ عظمت نے جن کی زندگی میں ان کے قدم

چومے اور زندگی کے بعد بھی عظیم رہے۔ اور ملک سے باہر بھی لوگوں نے انکو عظیم کہا۔ اہل سرحد کیلئے وہ علم وادب کا ایک گنج گرانمایہ تھے اور پر خلوص انسان تھے۔ ان سے آخری تفصیلی ملاقات ان کے چھوٹے صاحبزادے طیب فاروقی کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر ہوئی۔ یہ گویا ہم لوگوں کے درمیان آخری ملاقات تھی۔ مرحوم نے شادی سے کئی روز قبل ایک مکتوب میں زندگی کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا اور فرمانے لگے اب صحت ساتھ نہیں دے رہی۔ بعدازاں ان کی تمام خط وکتابت شادی کے انتظامات اور یہاں (ایبٹ آباد) کے رسم و رواج کے بارے میں تھی مرحوم ہر پہلو سے تفصیلی معلومات حاصل کر رہے تھے۔ کیونکہ بارات پشاور سے ایبٹ آباد تشریف لا رہی تھی۔ ان دس پندرہ دنوں کے دوران خط وکتابت کا خوب سلسلہ جاری رہا۔ آخر وہ ساعت سعید بھی آگئی جبکہ فاروقی صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کی بارات ایبٹ آباد مانسہرہ روڈ پر پبلک سکول ایبٹ آباد کے صحن میں داخل ہوگئی۔ باراتیوں کو شب بسری ایبٹ آباد ہی میں کرنی تھی۔ لہذا دوسرے دن مرحوم علی الصباح اپنے نواسے کے ہمراہ کار پر کالج ہم لوگوں کی تلاش میں تشریف لائے اور خاکسار کو تلاش کرتے ہوئے سٹاف روم پہونچ گئے۔ میں نے عرض کیا قبلہ آپ نے ناحق تکلیف کی ہے۔ فون پر حکم دیتے ہم لوگ حاضر ہوجاتے۔ فرمانے لگے نہیں یہ میرا اخلاقی فرض تھا۔ آپ لوگ بھی تو میرے بچے ہیں۔ مرحوم دس روز قبل ایبٹ آباد کے تمام احباب کے نام میری معرفت دعوت نامے ارسال کر چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے احباب کو مدعو کرنے کیلئے بنفس نفیس تشریف لائے کیا وضع داری تھی اور کیا خلوص تھا جس کی مزید وضاحت کیلئے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ ہم سب کے قابل اعتماد بزرگ تھے۔ جو کہ ہم لوگوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے۔ اور ہم لوگوں کی مسرتوں میں اسطرح شریک ہوتے تھے جس طرح ایک بزرگ اپنے چھوٹوں کی خوشیوں میں شریک ہوتا ہے۔

فاروقی صاحب کی ہمدردانہ کوششوں کی بدولت آج بھی بہت سے اصحاب بلند و بالا کرسیوں پر براجمان ہیں۔ یہ وہ آخری ملاقات تھی جس کے دو ہفتوں کے بعد یہ مرد قلندر اس منزل کا راہی بن گیا جہاں سے آج دن تک کوئی واپس لوٹ کر نہیں آیا میں پشاور ہی میں تھا۔ امیرالدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ فاروقی صاحب آج اس

بان فانی سے رخصت ہوگئے ہیں۔ میں جب ان کے دولت خانے پر پہونچا تو ان کے عزیز اقارب مرحوم کو نشتر آباد کے قبرستان میں سپردِ خاک کرکے واپس آچکے تھے۔ ان کے صاب شاگرد، ادیب و شاعر یونیورسٹی کے اساتذہ کثیر تعداد میں موجود تھے وہ سب حوم کی خوبیاں بیان کر رہے تھے۔

فاروقی صاحب ایک شگفتہ طبیعت کے انسان تھے۔ اور گفتگو کے دوران ان ے سونف کا بٹوہ ہر ہاتھ میں خود بخود پہونچ جاتا تھا۔ آج ان تمام یادوں کو کہاں تک میٹوں۔ موت نے ہم سے ہمارا راہبر چھین لیا۔ جس کیلئے بقولِ غالب اگر یہ شعر تمام رحومین کی نذر کر دیا جائے تو بجا ہے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے؟

فاروقی صاحب کو جب حافظ شیرازی کی معرفت یاد کیا۔ تو یہ شعر بطور فال نکلا۔ قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں ؎

روزِ ہجران و شبِ فرقتِ یار آخر شد
زدم این فال و گذشت اختر و کار آخر شد

بیگم ارجمند انور فاروقی

بیتے ہوئے کچھ دِن

سوچتی ہوں کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم۔ کیونکہ میرے پاس اتنا عمدہ ذخیرۂ الفاظ نہیں جو ایسی مقدس، مخلص، اور شفیق ہستی کے شایانِ شان خراج عقیدت پیش کر سکے۔

میری ان سے پہلی ملاقات بڑے دلچسپ انداز میں ہوئی۔ یہ آج سے تقریباً دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے۔ میرے والد مرحوم سنٹو میں تھے اور اس زمانے میں ان کا تقرر انقرہ (ترکی) ہی ہوا تھا۔ چنانچہ اس بہانے ہم نے بھی ترکی کی سیر سے لطف اٹھایا۔ ایک دن میں اپنے کام میں مصروف تھی کہ کال بیل کی آواز پر چونکی۔ دروازہ کھولا تو ایک سرخ و سفید، صحت مند، باوقار بزرگ کو کھڑے پایا۔ جنہیں میں پہلی نظر میں ترک سمجھی مگر ان کے ساتھ آئے ہوئے صاحب نے "فاروقی صاحب" کہہ کر تعارف کرایا اور ابا جان کے متعلق دریافت کیا۔ میں ابا جان کو اطلاع دینے گئی۔ پھر ابا جان اور فاروقی صاحب جس والہانہ انداز میں گلے ملے کہ میں کیا بتاؤں۔ معلوم ہوا کہ ابا جان ۳۲ء کے اُن کے شاگرد ہیں۔ ہم سب ان سے مل کر بیحد خوش ہوئے، اور بہت جلد ہی ان سے بے حد بے تکلف ہو گئے۔

ان کی تصنع سے پاک گفتگو، شگفتگی، شائستگی نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ہم گھنٹوں ان کی دلچسپ باتیں سنا کرتے۔ انقرہ میں ہفتے کو ہاف ڈے ہوتا تھا اور ہم سب چھوٹے بڑے بڑی شدت سے انکل فاروقی کا انتظار کیا کرتے۔ اور جب وہ آجاتے تو گویا ہمارے سارے کام سمٹ کر ایک ہی کام رہ جاتا کہ انکل سے باتیں کی جائیں۔ اُن کی باتیں نہ صرف دلچسپ ہوتی تھیں بلکہ بہت معلوماتی اور مفید ہوتی تھیں۔

انہیں عالم اسلام سے اور خصوصاً ان ممالک کے مسائل سے بیحد دلچسپی تھی۔ گھنٹوں بے تکان بولا کرتے تھے۔ عالم اسلام کے ساتھ یورپی ممالک جو زیادتیاں کرتے

ہیں۔ انہیں اس کا بہت قلق تھا۔ گفتگو کرتے ہوئے کبھی کبھی جذبے میں آجاتے تھے۔ چہرہ سرخ ہوجاتا تھا۔ اور اقوام عالم کی دھاندلیوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔

انکل بہت سادہ مزاج اور سادہ لباس تھے۔ تصنع اور تکلف سے سخت نفرت تھی۔ عمدہ کھانوں کے شائق تھے۔ البتہ ایک وقت میں صرف ایک ہی کھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ امی اکثر انہی کی پسند کے کھانے تیار کیا کرتی تھیں۔ نہاری پائے بہت پسند تھے۔ ارہر کی دال شوق سے کھاتے تھے۔ سردیوں میں ماش کی کھچڑی اور شلجم کا اچار بہت پسند کرتے تھے مجھے یاد ہے، ترکی میں کھانے کی میز پر اکثر ماش کی کھچڑی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ امی نے شلجم کا اچار تو بنادیا، مگر کھچڑی نہ پک سکی۔ کیونکہ ترکی میں ماش کی دال نہیں ملتی تھی۔

کھانے کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُن کو مٹھائی بہت پسند تھی۔ میٹھا سامنے دیکھ کر پرہیز کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ جب اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کرکے پاکستان سے واپس گئے۔ تو شوگر کی وجہ سے ڈاکٹر نے چینی کا استعمال بند کردیا تھا۔ جو کہ ان کے لئے بہت صبر آزما تھا۔ ترکی جاکر خود پر بہت عرصہ جبر کیا مگر کہاں تک۔ ایک دن فیکلٹی سے سیدھے ہمارے گھر آگئے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ اور آکر بولے کہ "میں نے سوچا آپ لوگوں کا دل چاہ رہا ہوگا۔ کہاں تک پرہیز کریں گے"۔ اور ساتھ ہی اُن کا مخصوص قہقہہ گونجا۔ ہمیں بہت ہنسی آئی اور ان کی خواہش کے اتنے خوبصورت اظہار پر امی نے آئندہ ہمیشہ سویٹ ڈش کا اہتمام کیا۔ پرہیز کی پابندی کرنا انکے لئے ناممکن تھا۔ لیکن بس جیسے جیسے تکلیفیں بڑھتی گئیں، ہاضمے نے جواب دیدیا یہاں تک کہ کھانا پینا تک جاتا رہا۔ اس قدر مختصر اور پرہیزی کھانا کھانے لگے تھے۔ کہ دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی تھی۔

ڈیڑھ پونے دو سال ہوئے جب یرقان ہوا جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ بیسن کی روٹی، ساگ اور مولی کا عرق ہی ان کی غذا بن کر رہ گئے تھے۔ مولی کا عرق بڑی بیٹی پابندی سے پینے کو دیتی تھیں۔ میں باورچی خانے میں بیسن کی روٹی پکانے جاتی تو پیچھے پیچھے چلے آتے اور خوب گھی کا پراٹھا پکواتے۔ میں پرہیز کا کہتی تو فرماتے "ہوتا ہوگا۔ تم گھی ڈالو بی بی"۔

طبیعت میں غصہ تھا مگر بالکل دودھ کے ابال کی طرح ، ابھی آیا ابھی گیا۔ دل میں کبھی میل نہ رکھتے ۔جس طرح چہرہ شفاف اور پاک تھا اسی طرح دل کا آئینہ بھی شفاف اور پاک تھا۔ ان کے دل میں سب کیلئے خلوص اور محبت تھی۔

وہ بیکار بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے ۔میں نے ہمیشہ انہیں کسی نہ کسی کام میں مصروف پایا۔ لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں کو بہت پابندی سے خط لکھا کرتے تھے۔ دوسروں کیلئے دعائے خیر کرنا اور رات کو سونے سے پہلے گھر میں دستک دینا ایک معمول تھا۔

مجھ پر ترکی کے قیام کے زمانے ہی سے بہت مہربان تھے ۔بہت شفقت فرماتے تھے ۔جس کی انتہا یہ ہوئی کہ ۱۹۷۲ء میں مجھے اپنی بہو بنا کر چھوڑا ۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ انقرہ میں ہم لوگوں کو اُن سے اور اُنہیں ہم سے جو خصوصیت اور انسیت ہوگئی تھی کہ جب ہم واپس پاکستان آرہے تھے تو ائر پورٹ پر چھوڑنے آئے اور رخصت ہوتے وقت ان کی آنکھوں کے آنسو اب تک یاد ہیں۔ اور واقعی پھر اُن کا دل بھی وہاں نہ لگا سال بھر بعد خود بھی لوٹ آئے۔

میرے ابا جان کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا۔ مگر میں نے انکل کے ہوتے ہوئے کبھی خود کو یتیم محسوس نہیں کیا۔ مگر انکل کے انتقال کے بعد شدت سے اپنی یتیمی کا احساس ہوا

وہ بہت عظیم انسان تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے مسکراہٹوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا تھا۔ جو کبھی ختم نہ ہوتا تھا۔ بات سے بات نکال کر بہت عمدہ عمدہ واقعات سنایا کرتے تھے ۔ صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند تھے ۔ ربیع الاول کے مہینے میں میلاد شریف بہت شوق سے کروایا کرتے تھے ، بلکہ خود ہی سارا میلاد پڑھا کرتے تھے ۔مجھے ان کا اچھی کتابیں پڑھنے کو دینا نہ بھولے گا۔

ان میں اس قدر خوبیاں تھیں کہاں تک بیان کروں ۔ وہ چلتا پھرتا علم کا ذخیرہ تھے ،علم وادب کی گفتگو کیلئے ہر وقت چاق وچوبند رہتے تھے۔

ان کی علمی دلچسپیاں اور سرگرمیاں صرف اپنی ذات میں محدود نہ تھیں ، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موقع نکالتے جس میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے ۔چنانچہ

انقرہ میں بھی اکثر و بیشتر اُردو فیکلٹی میں کوئی نہ کوئی تقریب ضرور کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک تقریب ہمیشہ یاد رہیگی۔ انہیں علامہ اقبال سے جو ایک روحانی تعلق اور عقیدت تھی۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لہذا اس سلسلے میں اُن کا اقبال ڈے ایک یادگار جلسہ تھا۔ فیکلٹی کے ہال میں تقریب ہوئی۔ صدارت ترکی میں پاکستان کے سفیر افتخار علی صاحب نے کی۔ اس جلسے میں اور مقرروں کے علاوہ ایک دلچسپ بات جو تھی وہ یہ کہ انہوں نے اپنے ترک شاگردوں سے اُردو میں مضمون پڑھوائے جو انہوں نے اس کمال خوبی سے پڑھے تھے کہ خود سفیر صاحب کو حیرت ہوئی اور انہوں نے پوچھا کہ آپ نے انہیں اتنی اچھی اُردو کیسے سکھائی۔ جلسہ بہت کامیاب اور دلچسپ تھا۔ ایک وہ ہی جلسہ کیا، وہ جس کام کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتے، اُسے اس خوبی کے ساتھ انجام دیتے کہ وہ بے مثال ہو جاتا۔

پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو میں ۱۹۶۵ء میں اقبال ڈے کیا جو بے نظیر تھا۔ بہت عمدہ اسکالر ادیب شعراء بلائے۔ چار چار وائس چانسلر، ایران کے کچھ اسکالر آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی مدعو کئے ان کے علاوہ وقار عظیم مرحوم، ڈاکٹر شوکت سبزواری جناب بشیر احمد، حمید احمد خاں صاحب، ڈاکٹر وحید قریشی، غرض یہ کہ علما کا اتنا بڑا اجتماع شعبۂ اُردو میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ چنانچہ کہا کرتے تھے کہ اس کے بعد اس جیسا جلسہ کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔

ان کی ذات خود ایک مجموعۂ علم و فضل تھی۔ چھوٹے بڑے سب کی دلچسپی کی باتیں ان کے پاس موجود تھیں۔ ان کی وفات سے صرف ہم لوگوں کو ہی دلی صدمہ نہیں پہنچا بلکہ جس نے بھی سنا وہ رویا ہے۔ وہ ایک بہترین دوست، بلند پایہ عالم بے مثل انسان تھے۔ ان کی کس کس بات کو یاد کروں، ہر بات دل پر نقش ہے۔ کیسے یاد رکھوں کیسے بھول جاؤں۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پروفیسر محمد انور فاروقی
ایڈورڈس کالج پشاور

کچھ یادیں کچھ باتیں

یہ بات تو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ مجھے اپنے والد کی وفات کے بعد ان پر مضمون بھی لکھنا پڑے گا۔ دراصل ہم لوگ بہت سادہ لوح ہوتے ہیں جب تک سر پر ان شفیق ہستیوں کا سایہ قائم رہتا ہے۔ یہ خیال تک نہیں آتا کہ ایک دن ہم ان کے سائے سے محروم ہو جائیں گے۔ اور جب فی الحقیقت یہ حادثہ ہو گذرتا ہے تب ہمیں اپنی بھول کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی کوتاہیاں یاد آتی ہیں۔ اُن کی عنایت و شفقت یاد آتی ہے۔ عالم کی بے ثباتی کا احساس شدّت سے ہوتا ہے۔

والد صاحب جن کو مرحوم کہنے اور لکھنے کو دل ابتک تیار نہیں، ساری عمر درس و تدریس سے منسلک رہے۔ میری خوش نصیبی کہ میری ساری تعلیم اُنہی کے زیر سایہ اور زیر نگرانی ہوئی۔ مجھے اپنے بچپن سے لیکر جوانی تک وہ لمحات و واقعات جو ان کے ساتھ بسر ہوئے ذہن میں محفوظ ہیں۔ جن سے بار ہا میں اپنے دیرانوں کو مہکانے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔

والد صاحب بہت مشفق، مہربان، نرم دل، خداترس، ہمدرد اور بڑے حوصلے والے انسان تھے۔ طبیعت میں بیحد سادگی تھی۔ گفتگو میں بے ساختگی اور بے تکلفی بہت تھی۔ کسی نو وارد سے بھی گفتگو فرماتے تو بہت بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ پھر اس میں شوخی اور بذلہ سنجی کہ محفل کے روح رواں بن جایا کرتے تھے۔ حلقۂ احباب اس قدر وسیع تھا کہ اتنا وسیع کم ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ اپنے، پرائے، عزیز و اقارب دوست، بڑے چھوٹے سب میں بہت مقبول تھے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے محفل میں جان ڈال دیتے۔ ہر موضوع پر بے تکان بولا کرتے تھے۔ شارع اسلام اور تاریخ عالم پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ مذہب سے دلی لگاؤ تھا۔ سرکار دو عالم کی ذات

سے والہانہ عقیدت تھی۔ آپ کی شان میں بے ادبی برداشت نہ ہوتی تھی۔ اور ایسی حرکت کرنے والا چاہے کیسی ہی عمر کا کیوں نہ ہوتا، اُسے بہت لتاڑتے تھے۔ ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گذری۔ نام و نمود کی کبھی پرواہ نہ کی۔ خاموشی سے علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ اقبال کے اس شعر کی مکمل تفسیر و تصویر تھے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

وہ دل کے بہت صاف، اچھے اور نیک انسان تھے۔ طبیعت کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے تھے۔ بہت جلدی غصہ آجاتا تھا۔ لیکن جس پر غصہ کرتے کچھ دیر بعد دیکھو تو اس سے اس قدر گھل مل کر اور محبت سے باتیں کر رہے ہوتے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ کبھی کوئی بات دل میں نہ رکھتے۔ جو بات صحیح اور بہتر سمجھتے فوراً منہ پر کہتے لگی لپٹی رکھنے کی عادت کبھی نہ تھی۔ ساری زندگی انہوں نے کسی کی خوشامد نہیں کی۔ نہ کبھی کسی ڈر یا خوف سے کسی کے آگے جھکے۔ ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولے۔

وہ ہمیشہ کام کرتے رہے۔ بلکہ دوسرے کا کام بھی ہنسی خوشی کیا۔ ساری عمر نیکیاں کرتے گذری۔ اُن کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

بقولِ شخصے وہ تو لوگوں کا دروازہ کھٹکھٹا کر نیکی کیا کرتے تھے۔ مگر خود کبھی انہیں احساس نہ ہوا کہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کے کتنے ہی مرحوم دوست تھے جن کی بیواؤں کو باقاعدگی کے ساتھ کچھ نہ کچھ رقم اور دیگر ضروریات زندگی بھیجا کرتے تھے۔ بہت سے طالب علموں کی فیسیں پابندی سے ایک فرض سمجھ کر دیا کرتے تھے۔

قبلہ بڑے چھوٹے، ادنیٰ و اعلیٰ سب سے نہایت تپاک سے ملتے تھے۔ وہ سب سے محبت کرتے تھے اور سب اُن سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

اُن کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ کوئی واقعہ سنانے سے پہلے خود سوچ کر لطف لیتے اور پھر بڑے مزے لے لے کر قصہ سناتے۔ جیسی محفل دیکھتے اسی قسم کی گفتگو کیا کرتے۔ وہ بچوں میں بچے اور بڑوں میں بڑے تھے۔ اگر کسی جگہ علم و ادب کا چرچا ہوتا تو ان کی عالمانہ

فصیح و بلیغ گفتگو سننے کے قابل ہوا کرتی تھی۔ موضوع چاہے کتنا ہی خشک ہوتا مگر اسکی اس طرح سے وضاحت فرماتے کہ طبیعت عش عش کر اٹھتی۔ گھنٹوں بولتے رہتے مگر کسی کو بھی اکتاہٹ کا احساس تک نہ ہوتا۔

مجھے یاد ہے جب میں ایم اے فائنل کا طالب علم تھا۔ قبلہ اقبالیات کا پرچہ پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کا لکچر آخر میں ہوا کرتا تھا۔ بلامبالغہ دو دو گھنٹے کا لیکچر ہوجاتا تھا۔ مگر کیا مجال تھی کہ کوئی طالبعلم بوریت محسوس کرتا۔ یا اکتا جاتا۔ آخر خود ہی گھڑی دیکھکر کہتے۔ "او ہو بہت دیر ہوگئی۔ بھئی تم لوگوں میں سے کوئی مجھے ٹوکتا بھی نہیں"۔ اور پھر اپنا بیگ اٹھاکر کلاس روم سے باہر چلے جاتے۔ تب کہیں جاکر کلاس کو ہوش آتا کہ وہ فاروقی صاحب کے ساتھ ساتھ خود بھی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ میں گم ہوگئے تھے۔ وہ جب اقبال کے شعر کی تشریح کرتے تو اس قدر گہرائی میں اتر جاتے کہ حیرت ہوتی کہ ایک ایک شعر کے پیچھے پوری پوری تاریخ بیان ہو رہی ہے۔ اور پھر اس قدر عمدگی سے کہ اشعار اور واقعات دل پر چسپاں ہوتے جاتے تھے۔

وہ ہر ایک سے محبت و شفقت سے ملتے۔ مالی، چپڑاسی، افسر وغیرہ کسی سے ملنے میں کوئی امتیاز نہ کرتے۔ وہ سب کو اچھا سمجھتے اور سب سے اچھی طرح ملتے جو بھی، جس وقت بھی ملنے آتا بہت خوش ہوکر ملتے اور مقدور بھر تواضع کرتے۔ جہاں تک ممکن ہوتا دوسرے کا کام کرتے۔ اسکی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر اپنی کبھی کسی تکلیف کا ذکر نہ کرتے۔ میں نے انہیں بیماری کی حالت میں بھی کبھی کراہتے نہیں سنا۔ کیسی ہی تکلیف کیوں نہ ہوئی مگر جب بھی پوچھا تو کہا کہ خدا کا شکر ہے۔ کبھی حرفِ شکایت لب پر نہ لاتے۔ ہائے کیا کیا خوبیاں تھیں ان میں۔ ساری زندگی خاموشی سے علمی و ادبی کام کئے گئے نام و نمود کا کبھی خیال نہ آیا۔ اقبال کے بہت مدّاح، مفسّر اور جید شارح تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب ان کے پائے کا اقبالیات کا استاد پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جب جناب خاطر غزنوی صاحب اور جناب جعفری صاحب ایم اے کے طالب علم تھے۔ اس وقت شعبۂ اردو

عجب کسمپرسی کے عالم میں تھا یعنی والد صاحب تنہا تمام کام کیا کرتے تھے۔ کلرکی سے لیکر مدرسی تک۔ اس زمانے میں انہیں گُردے کی تکلیف ہوگئی کہ یونیورسٹی جانا بند ہوگیا۔ شدید تکلیف تھی۔ گھر میں ڈرائنگ روم میں اپنا بستر بچھوالیا اور ان حضرات کو وہیں لیٹے لیٹے پڑھانا شروع کر دیا۔ گردے کی شدید تکلیف کے باوجود تمام پرچے خود ہی پڑھائے۔ مجھے یاد ہے صبح سے شام تک کلاس چلتی رہتی تھی۔

طالب علموں سے بیحد محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے۔ کوئی بھی طالب علم چاہے جیسے ہی وقت کیوں نہ آجاتا ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے۔

ان کے مزاج میں شوخی بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ ان کا یہ شوخ انداز کلاس میں لیکچر کے دوران بھی قائم رہتا۔ چنانچہ موضوع کتنا ہی خشک اور غیر دلچسپ کیوں نہ ہوتا اسے اپنے مخصوص انداز میں نہایت دلکش و پُرلطف بنا دیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ طالب علموں سے ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ بھی کرتے رہتے تھے جس سے کلاس روم، کلاس روم کے بجائے ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ جہاں چند بے تکلف دوست خوش گپیوں میں مصروف ہوں اور پھر باتوں باتوں میں ایسی ایسی باتیں سمجھا دیتے تھے کہ ہر طالبِ علم اقبال جیسے مشکل شاعر کو آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ پڑھانے کا انداز بیحد دلچسپ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اقبالیات کے پرچے سے بہت ڈرتا تھا۔ سمینار لائبریری سے جو کتاب بھی اقبالیات پر نکالتا تھا۔ جب پڑھنے بیٹھتا تو طبیعت بہت اکتاتی اور کچھ سمجھ میں نہ آتا سخت پریشان ہوتا۔ اور والد صاحب سے اپنا حال عرض کرتا تو ہنستے اور کہتے کہ گدھے کی سمجھ میں اقبال کہاں آئے گا۔" میں جھگڑتا تو کہتے اچھا کلاس میں میرا لیکچر اچھی طرح سنا کرو۔ اور نوٹس بنایا کرو۔ چنانچہ میں پوری طرح سے اُن کا لیکچر سنتا مگر محویت کا یہ عالم ہوتا کہ قلم انگلی میں دبا رہتا۔ اور لکھنے کا خیال تک نہ آتا۔ مگر وہی لیکچر جو سُنے تھے۔ امتحان میں میرے کام آئے اقبالیات کے سلسلے میں میں نے صرف ان کے لیکچر اور سیرت اقبال پر اکتفا کیا تھا۔

افسوس! اب وہ سب باتیں خواب ہوگئی ہیں۔ بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ بہت سادہ طبیعت کے تھے۔ سادہ رہتے تھے، دوسروں کو بھی سادگی

کی تلقین کیا کرتے تھے۔ لباس بھی بہت سادہ پہنتے تھے۔ جب سے ترکی سے ہو کر آئے تھے۔ تب سے ٹائی کو تو بالکل چھٹی دیدی تھی۔ بند گلے کا کوٹ بہت پسند تھا۔ شوق سے پہنتے تھے۔ گھر میں شلوار قمیص پہنا کرتے تھے۔ سردی کے موسم میں اسی پر سویٹر پہن لیتے اور زیادہ سردی ہوتی تو پھر جُبّہ پہن لیا کرتے۔ بہت جامہ زیب تھے۔ ہر لباس میں بہت شاندار اور پُروقار نظر آتے تھے۔

کھانا بھی بہت سادہ کھاتے تھے۔ ارہر کی دال اور کالی ماش کی کھچڑی بہت مرغوب غذا تھی۔ مکئی کی روٹی اور ساگ بھی بہت پسند تھا۔ مرغی سے بہت چڑ تھی۔ کبھی مٹھائی بہت شوق سے کھاتے تھے۔ مگر جب سے ذیابیطس کی تکلیف ہوئی تھی کھانی چھوڑ دی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی مٹھائی سامنے دیکھ کر کھالیا کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی دوا بھی کھائی جاتی تھی۔ مجھے ان کے ایک فقرے میں بہت مزہ آتا تھا۔ کہ اکثر دیکھنے والے کہتے کہ فاروقی صاحب آپ مٹھائی نہ کھائیے آپ کو منع ہے۔ تو کہتے کہ "اماں نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ شوگر تو دراصل ڈاکٹر کو ہے دوا میں کھا لیتا ہوں"۔

وہ جب گھر میں موجود ہوتے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے۔ میں نے کبھی انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں دیکھا۔ کچھ نہ کچھ لکھتے یا پڑھتے ہی رہتے تھے۔ گذشتہ برس اسلام آباد ریڈیو سے ایک انٹرویو میں کیا خوب بات کہی تھی۔

"اپنی تو ساری عمر لکھتے پڑھتے گذری۔ یہی خواہش ہے
کہ جتنی زندگی ہے لکھتے پڑھتے گذرے"۔

اور یہ دُعا اُن کی قبول بھی ہوئی۔ آخر وقت تک لکھتے رہے۔

پروفیسر سہیلہ فاروقی
گورنمنٹ کالج برائے خواتین مردان

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

ذہن اب بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ تایا طاہر فاروقی صاحب ہم سے بچھڑ کر ایسی جگہ، اتنی دور جا چکے ہیں، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی کہیں سے ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے آجائیں گے اور پھر ان کی باوقار، ہمہ رنگ شخصیت ساری محفل پر چھا جائے گی۔ لیکن یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ ایسا اب کبھی نہ ہو سکے گا۔ بھلا جانے والے بھی کبھی لوٹ کر آئے ہیں؟

۲۰ ستمبر ۱۹۷۸ء کا وہ دن کیسے بھول سکتے ہیں جب میاں (ہم انہیں میاں ہی کہا کرتے تھے) نے اس فانی دُنیا کو خیرباد کہا تھا۔ جمعرات کا دن تھا، میں کالج جانے کیلئے تیار ہو رہی تھی کہ مجھے میری بی۔اے کی طالبات نے یہ خبر سنائی۔ اس اچانک خبر سے چند لمحوں کیلئے تو مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ذہن میں ایک دم آیا خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ وہ بیمار ضرور تھے، اور دو تین دن لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں بھی رہے تھے۔ لیکن وہ صحت یاب ہو کر خود اپنے پیروں سے چلکر گھر تک پہنچے تھے۔ لیکن اتنی جلدی وہ یوں خاموشی سے رخصت ہو جائیں گے یہ تو کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ ذہن اس بات کو ماننے سے انکار کر رہا تھا کہ موت میاں کو ہم سے چھین سکتی ہے۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ فانی انسان بھی کیا چیز ہے اپنی دُنیا سے ہٹ کر سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ پھر مجھے اماں بی (ہماری دادی) اور پاپا (والد صاحب) کا خیال آتا رہا کہ انہوں نے یہ جانکاہ خبر کیسے سنی ہو گی۔ اماں بی کی عمر تقریباً سو سال کے لگ بھگ تھی۔ پاپا کا کیا حال ہوا ہو گا؟ میاں نے تو انہیں بھائی کی محبت اور باپ کی شفقت دی تھی۔ اور پھر یہ تو دوہرا صدمہ تھا۔ کہ اس سے صرف چار دن پہلے ۱۶ ستمبر کو ہمارے پھوپھا میاں کا انتقال کراچی میں ہو چکا تھا۔ انہیں تھروٹ کینسر تھا۔ میاں

ان دنوں علیل تھے اور ہسپتال میں تھے۔ اور ان کو پھوپھا میاں کے انتقال کی خبر نہیں سنائی تھی۔ دونوں میں بے انتہا دوستی تھی۔ محبت تھی۔ عمروں میں بھی اتنا فرق نہ تھا خوش قسمت ساتھ جئے، ساتھ مرے، عدم میں دونوں ملے ہوں گے تو میاں کو کتنی حیرت ہوئی ہوگی۔ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں مردان سے پشاور تک کا سفر کٹا۔ گھر پہنچی تو دروازہ کھلا تھا۔ لوبان اور اگربتی کی مہک باہر تک آرہی تھی۔ تلاوتِ کلام پاک کی آواز کبھی بلند، کبھی دھیمی، فضا کے سکون و سکوت کو چیر دیتی تھی۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ہی بائیں جانب کمرے میں گھر کے سبھی افراد جمع تھے۔ ان کی صاحبزادیاں چچی بی، میری والدہ اور بہنیں، اماں بی، اڑوس پڑوس کی خواتین، سبھی جمع تھیں۔ چہرے ستے ہوئے، آنکھوں سے آنسو جاری، ہاتھوں میں سیپارے تلاوت ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز گاہے گاہے آجاتی تھی۔ ورنہ مکمل سکوت تھا۔ اور اسی کمرے کے ایک گوشے میں وہ ہستی ابدی نیند سو رہی تھی۔ جو اس کا مرکز تھی۔ اس خاندان کا محور تھی۔ خاندان کی بزرگ ترین ہستی، جسکی آواز اس گھر میں گونجا کرتی تھی۔ کسی کو نصیحت کر رہی ہے۔ کسی کو تسلی دے رہی ہے۔ کسی کو شعر سمجھایا جا رہا ہے۔ کسی کا مسئلہ حل کیا جا رہا ہے۔ ہر ایک کو رائے دینا، ہر ایک کو مشورہ دینا۔ آج وہ ہستی دین دنیا کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے بعد اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ جو بھی سنتا تھا فوراً پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان کے دوست پاکستان کے ہر گوشے میں، ان کے شاگرد ملک کے ہر گوشے میں، ان کے شاگرد ملک کے ہر شہر میں ہر جگہ اطلاع بھجوائی جا چکی تھی۔ عزیز و اقارب زیادہ تر کراچی میں ہیں۔ وہاں بھی اطلاع کروادی گئی تھی۔ بہت رکھ رکھاؤ والے شخص تھے۔ اِن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک۔ ہر ایک کی خوشی میں حاضر، کوئی بیمار ہے تو عیادت کر رہے ہیں۔ کسی کے بچے کو کالج اسکول میں داخلہ نہیں مل رہا تو اپنے تعلقات سے داخلے دلوا رہے ہیں۔ کہیں تعزیت کو جا رہے ہیں۔ کوئی پاس ہوا ہے تو مبارکباد دے رہے ہیں۔ خطوں کے جواب تو باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ادھر خط آیا اور وہ جواب لکھنے بیٹھے۔ ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ عجب ہنگامہ رہتا تھا۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں ان کی علمی و ادبی مصروفیات بھی بہت تھیں۔ کالج یونیورسٹی کے امتحان کے پرچے جانچے جا رہے ہیں۔ ریڈیو کیلئے تقاریر لکھی جا رہی ہیں۔ کسی ادبی موضوع پر مضمون یا مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ افوہ! آج کے اس مصروف ترین دور میں کسے اتنی فرصت

ہے کہ اندر باہر کے تمام کام نمٹائے تعلقات نبھائے۔ لیکن وہ تھے ہی ایسے بے تکلف ہر کام کئے جا رہے ہیں۔ دُنیا کا بھی خیال، عقبیٰ کا بھی خیال، کیسی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی تھی، کیسے کیسے کام رک گئے تھے۔ اذہان مفلوج ہو رہے تھے۔ دماغ ماؤف ہو رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہر چیز پر سکوت طاری تھا۔ ہر چیز ساکت وصامت تھی۔ ایک وقت ہی کی گردش جاری تھی۔ کاش! وقت بھی تھم سکتا لیکن کہاں۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ دوپہر ہوئی اور وہ بھی رینگتی رہی۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخری رسومات کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ انیس بھائی (ان کے چھوٹے داماد) اور افضال بھائی (ان کے منجھلے داماد) کمرے میں آئے۔ اماں بی کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اس بڑھاپے میں اور ایسا غم، خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ داماد اور بیٹے کا غم ایک ساتھ پڑا۔ لیکن کیا کیجئے کہ انسان بے بس اور مجبور ہے۔ جب پڑتی ہے تو اسے جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ صبح سے ان کے پلنگ کے نزدیک کرسی پر جوں کی توں بیٹھی تھیں۔ ایک لمحے کیلئے بھی ہٹی نہ تھیں آنکھوں کے سوتے شاید خشک ہو چکے تھے۔ بوڑھی نظروں نے کن کن واقعات کو دیکھا تھا۔ اور کمزور جسم نے کیسے کیسے حادثات کو سہا تھا۔ یہ تو انہی کا دل جانتا تھا۔ مگر ہر حال میں شاکر تھیں۔ اور صبر کرتی تھیں۔ آج بھی صبر و شکر کا پیکر بنی بیٹی سے لگی بیٹھی تھیں کتنے خوش قسمت تھے میاں آخری وقت تک ماں کی خدمت اپنے ہاتھوں سے کی۔ اپنے آرام کو تج دیا کہ ماں کی خدمت میں کمی نہ آنے پائے۔ ان کے پلنگ سے پلنگ ملا رہتا تھا۔ دن رات وہیں رہتے تھے۔ آدھی رات کو بھی ضرورت ہوتی تو پیشانی پر بل نہ پڑتا تھا۔ خود اپنے ہاتھ سے ان کا زیادہ تر کام انجام دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے چائے بھی خود بناتے تھے۔ اب کہاں ایسے لوگ۔ خال خال ہی باقی رہ گئے ہوں گے۔ اور انہی میں سے ایک میاں تھے۔ اور اب ان کی آخری رسومات کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ انہیں آخری غسل دینے کیلئے لیجایا جا رہا تھا۔ کتنا مشکل لمحہ تھا جس نے بھی دیکھا سسکیاں ضبط کرنی مشکل ہو گئیں۔ محسنہ باجی (ان کی بڑی صاحبزادی) کی چیخیں ضبط کرنے کے باوجود نکل گئیں۔ غزالہ باجی (ان کی چھوٹی صاحبزادی) انہیں چپ کرانے لگیں "میاں خفا ہوتے ہیں۔ چپ ہو جائیے۔ وہ ناراض ہوں گے۔" کتنا رعب تھا اس شخص کا کہ موت کے بعد بھی قائم رہا۔ ان کی خفگی کا خیال سبھی لوگوں کو ہر وقت رہتا تھا۔ غصہ

بہت جلد آجاتا تھا۔ لیکن یونہی بات بے بات پر نہیں۔ غلط کام کرنے پر ہمیشہ انھوں نے ڈانٹا، اور کام صحیح کروانے کی کوشش کی۔ غلط بات پر ہمیشہ ٹوکا کہ وہ غلط باتیں بالکل برداشت نہ کرسکتے تھے۔ خود کام کرتے تھے، چاہتے تھے۔ دوسرے بھی کام کریں۔ اسی جذبے اور لگن کے ساتھ جوان کے دل میں موجود تھا۔ ہمیشہ یہی کہا کرتے "اپنا کام کرو دیانتداری سے، ایمانداری سے۔ اور کسی سے ڈرنے کی دبنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اپنے کام پر حرف مت آنے دو۔ مومن وہی ہے جو ایمان و یقین کے ساتھ اپنے عمل کو جاری رکھے۔ دوسروں کے کام آئے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ کھایا پیا اور سوگئے۔ اٹھے اور بیکار گپ شپ میں شب و روز گزار دیئے"۔ انھوں نے خود ساری عمر کام کیا۔ اور دوسروں سے بھی کام کروانا چاہتے تھے۔ دوسروں کو کام کرتے دیکھتے۔ تو خوش ہوتے۔ لیکن جب کسی کو بیکار بیٹھا دیکھتے تھے تو انہیں غصہ آجاتا تھا کہ فضول وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کاش ایسی شخصیتیں دوسرا جنم لیکر دُنیا آسکتیں تو دُنیا واقعی جنت ہوتی۔ لیکن یہ خیالِ خام ہے۔ انسان کتنا بے بس ہے۔ یہ اشرف المخلوقات تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ کہ جب تقدیر نے چاہا بنادیا جب چاہا بگاڑ دیا۔

میاں کو آخری غسل دے کر تیار کر دیا گیا۔ ان کی میت بالکل تیار تھی۔ باہر صحن میں سے مردوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ کہ خواتین آخری دیدار کرلیں۔ وہ آنسو پونچھتیں، سسکیاں ضبط کرتی آگے بڑھیں۔ درود شریف اور کلمۂ شہادت کا ورد جاری تھا۔ لیکن کبھی کبھی دبی دبی چیخیں بھی نکل جاتی تھیں۔ سفید چادر سے چہرہ چھپا ہوا تھا۔ انیس بھائی نے چادر ہٹائی۔ کیسا پُر نور چہرہ تھا کہ نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔

عین اسی وقت کراچی سے آنے والے پہنچ گئے۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ نماز کو دیر ہو رہی تھی۔ گیٹ کھولا گیا اور میاں، جنہوں نے کبھی دوسروں کا سہارا نہ لیا تھا۔ ہمیشہ خود دوسروں کا سہارا بننے کی کوشش کی تھی۔ آج اس وقت دوسروں کے محتاج تھے۔ ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔ شاہ صاحب بخاریؒ کا مزار ان کے گھر کے پچھواڑے پر ہے اس کے احاطے میں نماز جنازہ کا انتظام تھا۔ صفیں درست ہو چکی تھیں۔ زاہد حسن فریدی صاحب (جو میاں کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں اور زاہد شب بیدار ہیں) کو یہ شرف ملا کہ وہ امامت کریں۔ نماز کے بعد ایک بار پھر دیدار کرایا گیا۔ کتنا سکون تھا چہرے پر۔ اور کیا

نہ ہوتا۔ دینی فرائض ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ دُنیا وی فرائض کو نبھانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ ہر ایک کی مدد کی۔ ہر ایک کو خوش رکھا۔ پھر بھلا سکون کیوں نہ ہوتا چہرے پر۔ اپنی زندگی کے ایک ایک پل کو رضائے الٰہی کے تحت بسر کیا۔ بڑی خوش قسمت زندگی تھی۔ اور موت۔ وہ زندگی سے بھی اچھی تھی۔ لاہور، کراچی تک سے لوگ پہنچ گئے تھے۔ ان کے دوست، ان کے عزیز رشتہ دار، ان کے شاگرد، ان کے غمخوار۔ کون تھا جس نے ان کے جنازے میں شرکت نہ کی ہو۔ سبھی تو موجود تھے۔ پانچ بجے کے قریب انہیں لیجایا گیا۔ وہ چلے گئے، ہمیشہ کے لئے۔ سبھی کو جانا ہے کہ وہی قوسب کی منزل ہے۔ لیکن۔ نہیں۔ وہ کبھی چھپ نہیں سکتے۔ کہ وہ تو ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ بھلا دلوں میں رہنے والے کبھی بھلائے جاسکتے ہیں۔ ان کے جانے سے کتنی محفلیں سونی ہوگئیں۔ کتنے لوگ بے سہارا ہوگئے۔ وقت بہت سے گھاؤ بھر سکتا ہے۔ پر یہ گھاؤ تو وقت کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ وہ یاد آتے رہیں گے۔ ہر موقع پر۔ ہر خوشی پر۔ ہر غم پر۔ ان کی شخصیت ہی ایسی باغ و بہار تھی۔ وجیہہ و جمیل۔ سرخ و سفید۔ وہ تو سرتا پا مقدس تھے۔ بال سر کے سفید۔ بھنویں سفید۔ رنگت سفید۔ اور پھر لباس سفید۔ بہت خوبصورت لگتے تھے۔ احترام کرنے کو خود بخود جی چاہتا تھا۔ جس محفل میں بیٹھتے چھا جاتے تھے۔ بڑوں میں بڑے ہیں۔ چھوٹوں میں چھوٹے، چٹکلے ہو رہے ہیں۔ لطائف سنائے جارہے ہیں۔ اپنی زندگی کے واقعات بڑی دلچسپی سے سناتے تھے۔ محفل زعفران زار بنی ہے۔ دوستوں کے دوست تھے بڑے صاف گو، بڑے صاف دل، ظاہر صاف، باطن صاف، پھر بھلا کیوں نہ بخشے جائیں گے۔ وہ تو بخشے گئے، ہم کتنے لوگ ان کی دعاؤں سے محروم ہوگئے، پر کتنے دلوں کی پُر خلوص دُعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پروفیسر سید افضل حسین اظہر
اسلامیہ کالج ۔ پشاور

محترم مہربان

یادِ اوصافِ آں محترم مہربان
در دلِ دوستاں، داستاں داستاں

تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے کہ فاروقی صاحب سے میری شناسائی ہوئی ۔ میں ایک نووارد کی حیثیت سے شعبۂ اُردو میں لیکچراری کا انٹرویو دینے آیا تھا ۔ فیصل آباد سے پشاور تک کے سفر کی غرض و غایت محض سیر و تفریح تھی ۔ مجھے یقین تھا کہ انٹرویو محض بہانہ ہوگا ۔ تقرر کا فیصلہ مقدر کے ہاتھوں ہوتا ہے ۔ اور وہ انٹرویو سے بھی پہلے ہوجاتا ہے ۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ مقدر نے یہ فیصلہ میرے ہی حق میں کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم اُس وقت صدر شعبہ تھے ۔ اُنہوں نے میری ایک غزل سُنی اور پسند کی ۔ فاروقی صاحب کی نگاہِ انتخاب بھی مجھ ناچیز پر پڑی ، اس لئے مجھے منتخب کرلیا گیا ۔ اُسی وقت جب میں واپس جانے لگا ، تو محترم فاروقی صاحب تھوڑی دُور تک میرے ساتھ آئے اور یہ خوشخبری سنائی کہ میرا انتخاب ہوچکا ہے ۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد باضابطہ بُلالیا جائے گا ۔ غالباً ایک بجے کا وقت ہوگا ۔ اور چار بجے شام کی چناب ایکسپریس سے مجھے واپس گھر جانا تھا ۔ سٹیشن پر میں ذرا وقت سے پہلے ہی چلا گیا ۔ جیسے ہی پلیٹ فارم پر گیا تو نظر فاروقی صاحب پر پڑی ۔ میں نے پوچھا آپ کیسے تشریف لائے ؟ فرمایا کہ آپ کو الوداع کہنے کیلئے آیا تھا ۔ میں اُن کی یہ عزت افزائی دیکھ کر سرشار بھی ہوا متأثر بھی ۔ میرے یہ کہنے پر کہ آپ نے ناحق زحمت فرمائی ۔ مجھے گلے لگا کر کہنے لگے کہ میں اس لئے بھی آیا تھا کہ شاید آپ ملازمت کیلئے اس قدر دُور آنا پسند نہ کریں ۔ مگر میرا یہ مشورہ ہے کہ ضرور آئیں ۔ آپ کا آنا ہمارے اور آپ کے دونوں کے لئے مبارک ہوگا ۔

جب تک گاڑی چل نہ پڑی وہ میرے ساتھ ہی بیٹھے رہے اور جاتے ہوئے

ایک دفعہ پھر گلے ملے۔ وہ تو چلے گئے۔ مگر میرے دل میں اُن کی نوازش اور اخلاص نے ہیجان برپا کر دیا تھا۔ ایک تو بے روزگاری کے عالم میں یکایک مژدۂ تقرر اور پھر اُن کا مخلصانہ طرزِ عمل۔ تمام راستے اور تمام رات میں انہیں احساسات میں کھویا رہا اور رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔

دس بارہ دن بعد مجھے اسلامیہ کالج میں حاضر ہونے کیلئے دعوت نامہ مل گیا۔ اور اگلے ہی دن تقرر کی منظوری کی اطلاع دینے کا حکم بھی۔ جس کی تعمیل میں نے بذریعہ تار کردی۔ اور فوراً روانہ ہوگیا۔ کیوں نہ آتا اور کیسے نہ آتا۔ آتے ہی کالج میں فاروقی صاحب سے ملا۔ وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ تقرر کے خط (Appointmet Letter) میں میرا نام کچھ غلط ٹائپ ہوگیا تھا۔ (میرا نام ایسا مشکل تو نہیں ہے مگر اکثر لوگوں کو یاد رکھنے میں مشکل پیش آتی ہے)۔ فاروقی صاحب نے اُسے اپنے قلم سے صحیح کر دیا تھا اور پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ بھائی میں نے ڈرتے ڈرتے ایسا کیا تھا۔ کہیں اوندھی کھوپڑی والے یہ نہ کہہ دیں "تو نے آدمی ہی بدل دیا"۔۔۔ کالج میں میرا پہلا دن تھا۔ قدرتی طور پر میں اُکھڑا اُکھڑا اور گھبرایا ہوا سا تھا۔ مگر وہ میری دل کی کیفیت کو بھانپ گئے۔ مجھے جماعتوں میں لے گئے اور حاضری خود لگانے کے بعد طلبہ سے کہا کہ کل سے میری بجائے یہ پڑھائیں گے اور اِس خوشی میں آپ سب کو چھٹی ہے۔ اور یوں مجھے بغیر تیاری کے فی البدیہہ پڑھانے سے نجات مل گئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے چپراسی سے لیکر دفتر کے تمام کلرکوں سے ملوایا۔ پھر پرنسپل، رجسٹرار اور وائس چانسلر تک کے پاس لے گئے۔ اور اس کے بعد اپنے ہاں کھانا کھلانے لے گئے۔

پشاور یونیورسٹی نے ایم اے کلاس (اُردو) شروع کردی تھی۔ اسلئے فاروقی صاحب اسلامیہ کالج کی بجائے وہاں جارہے تھے مگر میری دلجمعی کی خاطر اُنہوں نے اسلامیہ کالج میں بھی تھرڈ ایر کو پڑھانا جاری رکھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں اُنہیں اور کوئی مجبوری نہ تھی۔ سال اول۔ سال دوم اور سال چہارم کے طلباء میرے حوالے کردئے گئے تھے۔

میں تھوڑے ہی عرصے میں فاروقی صاحب کی وضعداری اور خوش سلیقگی کا

حد سے زیادہ قائل ہوگیا۔ میں جب بھی کالج آتا وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہوجاتے تھے۔ اور مجھے اپنے دل میں فخر اور خفت دونوں قسم کی کیفیات محسوس ہوتی تھیں۔ اُن کے پاس ہر وقت بھنی ہوئی سونف اور چھالیہ سے بٹوہ بھرا رہتا تھا۔ جسے وہ بڑے تپاک اور شفقت سے سب کو (چاہے وہ طالب علم ہوں) پیش کیا کرتے تھے۔ سونف اور چھالیہ کا یہ مرکب بڑا لذیذ ہوتا تھا اور محویت یا مصروفیت کے عالم میں غیر معمولی لطف دیا کرتا تھا۔ سگریٹ پینے والوں اور پان کھانے والوں کے مقابلے میں یہ طرز خاص انہیں کی ایجاد تھی۔

اُن کے مزاج میں دو متضاد خصوصیات کا امتزاج تھا۔ برہمی اور خوش طبعی تقریباً برابر اور ہر وقت اُن کی دلپذیر گفتگو سے عیاں ہوتی رہتی تھی۔ انہیں دونوں کیفیات نے اُن کی شخصیت کو رُعب داب، دلنوازی اور خود اعتمادی عطا کی تھی۔ وہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ ہر چند کہ بڑے لوگوں سے ملنے میں اُن کا انداز متواضع ہوتا تھا۔ لیکن اُس میں ہچکچاہٹ یا جھجک بالکل موجود نہ ہوتی تھی۔ عام طور پر وہ جس سے بھی ہمکلام ہوتے وہ اُن سے مؤدبانہ طور پر مرعوب ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ جب کبھی کسی سے ناراض ہوجاتے یا کسی کی بات پر طبیعت میں غصہ پیدا ہوجاتا تو پھر بے دھڑک اور بے روک ٹوک صلواتیں سُناتے تھے۔ اور وہ بے نقط باتیں اُنہی کی زبان سے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اُس سلسلے میں چند مخصوص ناگفتہ بہ الفاظ اُن کی نوک زبان پر رہتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آغا صادق (مرحوم) کوئٹہ سے پشاور آئے۔ پہلے مجھ سے ملے اور پھر مجھے ساتھ لے کر فاروقی صاحب سے ملنے کی غرض سے شعبۂ اُردو گئے۔ فاروقی صاحب حسب معمول انتہائی تپاک اور تواضع سے پیش آئے۔ آغا صادق نے یہ شعر پڑھا ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا ؛ برابر ہے یہ شہر دیکھا نہ دیکھا

فاروقی صاحب نے فرمایا کہ ہمارے شعبہ کے طلبہ کے لئے کوئی وقت عنایت کیجئے تاکہ آپ کے کلام سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے (مگر آغا صادق کو فاروقی صاحب کی دعوت سے پہلے میں نے اگلے دن شام کی نشست کے لئے مدعو کرلیا تھا) اُن کے

پاس وقت نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے میرے گھر کی دعوت پر آنے کی پابندی کے باعث معذوری کا اظہار کیا۔ چنانچہ میں نے فاروقی صاحب کو بھی اپنے ہاں آنے کی پُرزور دعوت دی۔ جسے انہوں نے بہرحال منظور کر لیا۔ اگلی شام کو جب تمام حضرات غریب خانے پر تشریف لے آئے۔ تو ایک ایسے شاعر جن کو فاروقی صاحب بالکل پسند نہ کرتے تھے محفل میں موجود تھے۔ اور اُن کی موجودگی فاروقی صاحب کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ مجھے اس شدید ناپسندیدگی کا علم نہ تھا۔ فاروقی صاحب نے چند لمحے خاموشی اختیار کی پھر یکایک اُن کا چہرہ متغیّر ہو گیا۔ ایک اور دوست کو وہ چپکے سے کمرہ سے باہر لے گئے۔ اور تھوڑی دُور جا کر اپنے مخصوص الفاظ میں اظہار برہمی شروع کر دیا۔ اُن کے غصّے کا مرکز ایک تو وہی شخصیت تھی جس کو وہاں مدعو کیا گیا تھا۔ اور بہ الفاظ دیگر میں بھی کہ میں نے کیوں دونوں کو بہ یک وقت یکجا کیا، زور زور سے کہتے رہے کہ جب اُس "فلاں ابن فلاں وغیرہ" کو معلوم ہو گیا کہ میں بھی موجود ہوں تو وہ کیوں بیٹھا رہا اور اُٹھ کر نہیں گیا۔ میں نے باہر جا کر معذرت کی کہ مجھے علم نہ تھا۔ ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا، اور کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے مگر اُن کا غصہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ ایک اور رفیق شاعر کمرے سے اُٹھ کر آئے اور آخر کار اُنہیں اپنے گھر لے گئے۔ کیونکہ فاروقی صاحب کسی طرح بھی کسی کے رنے کہنے سے نہ رُکے۔ اُن کے بعد شعر و شاعری کا دور تو ہوا مگر اُن کی عدم موجودگی کے احساس سے تقریب بڑی افسردہ رہی۔

ایک بار تین چار دوستوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک اُن کے شاگرد ملے۔ جو ابھی ابھی کچھ روز پہلے لیکچرار ہو گئے تھے۔ فاروقی صاحب کو سلام کر کے وہ بھی ساتھ چلنے والوں میں شامل ہو گئے۔ اور قریب آ کر فاروقی صاحب سے یوں مخاطب ہوئے "اور سنائیے فاروقی صاحب کیا حال ہے؟" فاروقی صاحب چپ رہے۔ وہ صاحب پھر مُصر ہو کر بولے "اور سنائیے فاروقی صاحب کیا حال ہے؟" پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد وہی سوال دُہرایا گیا۔ "اور سنائیے ...." اور پھر فوراً "اور سنائیے..... فاروقی صاحب"۔ اب فاروقی صاحب اور کچھ نہ سنائیں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان کا پارہ ایسا چڑھا کہ توبہ توبہ۔ غصے سے آگ بگولا ہو کر بولے "بھائی تم ناچنا شروع کر دو تو میں گانا سناؤں۔ کیوں منظور ہے؟ اور کیا سننا چاہتے

ہو۔ کچھ اور سناؤں ؟"

ہنسنا تو کجا کسی میں دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ کچھ دیر خموشی سے چلتے رہنے کے بعد وہ حضرت جو بار بار کچھ سنانے کی فرمائش کئے جا رہے تھے۔ جب چاپ الگ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب موصوف کا غصّہ رفع ہوا تو کہنے لگے "مجھ سے جو ایسی گفتگو کرے گا، میں اُسے ایسا ہی جواب دوں گا۔" شکر ہے پھر کچھ ارشاد نہیں کیا ورنہ اس سے بھی زیادہ غصّے کی حالت میں جو کچھ اُن کی زبان سے نکلتا اس کے بارے میں خود ہی کہتے تھے، کہ "میں اُردوئے معلّٰی میں بات کرتا ہوں"۔

مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ "تمہارے لئے فارسی میں ایم اے کرنا بہت ضروری ہے اگر ایسا نہیں کیا تو میں مار مار کر مجبور کر دوں گا۔" میں نے عرض کیا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر فارسی میں نے کبھی پڑھی تک نہیں۔ یہ تو بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ کہا "کوئی مشکل نہیں۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے دیوانِ حافظ پڑھو اور پھر گلستانِ سعدیؒ پڑھ ڈالو سب فارسی آجائے گی"۔

چنانچہ میں نے اُنہیں کے نسخے پر عمل کیا اور اس کا بہت مفید نتیجہ برآمد ہوا یعنی مجھے طلائی تمغہ بھی حاصل ہو گیا۔ اِس سے وہ بہت مسرور ہوئے اور مجھے فراخ دلانہ مبارکباد دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک روز اُن سے میں نے کہا کہ ایک دوست کی رائے میں شبلی کی شعر العجم میں افسانوی رنگ زیادہ ہے جو طلبہ کے نقطۂ نظر سے اسقدر مفید نہیں جتنی ایک نئی کتاب ادب نامۂ ایران (مصنفہ مرزا مقبول بیگ بدخشانی) ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں یاد دہانی کے لئے مختصراً مفید اشارات کو یکجا درج کیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب غصّے میں بھر کر کہنے لگے "یہ کس گدھے نے آپ سے کہدیا ہے، لاحول ولاقوۃ۔ جو ذوق نقد شبلی کے ہاں ملتا ہے وہ کہیں دستیاب نہیں۔ اس لئے شعر العجم کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ باقی جتنی بھی کتابیں ہیں اُن میں شعر العجم ہی کی خوشہ چینی سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔" اُن کا جواب سُن کر میں کچھ نہیں بولا۔ سوچتا آج تک ہوں کہ اُن کی رائے کس قدر صحیح تھی۔

برہم مزاجی کے باوصف اُن کی سیرت، عالی ظرفی، شگفتگی اور لطافت کا مکمل نمونہ تھی۔ ایک بار ہم تین دوست اُن سے ملنے کے لئے اُن کی قیامگاہ پر گئے

اُن دِنوں وہ صدر میں رہا کرتے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ اور غالباً دن کے دو بجے ہوں گے۔ غیر ذمے داری یا ناتجربہ کاری میں نے یہ بالکل نہ سوچا کہ شاید وہ اس وقت سو رہے ہوں۔ ہم تینوں میں ایک اُن کے عزیز شاگرد بھی تھے۔ فاروقی صاحب واقعی سوتے سے اُٹھ کر (اور یقین ہے کہ بے مزہ ہوکر) باہر تشریف لائے، رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے کہا افسوس ہے کہ ہم نے آپ کو سونے نہیں دیا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں ہے مگر اپنے شاگرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی تلخ کامی کو مزاح میں بدلتے ہوئے فرمایا کہ "یہ مجسّم حماقت جو آپ کے ساتھ ہے اس نے کہا ہوگا کہ اسی وقت چلو کیونکہ یہی وقت اُن کے سونے کا ہے۔" مگر اُن کا غصّہ بھی (کم از کم اُس وقت) ایسا پیارا تھا کہ ہم تو کیا بُرا مانتے اُن کے شاگرد عزیز نے بھی اُس کو بخوشی گوارا کیا۔ پھر بھی میں اپنے دل میں کچھ خفیف ضرور ہوا۔ بہرحال سب کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے اور پھر کافی دیر تک محفل جمی رہی۔ نہ صرف اُنھوں نے اپنی نیند کے نقصان کی پروا نہ کی بلکہ اپنی شائستہ گفتگو سے وہ انجمن آرائی کی کہ مجھ ایسے خاموش طبیعت کو بھی زندہ دلی کے خوشگوار لمحات میسر آئے۔ اُن میں یہ نمایاں وصف تھا کہ وہ نہ خود اُداس ہوتے تھے۔ نہ دوسروں کو اُداس رہنے دیتے تھے۔

ایک دن شام کے قریب غریب خانہ پر تشریف لائے کچھ دیر بیٹھے رہے۔ میرے ساتھ دو چھوٹے بھائی بھی شریک گفتگو تھے۔ جب جانے لگے تو میں نے کہا، کہ ہم تینوں آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔ فرمایا "جی نہیں چھوڑنے کے لئے چار کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے پھر کہا فاروقی صاحب دیر زیادہ ہوگئی ہے۔ آج یہیں قیام فرمایئے۔ بولے " یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ گھوڑا ہمیشہ اپنے تھان پر ہی خوش ہوتا ہے"

ایک مرتبہ ہماری یونیورسٹی میں سائنس کانفرنس کی تقریبات کے سلسلے میں شام کو پر تکلّف چائے کا اہتمام تھا۔ بہت سے احباب کے جُھرمٹ میں فاروقی صاحب نے اپنی دلکش اور سحر انگیز گفتگو سے اپنے گرد و پیش کو مائل اور متأثر کر رکھا تھا — عین اُسی وقت میرے ایک دوست مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ "اظہر صاحب! پریم چند نے 'روشنی' افسانے میں 'سانڈنی' کا لفظ استعمال کیا ہے' یہ کیا چیز ہے۔"

میں نے کہا کہ سانڈنی سے مراد اونٹنی ہے۔ اُنھوں نے اعتراض کیا کہ سانڈنی کا مطلب اونٹنی کس طرح ہوگیا۔ سانڈنی کا تعلق تو سانڈ سے ہونا چاہیئے۔ آخر اونٹ سے کیا مناسبت؟ مجھے کوئی جواب نہ سوجھا مگر فاروقی صاحب فوراً بول اُٹھے کہ "اُن سے کیا پوچھتے ہیں۔ بھائی یہ بات مجھ سے پوچھیے۔ کسی سانڈ کا اونٹنی سے تعلق ہوگیا ہوگا اور اسی کی نسل کو سانڈنی کہا جانے لگا۔ اور اب آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" سب لوگ اس جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور بیساختہ ہنسنے لگے۔ معلوم نہیں جن کو اعتراض تھا اُن کا منشا بھی پورا ہوا یا نہیں۔

شعبۂ اُردو کے اُستاد فارغ اوقات میں فاروقی صاحب کے اِردگرد بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن کسی کام سے میں بھی چلا گیا۔ فاروقی صاحب اپنے شاگرد اور رفیق ڈاکٹر جعفری سے فرما رہے تھے: "آخری پیریڈ میں آپ غالباً بہت کم جاتے ہیں، کل میں گیا تو طلبہ اُستاد کی شان میں مرثیہ پڑھ رہے تھے۔"

جعفری صاحب بے ساختہ اپنے مخصوص سادہ اور سنجیدہ انداز میں کہنے لگے "فاروقی صاحب! کس اُستاد کی شان میں مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ وہ جو آیا نہیں کرتا، یا وہ جو اُس وقت پڑھانے چلا گیا تھا۔" اور سب کی ہنسی میں فاروقی صاحب خود بھی ہنسنے لگے۔

سخن شناسی کی صلاحیت اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ میں نے اکثر دیکھا کہ مناسب طریقے سے اُن پر اعتراض بھی کیا جائے یا تھوڑا بہت مذاق بھی کر لیا جائے تو وہ فراخدلانہ طور پر محظوظ بھی ہوتے تھے۔ میں نے ایک بار اُن پر اعتراض کیا کہ فاروقی صاحب آپ نے اعلیٰ ثانوی مدارس کے لئے جو گرامر لکھی ہے اُس میں جمع مؤنث متکلم کا صیغہ بھی مؤنث ہی لکھا ہے۔ یعنی "ہم گئیں" اور "ہم جاتی ہیں" وغیرہ۔ حالانکہ یہ خلافِ محاورہ ہے۔ اور اکثر گرامر کی کتابوں میں بھی اس صیغے کو مذکر ہی بتایا گیا ہے۔ یعنی مذکر ہو تو بھی "ہم جاتے ہیں" اور مؤنث متکلم ہو تو بھی "ہم جاتے ہیں"۔ فرمایا "بھائی اگر اور کتابوں میں مؤنث نہیں لکھا تو مؤنث ہونا چاہیے۔ گرامر تو اصول کی بات ہوتی ہے اور قاعدہ اپنی جگہ قاعدہ ہے"۔ میں نے کہا محاورے کے مقابلے میں گرامر کا اصول شکست کھا جاتا ہے۔ اور پھر اُسے گرامر کو چاروناچار تسلیم کرنا

پڑتا ہے۔ پھر کچھ سوچ میں پڑ گئے، اور کہنے لگے "اچھا چلئے یوں ہی سہی میں اسے نظرثانی شدہ اشاعت میں درست کردونگا"۔ میں دل ہی دل میں اپنی جیت پر تو خوش تھا ہی مگر اس بات پر اور متأثر ہوا کہ انہوں نے میرے اعتراض کو فراخدلی سے برداشت کیا۔

وہ نہ صرف حاضر جواب، بذلہ سنج ہی تھے بلکہ قابلِ تعریف مقرر بھی تھے۔ اُردو زبان کے تو وہ اُستاد تھے ہی، انگریزی میں بھی سلاست روانی اور شُستگی کے ساتھ بے تکان فی البدیہہ تقریر کر سکتے تھے۔ اور اکثر کہا کرتے تھے کہ انگریزی میں نے پیسے دے کر نہیں پڑھی یعنی یہ کمال محض اُن کی ذاتی محنت اور لگاؤ کا نتیجہ ہے۔

اپنے خوبصورت، بامعنی، مختصر اور موثر جملوں سے سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتے تھے۔ مشاعروں کی صدارت کے لئے مندرجہ بالا اوصاف کے علاوہ اُن کی دلکش اور بارُعب شخصیت بڑی موزوں تھی۔ اکثر کالجوں کے مشاعروں میں جہاں کلام سُننا کم اور شور مچانا زیادہ مقصود ہوتا ہے وہ مکمل حد تک نظم و ضبط کی فضا پیدا کر دیتے تھے۔ اور سوئے اتفاق سے اگر کسی شاعر کو داد کی بجائے بیداد کی عملیات سے سابقہ پڑ جاتا تو وہ کچھ مسکراتے ہوئے ارشاد فرماتے: "سامعین پہلے کلام کو غور سے سنئے اور پھر داد کے ساتھ ساتھ حوصلہ بھی دیجئے" ـــــ اور یوں پھر مکمل سکوت کی فضا طاری ہو جاتی۔

فاروقی صاحب شعر فہم بھی تھے اور شاعر بھی، بعض لوگ صرف شاعر ہوتے ہیں اور بعض صرف شعر فہم ہوتے ہیں مگر اُن میں یہ دونوں باتیں بیک وقت موجود تھیں۔

یوں وہ ادب میں بہت زیادہ جدت پسندی کے قائل نہیں تھے بلکہ وضعِ قدیم اُن کو زیادہ مرغوب تھی، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد اُردو ادب نے بالکل ترقی نہیں کی۔ پریم چند کے افسانے ہوں یا فراق گورکھپوری کی غزلیں وہ دونوں کے خلاف شدید ردِّ عمل کا اظہار کرتے تھے۔

مجھے اپنی شاعری کے سلسلے میں وہ اکثر مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر اشعار کے سلسلے میں مجھے جو مشکلات پیش آیا کرتی تھیں میں اُنہیں سے

دریافت کیا کرتا تھا، اور وہ مجھے تقریباً ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا کرتے تھے۔
مجھے تین باتیں ابتک یاد ہیں۔ شیخ سعدی کا یہ قطعہ مشہور ہے:۔

شبِ تاریک دوستانِ خدا   می بتابد چوں روزِ رخشند ہ
این سعادت بزورِ بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشند ہ

میں نے موصوف سے پوچھا کہ "می بتابد" کس اصول کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اسلئے کہ فارسی میں مضارع کے ساتھ می لگایا جائے تو ب نہیں لگایا جاتا۔ مثلاً "می رود" ہوتا ہے "می برود" نہیں استعمال ہوتا پھر سعدی نے 'می بتابد' کیوں استعمال کیا؟
فرمایا "بھئی یہاں اُصول کا سوال نہیں بلکہ اس کا تعلق محاورے اور روزمرہ سے ہے۔ کہیں 'ی' اور 'ب' ایک ساتھ استعمال کرلئے جاتے ہیں کہیں نہیں"۔
اسی طرح اقبال کے اس مصرع کے بارے میں "غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح"۔ میری طرف سے سوال کیا گیا کہ آنکھ کا تارا کیا چیز ہے۔ فاروقی صاحب نے جواب دیا کہ یہ آنکھ کی پتلی سے استعارہ ہے۔ فیض کا ایک مشہور شعر ہے:

بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

اس پر میں نے یہ استفسار کیا کہ فاروقی صاحب درد کو چاند سے تشبیہ دیکر بجھا بھی دیا۔ حالانکہ چاند تو بجھا نہیں کرتا۔ چھپا کرتا ہے۔ فرمانے لگے "بھئی چاند کا درد ہو یا درد کا چاند ہو اگر اُس کے لئے بجھنا لایا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر نے ڈبل استعارہ استعمال کیا ہے"۔
جس طرح ادب میں اُن کا رجحان قدامت کی طرف تھا اسی طرح وہ طرز علاج کے سلسلے میں بھی یا یونانی دواؤں کو پسند کرتے تھے یا ہومیوپیتھی دواؤں کے قائل تھے۔ ہومیوپیتھی علاج خود بھی جانتے تھے۔ اُن کے پاس گھر پر ہر وقت چھوٹا سا خوبصورت ڈبہ دواؤں کی شیشیوں سے بھرا رہتا تھا۔ خود بھی حسبِ ضرورت کھاتے رہتے تھے، اور یہ کہتے جاتے تھے،" دوا کھانے کا یہی اصول ہے کہ جب یاد آیا کھالی۔ وقت کی پابندی اور پرہیز کا میں قائل نہیں۔ دوا کھانے میں وقت کی پابندی یا غذا میں پرہیز کا خیال کون کرسکتا ہے"۔ دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کی بیماریوں کے لئے اُن سے دوا لینے آتے

رہتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب اُن سے کہنے لگے کہ فاروقی صاحب! بچوں کے پیٹ میں کیڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اُن کو صحت ٹھیک نہیں رہتی۔" فاروقی صاحب نے برافروختہ ہو کر جواب دیا "یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ اصل میں آج کل کے ڈاکٹروں کے دماغ میں کیڑے ہوتے ہیں۔ ورنہ کسی کے پیٹ میں کیڑے نہیں ہوتے۔"

میں اپنی غزلوں کا ایک مختصر سا مجموعہ چھپوانا چاہتا تھا (جو آج تک نہیں چھپ سکا) میری خواہش تھی کہ فاروقی صاحب سے ایک چھوٹا سا دیباچہ لکھنے کی درخواست کروں چنانچہ میں اس مقصد کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا ارادہ سُن کر بڑے مسرور ہوئے۔ مسودہ مجھ سے لیکر ملاحظہ کرنے لگے۔ میں نے عاجزی سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس میں تنقید حیات والی بات کم ہے۔ جذباتی رنگ زیادہ ہے اور وہ بھی ناپختہ۔ کہنے لگے "تنقید حیات شمسری کو گولی مارو۔" بس یہ مسوّدہ میرے پاس چھوڑ دو۔ کافی عرصہ وہ مسوّدہ اُنہیں کے پاس رہا جس کا انہوں نے بغائر مطالعہ بھی کیا۔ نہ صرف مجھے میری کوتاہیوں سے آگاہ کیا بلکہ میرے اشعار کا ایک مختصر سا انتخاب تیار کر کے مجھے بھجوادیا کہ یہ اشعار مجھے بہت پسند ہیں۔ اس سے پہلے محترمی شمسی صاحب نے بھی ایک انتخاب تیار کیا تھا۔ جس کو میں نے فاروقی صاحب کی خدمت میں بھی تائید یا تردید کے لئے پیش کر دیا تھا مگر اُنہوں نے شمسی صاحب کے پسندیدہ اشعار میں سے بیشتر شعروں پر صاد کیا۔

شمسی صاحب نے میرے مسوّدے کے مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں۔ ذاتی تجربات نہیں مگر فاروقی صاحب نے بغور مطالعہ کے بعد مجھ سے یہ سوال کیا کہ وہ کون ہستی ہے جس نے مجھے اس قدر جذباتی شاعری پر مجبور کیا۔ میں نے اس سلسلے میں شمسی صاحب کی رائے دُہرادی۔ کہ اُن کی رائے میں یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں۔ اور یوں یہ سب کچھ رسمی اور روایتی شاعری کی ذیل میں آتا ہے۔ فرمایا نہیں یہ غلط ہے۔ کسی جذباتی تجربے کے بغیر ایسے شعر لکھنا ممکن ہی نہیں۔ مجھے جلدی اتا پتا بتاؤ کہ وہ ہستی ہے کون؟ ۔ میں نے عرض کیا کہ اپنے مُنہ سے میں اعترافِ جُرم کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ فیصلہ آپ دونوں (یعنی شمسی صاحب اور فاروقی صاحب) خود ہی کیجئے کہ کوئی ہستی ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ فیصلہ تو کیا ہوتا۔ دیباچہ بھی آج

تک نہیں لکھا جا سکا۔ اور نہ وہ مجموعہ آج تک اشاعت کے مراحل سے گزر سکا۔ البتہ فاروقی صاحب کے دست مبارک کا لکھا ہوا انتخاب ضرور موجود ہے۔

ہم جیسے لوگ جن کو اپنے ماحول سے ہمیشہ شکایات ہی رہتی ہیں۔ اور جو زندگی میں کبھی آسودہ نہیں ہوتے اگر ایسے مخلص ہمدرد اور نگہبان دوست سے محروم ہو جائیں تو کیا کریں۔ اُن کا سفرِ آخرت ہمارے لئے بے یار و مددگار رہ جانے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

تم تھے تو ہم پہ ایک زمانہ تھا مہرباں
تم کیا گئے کہ کوئی ہمارا نہیں رہا

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی
شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی

پروفیسر طاہر فاروقی کی سوانح نگاری

(تجزیاتی مطالعہ)

ایک اچھی سوانح محض کسی فرد کی پیدائش، خاندان، تعلیم و تربیت، مشاغلِ زندگی اور وفات کا بیان ہی نہیں ہوتی بلکہ اسکے ظاہر و باطن، عادات و اطوار، اخلاق و معاشرت، وراثت اور نفسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان بھی ہوتی ہے۔ وہ تمام باتیں سوانح نگار کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں، جن سے شخصیت کی تعمیر اور ایک مکمل تصویر کے بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اسی لئے اچھا سوانح نگار اپنے موضوع کے سطحی واقعات اور ظاہری حالت بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اس کی باطنی کیفیت، نفسیاتی حالت، ذہنی ارتقا، رجحانات اور خوبیاں اور کمزوریاں بھی دکھاتا ہے۔ تاکہ ایک واضح تصویر ابھر کر سامنے آسکے صرف واقعات کا سلسلے وار بیان کر دینا فنی اعتبار سے کافی نہیں بلکہ انتخابِ واقعات اور معمولی جزئیات تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اظہار بیان میں ایک مخصوص سلیقہ اور واقعات کی تدوین میں حسنِ ترتیب بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اچھی سوانح صرف واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ ایک دلچسپ تخلیق ہوتی ہے جس میں زندگی کے خد و خال ابھرتے اور کردار کے اساسی پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس طرح فرد کی زندگی نہ صرف زیادہ جاذبِ نظر ہو جاتی ہے بلکہ فطری بھی معلوم ہوتی ہے۔ سوانح میں صداقت اور سچائی بہت ضروری ہے۔ سچائی کے مفقود ہو جانے سے سوانح کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ لیکن محض صداقت اور خشک واقعات سوانح میں دلچسپی نہیں پیدا کر سکتے، دلچسپی پیدا کرنے میں اظہار بیان کی خوبی و خوش اسلوبی کو بڑا دخل ہوتا ہے اور اسی عنصر کی بنا پر سوانح کو ادب کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے۔

* * *

اُردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز حالی کی "حیات سعدی" سے ہوتا ہے۔ جو ۱۸۸۶ء

میں شائع ہوئی۔ حالی نے نامکمل تذکروں اور سعدی کے کلام کی مدد سے یہ سوانح مرتب کی تھی۔ بقول شبلیؒ یہ سعدی کی محققانہ سوانح عمری ہے اور قدیم تذکرہ نویسی کے مقابلے میں فن بیوگرافی میں ایک نیا راستہ دکھاتی ہے۔ حیاتِ سعدی کے دیباچے میں حالی نے لکھا تھا "بیوگرافی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سودمند ہے۔ کیونکہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے۔ اور بیوگرافی سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامنگیر ہوتا ہے"۔ سب جانتے ہیں کہ نیکی کو عام کرنے اور مسلمانوں کو اعمالِ صالحہ کی تشویق و ترغیب دینے کا جذبہ حالی کے دل میں شدت سے موجزن تھا۔

پروفیسر طاہر فاروقی نے تین سوانحعمریاں لکھی ہیں۔ سرکارِ دوعالم، سیرتِ اقبال اور سیرتِ امیرملت۔ وہ اگرچہ رسمی طور پر حالی کے شاگرد نہیں تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگاری کے فن اور اس کی غایت کے معاملے میں وہ حالی ہی کے ہمخیال تھے۔ چنانچہ ان کی لکھی ہوئی دو سوانحعمریوں سرکار دوعالم اور سیرت امیرملت میں وہی عقیدت، محبت اور اخلاقی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ جو حالی کی سوانح عمریوں میں ملتا ہے۔ اور جہاں تک تیسری سوانح عمری سیرت اقبال کا تعلق ہے۔ یہ بھی حالی کی حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کی طرح بیشتر ادبی تنقید میں بدل گئی ہے۔ اگرچہ اس کا عنوان ہے " سیرتِ اقبال"۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح و سیرت پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُردو میں شبلی کی سیرت النبیؐ اور قاضی سلیمان منصورپوری کی رحمۃ للعلمین نہایت مستند اور مفصل کتابیں ہیں لیکن پروفیسر فاروقی نے ایک ایسی مختصر مگر جامع کتاب سیرتِ نبویؐ پر تالیف کرنے کی ضرورت محسوس کی جس کو خریدنا ہر شخص کے بس میں ہو اور وہ کم سے کم وقت میں اُن تمام مطالب سے مستفید ہو سکے جو سیرت کی ضخیم اور گراں قیمت کتابوں میں جمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ "سرکار دوعالم" کے نام سے انہوں نے چھوٹے سائز کے دوسو صفحات کی ایک کتاب لکھی جس کی تالیف کے دوران میں تمام متداول کتبِ سیرت اُن کے پیشِ نظر تھیں۔ انہوں نے خاص طور پر اس امر کا لحاظ

رکھا کہ کوئی بات اس مختصر کتاب میں ایسی نہ آنے پائے جو تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے مستند نہ ہو۔ سب سے پہلے فاضل مصنف نے عرب اور اہل عرب کے بارے میں کچھ ضروری باتیں دی ہیں، پھر عرب کی سیاسی اخلاقی اور مذہبی حالت کا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد بعثت کی ضرورت کو نمایاں کیا ہے۔ اور مدعیِ رسالت کی شناخت کے اصول بتائے ہیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب اور شجرۂ نسب دے کر دوسرے باب میں حضور کی تشریف آوری کی بشارتیں پرانی مذہبی کتابوں سے نقل کی ہیں۔ پھر حضورؐ کی ولادت و رضاعت اور عہد طفولیت و عہد شباب کا تذکرہ اور تجارت و عقد کا بیان ہے؛ قبل بعثت حضورؐ کی عادات اور خصائل کے ذکر پر کتاب کا دوسرا باب ختم ہوجاتا ہے۔ تیسرے باب میں وحی کے مفہوم کو سمجھا کر حضورؐ پر پہلی وحی کے نازل ہونے کا واقعہ دیا ہے۔ اور پھر پہلے ایمان لانے والوں کا ذکر کیا ہے۔ عام دعوتِ اسلام، قریش کی مخالفت اور حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے ذکر پر تیسرا باب ختم ہوتا ہے۔ چوتھے باب میں ہجرتِ حبشہ، شعب ابی طالب، عام الحزن، معراج تبلیغی سفر اور بیعات عقبہ کا بیان ہے۔ پانچویں باب میں حضورؐ کی ہجرت، مواخات اذان، یہود سے معاہدے اور تحویل قبلہ کا ذکر ہے۔ چھٹا باب غزوات و سرایا، صلح حدیبیہ سلاطین کو دعوتِ اسلام، فتح مکہ، پہلے حج، حجۃ الوداع اور سفرِ آخرت پر مشتمل ہے۔ یہی باب سب سے طویل ہے۔ ساتویں باب میں شمائل نبویؐ اور معجزات کا ذکر ہے۔ آٹھواں باب اہل بیت کے بارے میں اور آخری باب آلِ نبی کے بارے میں ہے۔

کتاب کے اس تجزیے سے مضامین و مفاہیم کی ترتیب کی خوبی ظاہر ہے۔ عام قارئین کے ذہن میں پیدا ہونے والے ممکنہ سوالات کے جواب بھی پروفیسر فاروقی نے ازخود فراہم کر دیے ہیں۔ مثلاً ضرورتِ بعثت، حکمِ جہاد، کثرتِ غزوات کے اسباب، وحی کی حقیقت، معراج، معجزات وغیرہ کے مباحث مناسب موقعوں پر آسان اور سلیس انداز میں پیش کیے ہیں تاکہ اسلام کے مخالفین کے اعتراضات قارئین کے ذہن میں الجھن نہ پیدا کرسکیں۔ پروفیسر صاحب کا اسلوب کس قدر سادہ، رواں اور دلکش ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"عرب بُت پرست تھے۔ اور قبائل میں جاہلانہ اور وحشیانہ عادات جمع تھیں

مگر خانۂ کعبہ کی عظمت سب کے دل میں تھی۔ دور دور سے آکر اپنے طریقے پر حج کرتے اور چار مہینے تک لڑائی جھگڑے بند رہتے، مسلمان مکے سے نکالے گئے تھے۔ مگر مکے کی یاد اُن کے دلوں سے کبھی دور نہ ہوئی تھی، کعبہ ان کا قبلہ تھا اس لئے اس کی زیارت کا شوق ان کو کھینچتا تھا۔ مگر اہلِ مکہ کی مخالفتیں مانع آتی تھیں۔ سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلعم نے خواب دیکھا کہ مسلمان حرم مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو آپ نے عمرے کے ارادے سے مکے کی طرف کوچ کا اعلان فرما دیا اور ہدایت فرما دی کہ مسلمان ہتھیار لے کر نہ جائیں۔ صرف تلواریں ساتھ تھیں مگر وہ بھی نیام کے اندر تھیں"۔

مختصر یہ کہ پروفیسر فاروقی کی "سرکار دو عالم" نہ صرف اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی قابلِ تعریف ہے۔

"سیرتِ امیرِ ملت" تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر محیط سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری کی مفصل سوانح عمری ہے جس کے لئے سارا مواد خود محدث علی پوری کے پوتے سید اختر حسین شاہ نے فراہم کر کے پروفیسر فاروقی کو دیا کہ وہ اس کی مدد سے "سیرتِ امیرِ ملت" لکھیں۔ مضامینِ کتاب کی صحت و صداقت کے بارے میں اختر حسین صاحب کہتے ہیں:۔

"مجھے حضرت امیرِ ملت قبلۂ عالمؒ کے آغوشِ عاطفت میں اور زیرِ سایہ پوری عمر گزارنے کی عزت و سعادت حاصل رہی ہے۔ اور تقریباً پچیس[۲۵] سال میں حضور کی حیاتِ مبارک میں مہتمم امور اور نگرانِ کار کی حیثیت سے اور بھی زیادہ قربت کا شرف حاصل کر سکا ہوں۔ نیز آپ کے خلفِ اکبر اور سجادہ نشینِ اول حضرت سراج الملتؒ کے فرزند اکبر کے لحاظ سے مجھے حضور کی شفقتِ بزرگانہ اور محبتِ کریمانہ سے بھی حظِ وافر حاصل ہوتا رہا۔ میں نے اس کتاب میں عام طور پر وہی احوال و کوائف درج کئے ہیں جن کا مجھے ذاتی طور پر علم اور مشاہدہ ہوا، یا پھر کچھ وہ باتیں ہیں جو ثقہ اور معتبر راویوں نے خود مجھ سے بیان کیں۔ اور مجھے انکی تصدیق و توثیق دوسرے ذرائع سے بھی حاصل ہوئی تاکہ سیرت طیبہ اور

حیات مبارک کے تمام پہلو مستند ہوں اور قارئین کے لئے فیض کا سامان بہم پہنچائیں"۔

پروفیسر طاہر فاروقی نے سید جماعت علی شاہ صاحب سے ۱۹۲۴ء میں بیعت کی تھی، جب شاہ صاحب فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں پہلی مرتبہ آگرے تشریف لیگئے تھے۔ اس طرح "سیرتِ امیرِ ملت" ایک مرید کے قلم سے اپنے پیر و مرشد کی سوانح عمری ہے جو بڑی عقیدت و محبت اور توجہ و شوق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ سید جماعت علی شاہ صاحب سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک درویشِ صالح تھے۔ جو مسندِ ارشاد و ہدایت پر تقریباً ایک صدی تک رونق افروز رہے اور اس تمام مدت میں احیائے دین، تبلیغ، ارشاد اور سلسلۂ نقشبندیہ کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ وہ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان کسی سال پیدا ہوئے اور ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔ اُن کے اجداد میں ایک بزرگ سید محمد سعید نور وز شاہ تھے جنہیں اکبر اعظم نے پسرور سے نو میل کے فاصلے پر ایک وسیع قطعہ اراضی عطا کیا تھا۔ انہوں نے اپنے اور اپنے معتقدین کی رہائش کے لئے وہاں ایک مختصر عمارت تعمیر کی اور اس طرح علی پور سیداں کی بنیاد پڑی۔ یہی مقام اب سید جماعت علی شاہ صاحب کی نسبت سے ملک بھر میں مشہور ہے۔ شاہ صاحب موصوف اپنے والد ماجد کے دوسرے بیٹے تھے۔ "سیرتِ امیرِ ملت" کے دوسرے باب میں آپ کے شجرۂ نسب ولادت اور تعلیم و تربیت کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ تیسرے باب میں آپ کے کردار و سیرت اور عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں:۔ حلیہ، لباس، غذا، شفقت و مدارات، جود و سخا، ضبط و تحمل، بے باکی و جرأت، خدمت و ایثار، تقویٰ، مہمان نوازی، فقر و غنا، توکل، فراستِ مومن، معمولاتِ مبارک، روزمرہ اوراد، اتباعِ شریعت و سنت، سادات کا احترام، حج و زیارت، مرتبۂ قطبیت و غوثیت وغیرہ۔ ہر عنوان کے تحت چند واقعات شاہ صاحب کی زندگی سے دیے گئے ہیں۔ مثلاً فراستِ مومن کے عنوان سے ایک واقعہ یہ ہے:۔

"لائل پور میں محمد یعقوب اوورسیر خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں فلاں شخص کا بیٹا ہوں۔ ارشاد فرمایا" اس کے کوئی بیٹا نہ تھا"۔ یعقوب نے کہا" میں اس کے بھائی کا لڑکا ہوں" فرمایا" اس کے تین بھائی تھے" سب

کے نام بتائے، پھر ان کے لڑکوں کے نام گنائے اور دریافت کیا "تمہارا نام کیا ہے"۔ تب اودو سیر نے اپنا نام بتایا۔ محمد یعقوب مجھ سے کہتا تھا "اس کا نام یاد داشت نہیں، یہ تو روحانی کیفیت اور نورانیت ہے، ورنہ کسے ایسی غیر متعلق تفصیلات محفوظ رہ سکتی ہیں"۔

کتاب کا چوتھا باب "تبلیغ وارشاد" کے عنوان سے ہے، اس کے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں: تبلیغی سفروں کا طریق کار، تبلیغی دوروں کے رفقا، ہندوانہ رسموں کا انسداد، مخالفین کے ساتھ ملاطفت، سادہ انداز میں وعظ ونصائح، نوجوانوں کی حوصلہ افزائی، ردِ مرزائیت میں جلسے وغیرہ۔ اس باب میں ان تمام مقامات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جہاں شاہ صاحب تبلیغ وارشاد کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔

پانچویں باب میں شاہ صاحب کے تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کے کرامات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس باب کے چند ذیلی عنوان یہ ہیں:۔ قدیم شرعی تصوف کا احیاء، داخلِ سلسلہ کرنا، یارانِ طریقت کی تعلیم وتلقین، مکاشفات، دل کی بات کا جواب، کرامات، آئسہ کے اولاد ہونا، آگ نے نہیں جلایا، بگڑی کا جسم سے گزر جانا، وغیرہ۔

چھٹا باب شاہ صاحب کی دینی و ملی خدمات کے بارے میں ہے۔ اسکے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں:۔ انجمن خدام الصوفیہ، رسالہ انوار الصوفیہ، مدارس دینیہ، مدینہ فنڈ، تعمیر مساجد سرائیں اور کنویں، ملی اور فلاحی ادارے، تحریک خلافت، ملک بھر کے دورے، تحریک ہجرت، فتنۂ ارتداد، مدارس، شفاخانے، شاردا ایکٹ، مسجد شہید گنج، مجلس اتحاد ملت کا قیام، سنی کانفرنس، تحریک قیام پاکستان، مسلم لیگ کی تائید واعانت، قائداعظم کو کامیابی کا مژدہ وغیرہ۔

ساتویں باب میں شاہ صاحب کے آخری ایام اور انتقال کا تذکرہ ہے۔ اور جو پیغامات تعزیت وصول ہوئے تھے ان میں سے چند کا متن دیا گیا ہے۔

آٹھواں باب "انشاء وخطبات" کے عنوان سے ہے۔ اس کے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں:۔ سادگی و پُرکاری، اسلوب تحریر، ذوقِ سلیم ونقد صحیح، ملفوظاتِ مبارک وغیرہ۔ اسی باب میں شاہ صاحب کے بارہ مکتوبات، تین خطبات صدارت اور چھ وعظوں کا متن بھی دیگیا ہے۔

نویں اور آخری باب میں شاہ صاحب کے اخلاف اور خلفائے عظام کا حال بیان کیا گیا ہے۔

"سیرت امیر ملت" کے اس تجزیے سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب کس قدر جامعیت کی حامل ہے۔ کتاب کی ترتیب میں پروفیسر فاروقی نے جس سلیقے اور حسن کا ثبوت دیا ہے وہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پروفیسر صاحب کے اسلوب کی ادبیت اور دلکشی اس سوانح کو خاصے کی چیز بنا دیتی ہے۔ امیر ملت سید جماعت علی شاہ صاحب کو ہم اس کتاب میں پھرسے جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا دیکھ لیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں دنیا سے پردہ کئے ۳۰ سال گذر چکے ہیں۔

پروفیسر طاہر فاروقی کو بحیثیت اہل قلم سب سے پہلے "سیرت اقبال" کی اشاعت سے شہرت ملی جو جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد یہ علامہ کی زندگی و شخصیت اور شاعری و پیغام کو سمجھانے کی پہلی بھرپور کوشش تھی۔ بقول پروفیسر حمید احمد خان "پروفیسر فاروقی نے "سیرتِ اقبال" میں اقبال کے کلام کی نبض پہچانی ہے۔ اور ٹھیک اس جگہ ہاتھ رکھا ہے جہاں ایک صاحبِ ذوق اور سخن فہم شارح کو رکھنا چاہیئے تھا۔ پروفیسر صاحب نے اقبال بحیثیت انسان اور اقبال بحیثیت شاعر دونوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جو اقبال کے ایک جامع سیرت نگار کے لئے یقیناً ضروری تھا۔" تاہم یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ کتاب کا بیشتر حصہ اقبال کی سیرت و شخصیت سے متعلق نہیں، بلکہ اقبال کی تعلیم کی سلجھی ہوئی اور شستہ تشریحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب نہ صرف علامہ اقبال کے افکار کی ایک اچھی شرح ہے، بلکہ کلام اقبال کا ایک پاکیزہ انتخاب بھی ہے، جس میں اقبال کی زندگی کے کسی دور اور ان کی کسی فارسی یا اردو تصنیف کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

سیرت اقبال کا صرف ایک چوتھائی حصہ سوانحی ہے باقی تین چوتھائی شاعری اور تعلیمات سے متعلق ہے۔ ویسے پروفیسر فاروقی نے اپنی کتاب کے سوانحی حصے میں اقبال کی شخصیت کے متعلق بہت چھان بین کا ثبوت دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی زندگی کے متعلق کوئی مطبوعہ چیز ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہی۔ "سیرت اقبال" کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں پروفیسر فاروقی نے بہت سے اضافے کیے ہیں اور اس طرح اپنی کتاب کی افادیت بڑھاتے چلے گئے ہیں۔ سوانحی حصے کے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں:۔ آباو اجداد، پیدائش، تعلیم، ملازمت، سفر یورپ، واپسی، سیاسی سرگرمیاں، سفر دکن، سفر افغانستان، اعزازات، ریاست بھوپال، بیماری، آخری ارشادات،

رحلت، مشاہیرِ ہند سے مراسم، حلیہ، لباس، ملاقات، حسنِ اخلاق، خوش طبعی، سادگی، انکسار، قناعت، سکونِ قلب، غیرت، قلندری، غذا، علمی صحبتیں، حبِ قرآن، حبِ رسول، بیعت، سحر خیزی، اولیاؤ سے عقیدت، حق گوئی و بیباکی، عملی زندگی، ادارۂ اسلامیات وغیرہ۔

"سیرتِ اقبال" کے سوانحی حصے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے جو "خداشناسی" کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے:۔

"ایک بار ایک درویش علامہ اقبال کے پاس آیا۔ آپ نے اُس سے دعا کی درخواست کی۔ پوچھا "دولت چاہتے ہو؟" جواب دیا "میں درویش ہوں دولت کی ہوس نہیں"۔ پوچھا "عزت وجاہ مانگتے ہو؟" جواب دیا "وہ بھی خدا نے کافی بخش دی ہے"۔ پوچھا "تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟" جواب دیا "سائیں جی، کیا کہہ رہے ہو، میں بندہ، وہ خدا، بندہ خدا سے کیونکر مل سکتا ہے۔ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ میں قطرہ کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں"۔ یہ سن کر اُس درویش پر خاص کیفیت طاری ہوئی اور کہا "بابا جیسا سنا تھا، ویسا پایا، تو تو خود آگاہِ راز ہے۔ تجھے کسی کی دُعا کی کیا ضرورت ہے"۔

اس اقتباس سے پروفیسر فاروقی کے طرزِ ادا کی خوبی واضح ہے یہی دلکشی و دلنشینی اور محاکاتی اور ڈرامائی انداز "سیرتِ اقبال" کے سوانحی حصے میں ہر جگہ نظر آتا ہے جس سے ہم علامہ اقبال کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ لیتے ہیں۔

مجموعی طور پر پروفیسر فاروقی کی سوانح نگاری کو ہم قدیم کلاسیکی نظریۂ سوانح نگاری کے مطابق پاتے ہیں۔ قدما کے نزدیک اخلاق کو فن پر فوقیت حاصل تھی اور وہ مرحومین کی صرف نیکیاں اور خوبیاں یاد کیا کرتے تھے۔ کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ پروفیسر صاحب کا بھی یہی رویہ ہے۔ یوں بھی انہوں نے جن شخصیات کو اپنی سوانح عمریوں کا موضوع بنایا ہے اُن کی روحانی و مذہبی حیثیت اور اُن کا احسان مسلمانوں پر اس قدر واضح ہے کہ کسی بھی سچے مسلمان کے دل میں سوائے عقیدت و احترام اور محبت کے اُن کے بارے میں دوسرا رویّہ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح حالی، شبلی اور سید سلیمان ندوی نے اپنے موضوعاتِ سوانح کے ساتھ عقیدت و محبت

کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے بھی قدرتاً اپنے موضوعات کے ساتھ یہی رویّہ ظاہر کیا ہے، اس پر مستزاد انہوں نے اپنے طرزِ ادا، اسلوب اظہار زبان و بیان اور حسنِ ترتیب کے ذریعے اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کو تخلیقی ادب کی دلکشی بخش دی ہے، اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری
شعبہ اُردو ۔ پشاور یونیورسٹی

طاہر فاروقی کی شاعری

اُردو شاعری کی تاریخ بہت قدیم اور طویل ہے ، جو کئی صدیوں پر محیط ہے ۔ اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے زمانے کو آج کئی صدیاں گذر چکی ہیں اور اُس وقت سے ابتک اُردو شاعری کی تمام اصناف ترقی کی راہ پر گامزن رہی ہیں ۔ کچھ قدیم اصناف سخن جو جدید دور کا ساتھ نہ دے سکیں خود بخود مر گئیں ۔ اور کچھ نئی نئی اصناف دوسری زبانوں سے اُردو میں وارد ہوئیں ۔ اس پورے دور میں ہماری شاعری اضطراب و کرب کی نئی فضاؤں سے آشنا ہوتی رہی ۔ قومی ضروریات اور بین الاقوامی مسائل اس کا موضوع بنتے رہے ۔ فکر و فن میں غیر معمولی تبدیلیاں نمایاں ہوتی رہیں ۔ کچھ قدیم انجمنیں برہم ہوئیں ۔ کچھ نئی محفلیں سجیں ۔ کچھ پرانے الفاظ متروک ہو گئے کچھ نئے لفظ زبان کا حصہ بنے ۔ کچھ پرانی چنگاریاں بجھ کر راکھ ہو گئیں اور کچھ نئے شعلے بھڑکے ۔ زندگی کی رنگا رنگی نے سوز و ساز اور رنگ روپ کے جو سامان فراہم کئے وہ سب اس کا موضوع بنے ۔

اگر شمار کیا جائے تو کم و بیش لاکھوں چھوٹے بڑے شعراء اس پورے دور میں پیدا ہوئے ۔ جنھوں نے اس چمن کی آبیاری کی اور اس جد و جہد میں حصہ لیکر اپنا فرض ادا کیا ۔ حسنِ انسانی اور حسنِ تخیل کے راگ چھیڑے ۔ سیاسی جد و جہد کو زبان دی ۔ اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا ۔ فرد اور جماعت کے منصب سے بحث کی عروض کی پابندیوں کے اندر رہ کر ہیئت کے تجربے کئے ۔ غزل ، قصیدہ ، مرثیہ ، مثنوی ، قطعہ رباعی ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، سانٹ ، گیت ، مختصر اور طویل نظموں کا انبار لگایا ۔ اور اُردو شاعری کو اس مدت میں اس قابل بنا دیا کہ وہ دوسری زبانوں کے ادب کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی ہو سکے ۔

شعراء کے اس جمِ غفیر میں کچھ ایسے شاعر بھی تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں بہت کم لکھا۔ لیکن شعراء کی صف میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی بھی انہی شعرا میں سے تھے جنہوں نے اپنی تدریسی مصروفیات کے باوجود شاعری کو وقت دیا۔ اور ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دلوں میں اپنا ایک مقام بنا گئے۔

طاہر فاروقی ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ جو بیک وقت شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی' ناقد بھی تھے اور اقبال شناس بھی۔ سیرت نگار بھی تھے اور مقالہ نگار بھی۔ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ اور ایک منجھے ہوئے اُستاد بھی۔ وہ ادب کے تمام گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ سیرت نگاری میں سیرت اقبال، سرکار دوعالم اور سیرت امیر ملّت ان کے انمٹ نقوش ہیں۔ سرکار دوعالم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ فاروقی صاحب کو حضور اقدس صلّی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر محبت تھی بلکہ اس کتاب سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ رسول ان کے ایمان کا سب سے بڑا جزو تھا۔ حضور اکرم صلعم کی ذات سے جو محبت اور عقیدت ان کو تھی اس کتاب کا لفظ لفظ اسکی گواہی دیتا ہے۔

سیرتِ اقبال اور سیرتِ امیر ملّت، اقبال اور امیر ملّت سید پیر جماعت علیشاہ صاحب سے ان کی عقیدت و محبت اور تعلقِ خاطر کا ثبوت ہیں۔ اقبال کے انتقال کے بعد انکی سیرت پر سب سے پہلی کتاب سیرتِ اقبال تھی۔ اس اعتبار سے اقبال شناسوں کی صف میں فاروقی صاحب کا ایک منفرد مقام ہے۔ سیرتِ اقبال کے علاوہ حضرت علامہ اقبال کی زندگی اور فن کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں مقالات تحریر کرکے اقبال شناسی کا حق ادا کردیا۔ اقبال صدی کے سلسلے میں جو کتابیں چھاپی گئیں تھیں اس سلسلے میں طاہر فاروقی سے "اقبال اور محبت رسول" پر کتاب لکھوائی گئی جو اس موقع پر لکھائی گئی کتابوں میں اہمیّت کی حامل ہے۔

اب فاروقی صاحب کی شاعری پر کچھ لکھنے کی جسارت کرتا ہوں۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے۔ اور کئی مشاعروں اور محفلوں میں ان کا کلام سننے کی سعادت ملی۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان کا تمام کلام پیشِ نظر نہیں۔ اِسوقت جو کلام مجھے دستیاب

ہوا اس میں دو نعتیں، تین منقبتیں، ایک نظم (خوشحال خان خٹک کے بارے میں) چند رباعیات اور کچھ غزلیں شامل ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے اپنی اس قدر طویل زندگی میں بس اتنا ہی لکھا ہو۔ خدا کرے ان کا سارا کلام دستیاب ہو اور ان کا دیوان مرتب ہو کر سامنے آئے تو اُس وقت ان کی شاعری کا پورے طور پر احاطہ کیا جا سکے گا۔

جہاں تک ان کی نعتوں کا تعلق ہے ان دونوں نعتوں کی ردیف "یا مصطفیٰ" ہے۔ اور دونوں کے قافیے بھی گذر، در، سحر، وغیرہ ہیں۔ یہ دونوں نعتیں دو فروری ۱۹۷۹ء کو النقرہ میں لکھی گئی ہیں۔ جو وہاں سے اپنے دوست میاں سعید الرحمٰن کو بطور تحفہ بھیجی گئیں۔ سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے انکو جو محبّت و عقیدت تھی اس کا اظہار ان نظموں کے ایک ایک لفظ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک نعت کے مطلع ہی میں حضورؐ کے روضۂ پرنور کی زیارت کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آپ کے کوچے میں ہو میرا گذر یا مصطفیٰ!
میری پیشانی ہو اور وہ سنگ در یا مصطفیٰ!

اسی نعت کے ایک شعر میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حضور التماس کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آپ کے جُود و کرم سے ہیں دو عالم فیضیاب
اس طرف بھی ایک رحمت کی نظر یا مصطفیٰ!

اسی نعت کے مقطع میں ایک بڑی پیاری التجا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

از رہِ لطف و کرم آپ اپنا دیوانہ کہیں
بس یہ ہو طاہر کی نیت کا ثمر یا مصطفیٰ!

جہاں تک ان کی منقبتوں کا تعلق ہے۔ پہلی منقبت سیدنا فاروق اعظمؓ کی شان میں ہے۔ جو فاروقی صاحب نے ۱۹۴۳ء میں قیام آگرہ کے زمانے میں لکھی تھی۔ دوسری منقبت حضرت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں ہے جو ۱۳ رجب ۱۳۷۶ھ بمطابق ۱۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو لکھی گئی اور یوم علیؓ کے

جلسے میں حسینیہ ہال پشاور صدر میں پڑھی گئی۔ تیسری منقبت سیدنا غوث الاعظمؒ کی شان میں ہے۔ اور یہ منقبت ۱۹ر رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ بمطابق ۹ر نومبر ۱۹۷۱ء میں لکھی گئی۔

ان نظموں میں مدح سرائی اور عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ فاروقی صاحب نے اچھی شاعری کا معیار بھی برقرار رکھا ہے۔ ان اشعار میں فاروقی صاحب کی شعر گوئی کا سلیقہ اور نظم کو بڑی خوبصورتی اور حسن کے ساتھ شروع سے آخر تک ایک خاص آہنگ کے ساتھ برقرار رکھنے کا انداز نمایاں ہے۔ اساتذہ فن نے مدح وستائش کے لئے جس زبان اور جس فصاحت و بلاغت اور جزالت کو ضروری سمجھا ان نظموں میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں فنی طور پر قصیدہ نہیں ہیں لیکن قصیدہ گوئی کی پوری شان ان میں موجود ہے۔

حضرت سیدنا فاروق اعظمؓ کی شان میں جو منقبت ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن سے اسلام کی اس عظیم ہستی سے طاہر فاروقی صاحب کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

پرچم اسلام کو تو نے کیا ہے سربلند　　تو نے بدلی آکے فرسودہ بساطِ کائنات
ترے پاؤں چومتے تھے قیصر و کسریٰ کے تاج　　تیری ہیبت سے نگوں تھے کفر کے لات و منات

فاروقی صاحب کو اس طاغوتی دور میں اسلام کی بقا کے لئے حضرت فاروق اعظمؓ کی ضرورت کا شدت سے احساس ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دستگیری کا تری محتاج ہے اسلام پھر
پھر خدا والے ہوئے جاتے ہیں رہن سومنات

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں جو منقبت لکھی ہے وہ ترکیب بند میں ہے۔ اس نظم میں مولائے کائنات کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وہ نورِ خدا ہے وہ شیرِ خدا ہے　　وہ مولائے کل حیدر بت شکن ہے
وہی بابِ علمِ خفی و جلی ہے　　وہی واقفِ رمزِ سر و علن ہے
نمونہ ہے وہ سر سے پا تک نبیؐ کا　　بلاشبہ ذات اُسکی فخرِ زمن ہے

دو عالم کا مشکل کشا اس کو کہیئے! غلاموں کا اس پر فدا جان و تن ہے
وہ آباد رکھے کہ ویران کر دے اسی کا یہ گلشن اسی کا یہ بن ہے

حضرت سیدنا غوث الاعظمؒ سے فاروقی صاحب کو بے پناہ محبت اور عقیدت تھی، اور اُس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ وہ امیرِ ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب قبلہ کے توسط سے قادری سلسلے میں بیعت تھے۔ اور حضرت پیرِ طریقت کے طفیل حضرت غوث الاعظمؒ کی توجہات اور تجلیات اکثر ان کے قلب پر طاری رہتیں، جس کا ثبوت اس شعر سے ملتا ہے۔

جو بھی دربار میں آیا نہ گیا خالی ہاتھ ؛ آپ کے در کا یہ دستور ہے شیئاً للّٰہ

فاروقی صاحب محبتِ غوث الاعظمؒ میں اسقدر سرمست و بیخود تھے کہ اپنی دین و دُنیا کا سب اختیار انہی کے ہاتھ سونپ رکھا تھا۔ اور ان کی مرضی کو مرضیٔ حق سمجھتے ہوئے اپنا سب کچھ لٹا دینے کو سعادت سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

بسر و چشم بصد شوق ہمیں ہے منظور ؛ جو بھی کچھ آپ کو منظور ہے شیئاً للّٰہ

اس نظم کے ہر ہر لفظ سے ایک خاص عقیدت، احترام اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ظاہر فاروقی صاحب کو حضرت میراں سرکار کی ذات والاصفات سے تھا۔

خوشحال خان خٹک پشتونوں کے جدِ امجد اور پشتو شاعری کے ایک روشن مینار ہیں۔ ان کی بحیثیت ایک عظیم شاعر کے سب پختون قدر کرتے ہیں۔ اور ان کے دیوان کو پشتو ادب کا شاہکار سمجھتے ہیں۔ اِس مردِ آہن سے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر ہر سال ان کا یوم منایا جاتا ہے۔ اور مختلف انجمنیں "یوم خوشحال" کی محفلیں برپا کرتی ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی کی بھی یہ ایک قدیم روایت ہے کہ یہاں ہر سال یوم خوشحال منایا جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں اسلامیہ کالج کے یوم خوشحال کے موقع پر فاروقی صاحب نے ایک نظم لکھی جس میں اس صاحبِ سیف و قلم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اور اس نظم میں اس خطے کے تمام فضلاء و شعراء کو ان کا خوشہ چین بتاتے ہوئے ایک شعر میں اس طرح لکھا ہے۔

کاملے نیست کہ اندر سرِ او شوقِ تو نیست
فاضلے نیست کہ مے نوشِ خم و شانِ تو نیست

اُردو میں اگرچہ دوسرے اصنافِ شعر نے بہت ترقی کی۔ لیکن رباعی کو وہ مرتبہ

نصیب نہ ہوا جو اسے فارسی میں حاصل ہوا۔ فارسی میں کئی شاعر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے رباعی گوئی کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی۔ حضرت عبداللہ انصاری، حکیم ابوسعید ابوالخیر، حکیم عمر خیام، سحابی اور سرمد کی عالمگیر شہرت صرف رباعی کی بنا پر ہے۔ لیکن اردو میں کسی ایسے شاعر کا نام نہیں لیا جا سکتا جو اس صنف نظم کی بدولت زندگی جاوید سے ہمکنار ہوا ہو۔ اگرچہ ہمارے تمام شعراء نے رباعی کہی ہے لیکن اس صنف کو فنی طور پہ برتنے والے صرف چند ہی شاعر نظر آتے ہیں۔

طاہر فاروقی صاحب نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ اور اس صنف میں وہ ہمارے ان شعراء سے زیادہ متأثر نظر آتے ہیں جنہوں نے اس صنف کو اخلاقیات اور پندونصائح کے لئے استعمال کیا۔ زندگی کی بے ثباتی اور اس کی ظاہری خوبصورتی کو ایک فانی اور ناپائیدار چیز سمجھتے ہیں۔ ایک رباعی میں اسکی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دھوکا ہے یہ سب ناز و نیاز ہستی ہے دُور حقیقت سے مجاز ہستی
کھل جائیگا ایک دن یہ عقدہ طاہر ہو جائے گا بے صدا یہ ساز ہستی

اور ان کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ستمبر کی ایک منحوس شام کو ان کا ساز ہستی بھی بے صدا ہو گیا۔

اسی مضمون کو ایک اور رباعی میں ذرا اور وضاحت کے ساتھ نظم کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نیرنگ جہاں کو اک تماشا دیکھا نقش ہستی حباب آسا دیکھا
میں کیا کہوں تجھ سے مرتے مرتے طاہر دُنیا سے دنی میں میں نے کیا کیا دیکھا

اصل میں رباعی کی جان اسکا چوتھا مصرعہ ہوتا ہے۔ جس میں شاعر اپنے مضمون کو انتہا کی بلندی تک لیجا کر اس کو بڑی خوبصورتی سے سمیٹتا ہے۔ فاروقی صاحب کی مندرجہ بالا دونوں رباعیوں کے چوتھے مصرعے کسی عظیم سے عظیم رباعی گوئے چوتھے مصرعوں سے کم نہیں۔

اب فاروقی صاحب کی غزلوں کی بابت کچھ عرض کرونگا۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے ان کی غزلوں میں دو الگ الگ رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ بعض غزلوں میں تو بالکل قدیم اساتذہ کا پرانا انداز ہے۔ جس میں مشکل پسندی ہے۔ ایسی مشکل پسندی کہ شعر کا مطلب دریافت

کرنے کیلئے قاری کو اچھی خاصی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ان کا یہ انداز پاکستان آنے سے پہلے کا ہے۔ ان کی یہ غزلیں بھی لطف سے خالی نہیں۔ فاروقی صاحب کی مشکل پسندی کے زمانے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

صدق و یقین سے ہوتی ہے طے منزلِ حیات ؛ کارِ جہاں نہ خطرۂ سود و زیاں پہ ہے

کوئی کیا جانے نیاز و ناز کی سرگوشیاں ؛ شمع روتی ہی رہی ہے سُن کے پروانے کی بات

گرمئ محفل سے تازہ ولولے بیدار ہوں ؛ اپنے رندوں کو سناؤ پھر سے میخانے کی بات

سنو زمانہ برابر جگا رہا ہے تمہیں ؛ اٹھو کہ اب تو فقط نفخ صور باقی ہے

بہار ہے نہ خزاں کچھ عجیب عالم ہے ؛ خوشی کی یاد بھی بین السطور باقی ہے

جہاں تک ان کی آسان غزلوں کا تعلق ہے ان کے بعض شعر بالکل سہل ممتنع کی مثال ہیں۔ آسان خوبصورت اور رواں دواں بحریں۔ میٹھی اور پیاری زبان۔ نادر تشبیہات حسین استعارات۔ جلد ہی سمجھ میں آنے والے مضامین۔ پیاری پیاری ردیفیں خوبصورت خوبصورت قافیئے۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آئے گا کیا جواب کیا جانیں ؛ وہ یہ دیر و شتاب کیا جانیں

کسی بیکس پہ کیا گذرتی ہے ؛ آپ عالی جناب کیا جانیں

دل کا رکھنا بھی اِک عبادت ہے ؛ وہ یہ کارِ ثواب کیا جانیں

سب گرفتارِ خوف و یاس ہیں آج ؛ کیوں ہے یہ اضطراب کیا جانیں

منہ لگی کیسے چھوڑ دیں طاہر

ہم خطا و صواب کیا جانیں

اس غزل کی ردیف "کیا جانیں" ایک مشکل ردیف ہے۔ لیکن ہر شعر میں ردیف اس قدر چسپت ہے کہ ہر شعر کا لطف دو بالا ہوگیا ہے۔ یہ غزل ۱۹۶۹ میں الفقرہ میں لکھی گئی۔

غرض فاروقی صاحب نے اُردو شاعری کی جن اصناف میں شعر کہے ہیں، خوب کہے ہیں۔ نعت، منقبت، مدح، رباعی اور غزل ان کی پسندیدہ اصناف ہیں۔ اور بہت کم شعر کہکر بھی انہوں نے ان اصناف میں شاعری کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

پروفیسر خاطر غزنوی
شعبہ اُردو۔ پشاور یونیورسٹی

محمد طاہر فاروقی اور مکتوب نگاری

کسی کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کیلئے اُس کی زندگی اور کارنامے تو بنیاد بنتے ہی ہیں کہ شخصیت کی پہچان کا پہلا زینہ اُس شخص کا وہ فعل ہے جو معاشرے میں اسے متعارف کرانے کا باعث ہوا۔ لیکن پھر شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں جاننے کی لگن لوگوں میں بڑھ جاتی ہے۔ یعنی وہ شخص جو ایسا کارنامہ کرچکا ہے، شکل و صورت قد و قامت، لین دین، بول چال اور گفتار و کردار میں کیا چیز ہے۔ شخصیت کے ان پہلوؤں کو پرکھنے کے لئے شخصیت نگار اپنے ممدوح کے قد کو نکھارنے کیلئے تلاش و جستجو کے نئے نئے اور عجیب عجیب راستے تلاش کرتے ہیں۔ نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ عزیزوں، رشتہ داروں، بیوی بچوں، بھائیوں دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے اس شخصیت کے رویوں، اس کی خوبیوں، خامیوں، اچھے اور کمزور پہلوؤں، گفتگو، نشست و برخاست، کھانے پینے کے طور طریقوں، لکھنے پڑھنے کی عادتوں، خوشی اور غمی کے موقع پر اس کے ردِعمل سے اسکی شخصیت کے خد و خال مرتب کرتے ہیں۔

جدید دور میں جہاں تحقیق کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے ہیں اور شخصیت کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے لیبارٹریوں کا سہارا بھی لیا جانے لگا ہے۔ وہاں اُس شخصیت کی مکتوب نگاری بھی درخورِ اعتنا سمجھی گئی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:۔

"عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی انسان کی گفتگو اس کی شائستگی کی علامت ہوتی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ مگر اس سے بھی بڑی علامت کسی کی شائستگی اور تہذیب کی یہ ہے کہ اس کو خط نگاری کا سلیقہ کہاں تک ہے۔"

مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں :۔

"خطوط و مکاتیب ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کیلئے نہایت عمدہ اور بڑی حد تک قابل اعتماد سرمایہ ہیں "

وہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

" ایک پہلو اور بھی ہے بعض اکابر کی گراں قدر تصانیف کے مطالعہ سے کم تر اصحاب مستفید ہوتے ہیں لیکن مکاتیب کو اس لئے زیادہ شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ کہ ان کے مطالب میں تصانیف کی متانت و یکرنگی کے بجائے تنوع اور بوقلمونی کی گل افشانیاں ہوتی ہیں، نیز مکاتیب علم و ادب کے چھوٹے چھوٹے جواہر پارے ہوتے ہیں جنہیں پڑھتے وقت دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا، استفادہ بیشتر ہوتا ہے اور زحمت کمتر"

اُردو ادب کی تاریخ میں خطوط نویسی نے بعض شخصیتوں کا مرتبہ مزید بڑھا دیا۔ اور ان کو عزیز تر بنا دیا، رجب علی بیگ سرور کی داستان فسانہ عجائب تو دلی اور لکھنؤ کی تہذیبوں کے نزاع کی ایک کڑی بن سکتی ہے، لیکن اُن کے مکتوبات ان کی شخصیت کے حسن کو ملکوتی بنا دیتے ہیں۔ غالب کے مکتوبات انہیں عظیم شاعر کے ساتھ ہی ایک عظیم نثر نگار اور ایک سچے انسان کا درجہ دے دیتے ہیں۔

شبلی کی مکتوب نگاری انہیں داغدار نہیں بناتی بلکہ ایک گوشت پوست کا انسان ثابت کرتی ہے جس کے سینے میں محبت کرنے والا دل ہے۔ جس کے جذبات میں عشق کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ ایسی آنچ جو شعلہ بنکر کسی کو بدنام نہیں کرنا چاہتی بلکہ اس آنچ میں خود جل جل کر مرجانے کو ترجیح دیتی ہے۔

مہدی افادی کی مکتوب نگاری بھی ان کے ایسے حقیقی دلی جذبات کا عکس ہے جس سے ان کی نجی زندگی، ان کا آئیڈیل اور حسن پرستی کی حسِ لطیف سامنے آتی ہے۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایک استاد، طلبا کے ایک مزاجدان اور ایک نصاب نگار ایک نقاد، ایک ادیب، ایک سیرت نگار، ایک اقبال شناس، ایک عاشقِ رسولؐ

ایک مسلمان، ایک اُردو، فارسی اور عربی کے فاضل کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔
لیکن اُن کی مکتوب نگاری مندرجہ بالا شخصیتوں کی طرح ان کی زندگی، زندگی کے معمولات، ان کی شائستگی، ان کی اصول پرستی، ان کی محبت اور نفرت، ان کی شفقت و بزرگی ان کی راہنمائی، ان کی تفریح، ان کی سیاحت، ان کی حیرت اور ان کی رفعت، ان کے مسائل اور ان کی بیماری کا احاطہ کرتی ہے۔ گویا بقولِ مولانا مہر پروفیسر فاروقی کے خطوط میں تنوع اور بوقلمونی بدرجہ اتم موجود ہے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے پروفیسر طاہر فاروقی کا بہت زیادہ قرب حاصل رہا۔ اور میں ان کی دلپذیر اُردو سے اُردوئے معلیٰ تک کا محرم رہا۔ ان کی عادات اور مجھے ان کی شخصیت کے ہر رنگ سے پوری طرح آشنا ہونے کا موقع ملا، فاروقی صاحب ایک سچے آدمی تھے۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا، وہ بغیر کسی خوف و خطر یا مصلحت بینی کے منہ پر لے آتے۔ دوست ہوتے تو بہترین دوست رہتے۔ بلکہ دوستی میں تو وہ پشتونوں کے بیرہ جذبہ کی زندہ مثال تھے۔ اور اگر دشمن بن جاتے تو کھلم کھلا دشمن ہوتے۔ وہ دشمنی پردوں میں چھپ کر نہ کرتے کہ اس میں منافقت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ دشمنی کرتے اور ڈنکے کی چوٹ کرتے۔

ان کی یہ عادت ان کے خطوط میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں، ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ برصغیر کے گوشے گوشے میں ان کے دوست، مداح، شاگرد، عزیز و اقارب، ہم مشرب و ہم پیشہ پھیلے ہوئے تھے۔ اور سب سے ان کی خط و کتابت رہی۔ یوں تو ۱۹۵۷ کی بیماری کے بعد وہ ادبی تحریروں کے معاملے میں سست پڑ گئے تھے۔ لیکن ایک مکتوب نگاری کا شعبہ ایسا تھا جس میں وہ آخری سانسوں کی بے ترتیبی تک بھی مرتب و متحرک و محرر رہے۔

جیسا کہ اس سے پیشتر ذکر ہو چکا ہے وہ ایک عالم و فاضل شخص تھے۔ اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی انہیں پوری دسترس تھی۔ ان کا تینوں زبانوں کا خط بہت عمدہ اور پختہ تھا۔ انگریزی زبان کی دفتری خط و کتابت تو ان کے لئے ایک معمولی بات تھی۔ اکثر اوقات انہوں نے بعض بہت اہم مضامین

کا انگریزی میں اور انگریزی سے اُردو میں بہت ہی عمدہ ترجمہ کیا۔ اِس سلسلے میں دوسروں کی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا ۔ مجھے یاد ہے کہ جب جمرود کے مقام پر باب خیبر کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو حکومت صوبہ سرحد نے باب خیبر کے پہلو میں دیواروں پر انگریزی اور اُردو زبان میں خیبر کی تاریخ کندہ کرانے کا فیصلہ بھی کیا۔ یہ کام شعبہ اُردو کے حوالے ہوا۔ اور فاروقی صاحب نے یہ کام میرے حوالے کردیا۔ جب میں ترجمہ کرچکا تو انہوں نے ترجمے میں بعض ایسی نکتے کی باتیں بتائیں جو سوائے ایک عمدہ انگریزی دان کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ انہوں نے طنزاً مجھ سے کہا کہ بڑے شاعر بنتے پھرتے ہو۔ ان عبارتوں میں رڈیارڈ کپلنگ وغیرہ کے جو انگریزی اشعار آئے ہیں انہیں شعر ہی کی صورت میں ترجمہ کردو تو ترجمے میں نثر و نظم کا امتیاز پیدا ہو اور لطف بڑھے"۔ یہ کام ان کے منشا کے مطابق ہوا۔ اور اسکی داد انہوں نے اس وقت پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر چودھری محمد علی مرحوم سے راقم الحروف کی تعریف کرکے دی۔ نیز ترجمے کا کریڈٹ خود نہ لیا بلکہ گن گن کر خوبیوں کا تذکرہ میرے حوالے سے کیا۔ یہ ان کی شخصیت کی سچائی کا ایک پہلو تھا۔ اور یہی سچائی اور صاف گوئی ان کے خطوط کا خاصہ بھی ہے۔ پشاور میں میاں سعیدالرحمن ایک ایسی شخصیت ہیں۔ جو شرافت نجابت، محنت، شفقت، ہمدردی کے لحاظ سے یکتا ہیں۔ قصہ خوانی بازار میں میاں شریف حسین اینڈ سنز والی عمومی اشیا کی دکان کرتے تھے۔ قصہ خوانی بازار میں آگ لگی تو یہ دکان بھی جل گئی۔ یہی دکان پشاور کے ادبا، شعرا، ناشروں پروفیسروں، ڈاکٹروں، صحافیوں، ریڈیو والوں، تاجروں، اہل دل اور اہل اللہ سب کا مرکز تھی۔ یہاں پروفیسر محمد طاہر فاروقی، ڈاکٹر بشیر، شمیم بھیروی، محسن احسان ڈاکٹر برلاس، سید ضیا جعفری، ڈاکٹر اختر جعفری عبدالودود قمر۔ فارغ بخاری رضا ہمدانی، باقی صدیقی۔ صادق نسیم۔ باسط سلیم۔ مرزا عزیزالرحمن۔ ملک راحت۔ محترمہ سردار حیدر صاحبہ۔ محمود الحسن کوکب مرحوم۔ مولانا تاج محمد۔ محمد حسین راز۔ سرگم عزیز۔ غالب مصطفیٰ الطاف حسین۔ تاج سعید۔ آفتاب احمد۔ بخاری صاحب۔ جگر کاظمی مرحوم۔ ایم ایم شریف آرٹسٹ۔ مشہور مصور زین العابدین وغیرہ آیا کرتے۔ شام کو جب کاروبار کا وقت ختم ہوجاتا تو احباب کی مجلس گرم ہوتی۔ اسس مجلس

کو "یارانِ ہر شب" کہتے ۔ یہ محفل ہر شب گرم ہوتی ۔ اِن میں سے تقریباً ہر ایک پر جرمانے عائد ہوتے ۔ گاجر کا حلوہ ، گلاب جامن ۔ رس گلے ، چائے اور قہوہ جرمانے سے چلتا ۔ جرمانہ پرچی کی صورت میں نکلتا ۔ جرمانے کی زد میں پروفیسر فاروقی سے خاطر غزنوی تک سبھی آتے ۔ ادبی بحثیں ہوتیں ۔ تازہ کلام سنا جاتا ۔ نئی نئی چیزیں سنی جاتیں ۔ میاں سعید الرحمٰن جو مختلف چیزوں کے ریکارڈ محفوظ کرنے میں ثانی نہیں رکھتے زیرِ تبصرہ خطوط میں نے اِن ہی کے ریکارڈ سے حاصل کئے ہیں ۔ ان کے رکھ رکھاؤ اور ترتیب و تنظیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ راقم الحروف کے چین سے لکھے ہوئے دونوں کے نام تقریباً سبھی خطوط اُنہوں نے یکجا کرکے ایک فائل میں محفوظ کر دئے ۔ فاروقی صاحب کے خطوط بھی انہوں نے اسی طرح جمع کئے اور ان خطوط کی فائل کے شروع میں درج ذیل تفصیل ٹائپ کرکے لگا دی جو ان کی شائستگی اور حسنِ ذوق کی دلیل ہے ۔

خطوط جو پاکستان میں لکھے گئے

۱۹۶۴	ایک	۱۹۶۸	دو	۱۹۷۴	[illegible]
۱۹۶۵	پانچ	۱۹۷۱	چار	۱۹۷۷	تین
۱۹۶۶	نو	۱۹۷۲	چار		
۱۹۶۷	پانچ	۱۹۷۳	سات	کل	۴۶

ترکی کے خطوط

۱۹۶۸ ——— پندرہ ۔ ۱۹۶۹ ——— اکیس ۔ ۱۹۷۰ ——— گیارہ

کل = ۴۷ ۔ جملہ خطوط = ۹۳

میاں سعید الرحمٰن نے یارانِ ہر شب کے ان احبابؑ کے لئے جو ملک سے باہر گئے ایک عجیب اور دلچسپ ترکیب نکالی ۔ اس ترکیب کو قبلہ فاروقی صاحب نے "پنچایتی خطوط" کا نام دیا ۔ دراصل میاں صاحب ایک چھوٹے سائز کی نوٹ بک لے کر مسافر کے ہر دوست اور جاننے والے سے مسافر کے نام چند اکھر لکھوا لیتے اور پھر یہ بیشمار خطوط کا مجموعہ باہر بھجوا دیتے ۔ باہر سے بھی مسافر اسی طرح ہر خط کے جواب میں کچھ نہ کچھ لکھ کر بھجواتے ۔

؎ یارانِ ہر شب کے جو اراکین باہر گئے ان میں محمد طاہر فاروقی ترکی ۔ ڈاکٹر اختر جعفری ایران اور راقم الحروف چین گئے ۔

فاروقی صاحب نے اپنی صاف گوئی کا اظہار اسی پنجابیتی خط کے سلسلے میں کیا ہے۔ یہ خط میاں سعید الرحمٰن کے نام ہے۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"آپ نے حسب عادت کتابچہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ شکرگذار ہوں۔ یہ وعدہ پہلے ہی ہو چکا ہے کہ میں انفرادی جواب نہیں دونگا۔ مگر گیارہ کی تعداد تو بہت ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ پشاور میں اس تعداد سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو مجھے کچھ لکھنا پسند کریں گے ۔۔۔ ۳ر مارچ"

"فہرست سے پتہ چلا کہ ۳۵ انفرادی پیامات اور خطوط ہیں۔ اور وہ اجتماعی جنرل سکرٹری کی نگرانی میں۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان میں کم از کم دس تحریریں ان اصحاب کی ہیں جو اپنے بس میں ہوتے تو ایک لفظ بھی نہ لکھتے، نہ انہیں مجھ سے خصوصیت ہے۔ بس میاں سعید کے نرغے میں آکر لکھنے پر مجبور ہوئے ۔۔۔ ۱۰ر اپریل"

فاروقی مرحوم ایک راسخ العقیدہ مسلمان، ایک با اصول انسان، صرف ایک بات کہنے والے لیکن تفصیل و جزئیات کے ساتھ، اور اپنے پیشے سے محبت کرنے والے شخص تھے۔ پیشے کا ذکر چھڑا تو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ وہ پیشے کے لحاظ سے خاندانی طور پر اُستاد تھے۔ ان کے والد اسلامیہ کالج پشاور کے ابتدائی اساتذہ میں سے تھے۔ اور محمد طاہر فاروقی کی طرح انہوں نے بھی پشاور کی ادبی اور شعری محفلوں میں اپنے شرکت کی یادیں تاریخ کے صفحات پر زینت بنا دیں۔

ان کی اسلام پسندی کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے سیرتِ رسولؐ پُر سرکارِ دو عالمؐ کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ اور اپنی زندگی میں لوگوں کو اسلامی شعائر کو اپنانے کی ہمیشہ تلقین کی۔ جب ترکی میں تھے تو حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ حج کے بارے میں اطلاعات دیتے ہوئے ان کا ذوق اور شوق اور رسم و حکم کی پابندی قابل دید ہے۔ میاں سعید کو لکھتے ہیں:-

"میں نے حج کا ارادہ کرلیا ہے۔ بارہ پاکستانی حضرات کی رفاقت میں ۱۴ر فروری کو روانگی ہے۔ اور انشاء اللہ ۱۴ مارچ کو واپسی۔ یہاں سے جدّہ تک ہوائی جہاز سے آنا جانا۔ وہاں کا سفر موٹروں میں۔ جملہ احباب سے درخواست

ہے کہ دُعا فرمائیں۔ کہ خدا مجھے اس سعادت و شرف کا امتیاز بخشے۔ رسم و حکم کے مطابق یہ التماس بھی ہے۔ (انفرادی و اجتماعی) کہ آپ حضرات میرا کہا سُنا معاف کریں۔ اور دُعا میں یاد رکھیں۔ انشاء اللہ میں بھی وہاں دُعا میں کسی کو نہیں بھولوں گا — ۱۸ جنوری"

چنانچہ حب رسولؐ کا ثبوت انہوں نے حج کے ساتھ نعت گوئی کی صورت میں بھی دیا۔ النقرہ میں جو نعتیں لکھیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ملاحظہ کیلئے بھیجیں۔ دو نعتوں کے چند اشعار سنئے ۔

آپ کے کوچے میں ہو میرا گذر یا مصطفیٰؐ — میری پیشانی ہو اور وہ سنگ در یا مصطفیٰؐ
ارمغاں شایانِ دربارِ رسالت کچھ نہیں — ہاں بس اِک شرم گنہ اِک چشم تر یا مصطفیٰؐ

آپ سے عالم منور سر بسر یا مصطفیٰؐ — دشت و در کوہ و کمر جن و بشر یا مصطفیٰؐ
سارے عالم کی عناں طاغوتیوں کے ہاتھ ہے — عظمت انسان ہے پامال بشر یا مصطفیٰؐ
ہر طرف سے کفر کی یلغار ہے اسلام پر — ظلمتِ شب میں نمایاں ہو سحر یا مصطفیٰؐ

یہ نعتیں بھیجتے ہوئے تفصیل لکھتے ہیں۔

" آگرہ میں ہماری جو خصوصی محفلیں سماع کی ہوتی تھیں، ان کے لئے میں نے منتخب غزلوں کی تین بیاضیں تیار کر کے اپنے اِس دوست قسم کے قوال کو دے دی تھیں۔ ان میں جلیل مانکپوری مرحوم کی دو نعتوں کا نچوڑ ایک میں بنایا تھا۔

"خواب ہی میں ہو کسی دن جلوہ گر یا مصطفیٰؐ —— الخ"

ہم سب کو یہ نعت بہت پسند تھی اور اکثر سنی جاتی تھی۔ ان دنوں جی چاہا کہ خود بھی اسی زمین میں نعت کہوں۔ مگر کبھی ایک مصرع نہ ہو سکا، ۲ر کی صبح اس کا مطلع گنگنا رہا تھا تو طبیعت ایسی حاضر ہوئی کہ دو گھنٹے میں ایک چھوڑ دو چیزیں ہو گئیں، سب احباب کے مطالعہ و معائنہ کے لئے حاضر ہیں" — ۵ر فروری (النقرہ)

دوستوں میں ڈاکٹر بشیر نے سفر حج کا ارادہ کیا تو اس پر خوش ہوئے اور فوراً اپنے حج کے ذکر کے حوالے سے جواب دیا۔

" ہاں خدا کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اتنا بڑا کام اور ایسی عزت و سعادت

حاصل ہوئی۔ بڑا شکر یہ ہے۔ حج اور حاضری مدینہ منورہ کے جملہ آداب و احکام کی بجا آوری میسر آئی۔ ورنہ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شرف حاصل ہوگا۔"

"ڈاکٹر صاحب کو عزمِ سفرِ سعادت مبارک ہو۔ خدا تکمیل کو پہنچائے اور قبول فرمائے۔"

فاروقی صاحب کی اسلام دوستی اور پیغمبر آخرالزمان سے دلی محبت ان کی زندگی کا اہم ترین پہلو تھا۔ وہ تحریروں کے علاوہ زندگی میں اٹھتے بیٹھتے اس بات سے کبھی غافل نہ ہوئے کہ وہ مسلمان ہیں اور مذہبی احکامات کی بجا آوری کو مقدس فریضہ تسلیم کرتے رہے۔ اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے رہے۔ عجب ستم ظریفی کی بات ہے کہ اس شخص پر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے وقت واقعی محسوس کرتے تھے کہ نطق زبان کے بوسے لے رہا ہے۔ ان پر بعض ایسے لوگوں نے اخبارات میں ایک غلط خبر کے حوالے سے رکیک حملے کیے۔ اس وقت فاروقی صاحب کا صبر و ضبط اور آنکھوں کے پپوٹوں کے پیچھے آنسوؤں سے واپس چلے جانے کی درخواست کی کیفیت دیدنی تھی۔ اور چنانچہ ان کے صبر ہی کا اثر تھا کہ اس وقت پشاور کے کمشنر جناب مسرور حسن نے اخبارات میں ایک ذاتی بیان دے کر اس معاملے کو ختم کیا۔ جس میں کہا گیا کہ جس خبر کا حوالہ دیا گیا تھا اس میں مسرور حسن خان خود موجود تھے نیز مسرور حسن خان کو فاروقی صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ ایسے عاشقِ رسول کے بارے میں منفی بیانات دینے والے محض ذاتی دشمنی کا حساب چکانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا فاروقی صاحب لسانیات و مذہبیات کے فاضل تھے اور سند یافتہ تھے۔ لیکن وہ ہومیو پیتھی طریقۂ علاج کے برصغیر میں چند سند یافتہ معالجوں میں سے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے معالج ہونے کے فن سے کبھی مالی فائدہ نہ اٹھایا۔ ان کے ہاں ہومیو اور بائیو ادویات کا ذخیرہ رہتا اور ہمیشہ علاج مفت کرکے اور دل لگا کر کرتے۔

میں وہ واقعہ کبھی نہ بھولوں گا جو ایک مرتبہ میرے ساتھ پیش آیا۔ میں راولپنڈی سے پشاور سکوٹر پر آرہا تھا۔ پیر پیائی کے قریب مجھے ایک حادثہ پیش آگیا اور میں سڑک

پر آٹھ فٹ تک گھسٹتا چلا گیا۔ میرے جسم کا دایاں حصہ ماتھے سے پاؤں تک یوں متاثر ہوا کہ خون تو نہ بہا لیکن چوٹ سر سے پاؤں تک تھی۔ میرا نصف جسم نیلا پڑ گیا۔ مجھے دراصل اباسین آرٹس کونسل کے انتظامیہ کے ایک جلسے میں پہنچنا تھا۔ کہ میں سکرٹیری تھا اور دوسرے دن ایک نمائش کا اہتمام تھا۔ راولپنڈی ایک شادی کے سلسلے میں جانا پڑا تھا۔ اور میرے اہلِ خانہ سبھی راولپنڈی ہی میں تھے۔ میں زخمی حالت میں اباسین آرٹ کونسل پہنچا۔ وہاں مولانا عبدالقادر مرحوم اور فاروقی صاحب مجلس انتظامیہ کے اراکین کی حیثیت سے موجود تھے، جب میری حالت دیکھی تو مولانا صاحب مجھے ANTITETANUS انجکشن لگوانے کیلئے ہسپتال لے جانے لگے، لیکن فاروقی صاحب مُصر ہوئے کہ میرا علاج اُن کے پاس ہے۔ دونوں زعماء میں اس بات پر تکرار ہوئی اور فاروقی صاحب جو خود بلڈ پریشر کے مریض تھے اور اُنہیں اکثر جلد ہی غصہ آجاتا تھا، جلال میں آگئے۔ مولانا عبدالقادر ان کی عادات سے واقف تھے۔ انہوں نے ہار مان لی۔ اور اپنی گاڑی میں مجھے اور فاروقی صاحب کو اُن کے گھر پہنچا دیا۔ گھر پہنچتے ہی فاروقی صاحب نے مجھے ایک خوراک ہومیوپیتھی کی ایک دوائی کی کھلادی۔ آپ یقین کیجئے اور میں زندگی بھر یہ بات نہ بھلا سکوں گا کہ خوراک حلق سے کیا اُتری مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے درد سے کلبلاتے جسم میں ٹھنڈک کی ایک رو جاری کر دی ہے۔ لمحوں میں میرا درد جاتا رہا۔ اور میں سکون محسوس کرنے لگا۔ مولانا عبدالقادر مجھے یونیورسٹی لے آئے اور پھر دوسرے دن میں نے اباسین کی اس نمائش کی ساری کارروائی میں عملی حصہ لیا۔ ایک صحت مند شخص کی طرح، اگرچہ میرے نصف بدن کی نیلاہٹیں کئی دنوں میں زائل ہوئیں۔

فاروقی صاحب کی یہ حکمت دور بیٹھے بھی چلتی تھی۔ اور چنانچہ ان کے اکثر خطوط ان کی حکمت کی باتوں سے پُر نظر آتے ہیں۔ میاں سعید الرحمٰن کی بیگم اکثر بیمار رہتی تھیں فاروقی صاحب نے ان کا علاج بڑی باقاعدگی اور توجہ سے کیا اور اس علاج اور توجہ کا ثبوت ان کے مکتوبات میں سے ذیل کے اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

"سخت شرمندہ ہوں کہ کل رات یا آج صبح دوا نہ پہنچا سکا، نتیجہ یہ کہ

آج صبح کی دوا ناغہ ہوگئی۔ ملزم ہوں اور شدید نادم۔ خیال تھا کہ شاید آج آپ صدر کا چکر لگائیں گے۔ مگر آپ بھی نہ آئے۔ بہرحال دوا اب حاضر ہے۔" ٹڑیا کل صبح دیجیے۔ اور شیشی کی دوا (گولیاں) پرسوں سے شروع ہو جائیگی۔

۸ راگست (رات)"

" مکرمی سعید صاحب السلام علیکم

شاہ جی کے لئے دوا کی شیشی بھیجتا ہوں، صبح شام دو بار کھائیں بارہ چودہ گولیوں کی ایک خوراک، زبان پر ڈال کر گولیاں چوس لیں دوا سے آگے پیچھے آدھ آدھ گھنٹے تک کچھ نہ کھائیں۔ سنیچر تک یہ دوا استعمال کرکے اتوار کو درانی صاحب قبلہ کے پاس ضرور جائیں۔ نسخہ منسلک ہے۔ — ۶ راکتوبر"

قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان (سابق صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی) سے ان کے دیرینہ یعنی آگرہ میں جامعہ اردو کے قیام (۱۹۴۸) سے مراسم تھے۔ اور ان کے حیدرآباد آجانے کے بعد اکثر ان سے شعبے کے کاموں کی وجہ سے ملاقات بھی رہتی۔ اور خط و کتابت بھی جاری رہی۔ ان کی طبیعت کی ناسازی پر مرحوم نے انہیں بھی نسخے تجویز کیئے۔ ۲۹ رجون ۱۹۶۸ کے ایک خط میں انہیں تحریر کرتے ہیں:۔

" ناسازیٔ مزاج کا حال معلوم کرکے سخت تردّد ہوا۔ اس کا ایک سبب گرمی بھی ہے۔ لیکن اصل باعث وٹامن کی کمی ہے۔ اس عمر میں بی کمپلیکس اور ملٹی وٹامن۔ دونوں بعد غذا کے استعمال کرنے از بس ضروری ہیں۔ اور ان کو کبھی ترک نہیں کرنا چاہئے۔ میری بھی ایسی کیفیت ہوگئی تھی۔ یا شاید کچھ زیادہ۔ ایک نیک ڈاکٹر دوست کے مشورے سے یہ دوائیں استعمال کیں۔ عرق عنبر سادہ کا عمل بھی یہی ہے۔ اعصابی کمزوری دور ہو جائے گی۔ تو سارا معاملہ بہتر ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔ منسلکہ کاغذ پر وٹامن ٹکیاں/کیپسول کے نام لکھے ہیں۔ ضرور استعمال فرمائیے۔ چند ہفتوں ہی میں فائدہ نظر آئے گا۔ مگر استعمال اب مستقل جاری رکھنا (میری رائے میں) قطعاً لازم ہے۔ اللہ فضل کرے گا۔"

۱۲ر اگست ۱۹۷۸ کے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو لکھتے ہیں :۔

" Tagamet دوا کی بابت میں نے اپنے دوست اور معالج ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ چھوٹتے ہی بولے کہ یہ دوا تو پیٹ کے السر کے لئے ہے اب نئی دوا آئی ہے اور السر میں بہت استعمال کی جاتی ہے"۔ کیا آپ کو پیٹ میں زخم تجویز ہوا ہے؟ بُری چیز ہے۔ مگر اس کا ہومیو پیتھک علاج بہت آسان اور اچھا ہے۔ میں خود باوجود اناڑی پن کے کئی مریضوں پر کامیاب علاج کر چکا ہوں اگر اس دوا نے فائدہ نہ کیا ہو تو وہ نسخہ عرض کروں؟"

۲۰ر اگست ۷۸ کو انہیں نسخہ تجویز کر ہی دیتے ہیں ۔

" آپ نے یہ نہ لکھا کہ کیا واقعی آپ کو Abdominal Ulcer کی شکایت ہے یا ایسی تکالیف ہیں جن سے پیٹ میں زخم کا احتمال ہو سکتا تھا؟ یا ڈاکٹر صاحب نے محض تیر تکا فرمایا ہے۔ بہرحال احتیاطاً اس تکلیف کی ہومیو پیتھک کی دوائیں لکھے دیتا ہوں۔ میں خود کئی مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا ہوں۔ اگر پیٹ میں زخم کا اندیشہ ہو تو یہ دوائیں استعمال فرمائیے:۔

(i) Uranium Nit 200 ہفتہ میں صرف دو بار یعنی ایک خوراک کے بعد تین دن ناغہ پھر ایک خوراک پھر تین دن کا ناغہ اس طرح کچھ دن جاری رکھیئے۔

(ii) Nux vomica 30 رات کو سوتے وقت روزانہ صرف ایک خوراک ۔ فی الحال دونوں دوائیں گولیوں میں ایک ایک ڈرام بنوا لیجئے پہلی تو مدتوں چلے گی دوسری ختم ہو جائے تو اور منگوا لیجئے۔ سات سے دس گولیوں تک کی خوراک۔ زبان پر ڈال کر چوس لیجئے اور بس"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہومیو پیتھک اور یونانی طریقہ علاج پر ان کا ایمان تھا اور ایلوپیتھی پر ان کا قطعی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن بعض مفید ایلوپیتھی کے نسخوں یا گولیوں سے پرہیز نہ تھا۔ دوسروں کو بھی تجویز کرتے۔ یعنی وٹامن وغیرہ۔

یہ خط اس لئے بھی دلچسپی کا موجب بنے گا کہ اس میں فاروقی صاحب مرحوم کے دل میں زندگی کی قدر بیمار کی تکلیف اور مایوسی کے عذاب کا احساس تھا۔ یہ خط فاروقی صاحب کی کوششوں اور خلوص کا بھی آئینہ دار ہے۔

بیگم سعید کو براہِ راست لکھتے ہیں۔

" مجھے بہت افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ گزشتہ سات آٹھ ماہ میں پابندی سے آپ کا علاج ہوتا رہا لیکن خدا کا حکم نہ تھا کہ افاقہ ہو۔ لیکن مجھے پھر بھی یقین ہے کہ اگر آپ دوا جاری رکھیں اور مجھے اِس خدمت کا موقع دیں تو کسی نہ کسی دن خدا کا فضل ہوگا۔ اور شفا حاصل ہوگی، جب تک سانس ہے تب تک آس ہے، پھر خدا کے فضل و کرم سے مایوس ہونے کی کسی مسلمان کو اجازت نہیں ہے۔ قرآن میں واضح طور پر یہ حکم دیا گیا ہے۔

البتہ یہ عرض کروں گا کہ اب آپ نے جہاں اتنی تکلیف اُٹھائی ہے وہاں تھوڑی تکلیف اور برداشت کریں اور ہومیوپیتھک کو اثر کرنے کا تھوڑا موقع دیں۔ مثلاً خواب آور انگریزی دواؤں کے استعمال کے ساتھ ہومیوپیتھک دوا بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایسی دواؤں سے پرہیز لازم ہے۔ آپ کو معلوم ہے، یہ انگریزی دوائیں بعد میں سخت نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لئے ان سے اگر عارضی منفعت ہو تب بھی گریز ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھار ایسی دواؤں کا استعمال اس امر کا باعث ہوا ہو کہ ہومیوپیتھک دوا بے اثر ثابت ہوئی۔

میں بڑے خلوص اور لجاجت سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی طرف سے مایوس نہ ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھئے اور اجازت دیجئے کہ آپ کا علاج پوری توجہ اور تن دہی کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ انگریزی دوائیں یکسر چھوڑ دیجئے۔ (قوت کے لئے کیلشیم، لیور ایکسٹریکٹ، گلوکوز قسم کی چیزوں میں البتہ مضائقہ نہیں بشرطیکہ آپ ان کو پسند کریں) خدا اور رسول کے لئے ذرا اور صبر و تحمل کو کام میں لائیے۔ دوسری دوائیں اور علاجوں سے آپ خود بھی عاجز آ چکی ہیں۔ تو کچھ مدت اور ہومیوپیتھی علاج

جاری رکھئے۔ کیا عجب کہ ان نئی دواؤں ہی میں افاقہ لکھا ہوا ہو۔ مگر شرط وہی ہے۔ کہ ایلوپیتھک کی ایسی دوائیں جو ان کے اثر کو زائل کر دیتی ہیں ہرگز استعمال نہ کی جائیں"۔

فاروقی مرحوم نے بعض باتوں کو زندگی کا اصول بنا کر برتا۔ اُصول پرستی تو خیر اُن کی زندگی کا جزو تھی۔ ان کی بچی کی شادی کی بات چلی تو میاں سعید کو لکھا، اس خط سے میاں سعید سے قرب اور وابستگی کا اندازہ بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بعد کی الجھنوں اور بکھیڑوں سے بچنے کی خاطر پہلے ہی سارے کام نک سک سے درست کرنے کے قائل ہیں۔ اور ساتھ ہی اصولوں، قانون اور دستور کا احترام بھی کرتے ہیں۔

" اتوار ۲۸ جولائی ۶۸
پشاور صدر

عزیز مکرم میاں سعید صاحب السلام علیکم

میں آپ کی کل کی سنائی ہوئی باتوں سے کچھ الجھن میں پڑ گیا۔ ازراہ کرم ذرا زحمت گوارا کیجئے اور ساری باتوں کو سلجھا کر میری مدد فرمائیے۔ میں نے آپ کے گھر بیٹھ کر ...... صاحب قبلہ کی خدمت میں اپنی الجھنیں پیش کر دی تھیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بات جوں کی توں ہے۔ محترمی ..... صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ باقی باتیں اضافی ہیں اور ان کے سلجھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ سلجھاؤ کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ایسا نہ ہو اضافی باتیں ہی اصل بن جائیں۔ اور پھر مجھے دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

۱۔ نکاح و رخصت کی کل تقریب میری اس چھٹی ہی میں انجام پا جانی چاہیئے ...... تقریب کے بعد بھی میں کچھ دن یہاں رہوں اور آنا جانا، ملنا جلنا ہوتا رہے تو میرے لئے بیحد طمانیت کا موجب ہوگا ...... تاریخ کی بات ابھی طے ہو جانی چاہیئے۔

۲۔ مہمانوں کے لئے میں نے جتنا سوچا اتنا ہی الجھا، میں تو بڑھ کر سو تک پہنچا تھا۔ مگر آپ کی رائے ڈیڑھ سو کی تھی۔ اب کل آپ نے دو سو کی خوشخبری

سنائی تو حضور والا حکومت کی طرف سے صرف دو سو تک کی اجازت ہے۔ اگر برات دو سو کی ہوگی تو کیا مجھے یہ اجازت نہ دیجئے گا کہ میں کچھ مہمان بلاؤں۔ شاید درمیانی راستہ یہ ہو کہ برات میں ڈیڑھ سو (مرد عورت ملاکر) رکھی جائے اور میں اپنے مہمان گھٹا کر پچاس تک محدود کر دوں۔ قانون اور پولیس دونوں سے میں کچھ زیادہ ہی ڈرتا ہوں۔

۳۔ برات، نکاح، رخصت سب کے اوقات معین کرنے بھی ضروری ہیں۔ رات کے گیارہ اور بارہ بجانے کا نہ تو میں قائل ہوں اور نہ یہ کسی کیلئے آرام و راحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

۴۔ کس وقت اور کیا مراسم و رسومات ہوں گے، یا ہوا کرتے ہیں مجھے بتاتے جائیں تاکہ میں ان کے لئے خود کو تیار کرسکوں۔ ویسے یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ میں بے معنی رسومات کا قطعی قائل نہیں ہوں۔ البتہ مستورات جو ذرا بہت کام اپنی خوشی کے لئے کریں گی، ان سے مجھے اختلاف بھی نہ ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کل کلاں کو مجھ سے شکایات پیدا ہوں اور مجھے محجوب ہونا پڑے۔

۵۔ ایک یہ عجیب مشکل ہے کہ مردوں کے باہم ملنے کا کوئی موقع یا حیلہ نظر نہیں آتا۔ تو گویا نہ کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ نہ کوئی مسئلہ طے ہوسکتا ہے، یعنی یہ مجوزہ و موعودہ رابطہ قریب لانے کیلئے نہیں بلکہ قریبوں کو دور کرنے کے لئے سوچا جا رہا ہے؟

۶۔ میری اہلیہ کو اصرار ہے کہ مہر پچیس ہزار ہوگا۔ مؤجل معجل ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر آپ تھوڑی تکلیف اور کریں تو میری رائے میں یہ مناسب ہے کہ جملہ جزئیات آج کل ہی میں طے ہو جانی مناسب ہیں۔ یہ غلط ہے کہ ایک ایک بات روز روز پوچھتا پھروں"۔

اصول پرستی کے ساتھ دوستی اور رہنمائی کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بعض لوگ ازل سے رہنمائی اور صلاح و مشورے کا خمیر لے کر آتے ہیں، فاروقی صاحب ہر وقت کسی نہ کسی کو زندگی کی راہوں کی اونچ نیچ اور پیچ وخم سے

آگاہ کرتے نظر آتے تھے۔ اپنے رفیقوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرتے تھے۔ خاندانی مسائل میں مفید مشوروں سے نوازتے۔ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا ڈھب سکھاتے اپنے ایک رفیقِ کار عبدالستار جوہر پراچہ کو الفقرہ سے لکھتے ہیں :۔

"آپ سے میرا جو رشتہ ہے اسکی وجہ سے آپ نے میری نصیحتیں ہمیشہ سنیں اب بھی دو ایک باتیں کہہ لینے دیجئے، ایک تو مطالعہ برابر جاری رکھئے اب تو ہر موضوع پر نئی سے نئی کتابیں طبع ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر اپنے موضوعِ تدریس، سے متعلق مطالعہ اہتمام سے جاری رکھئے، جو نئی بات معلوم ہو اپنے نوٹوں میں اضافہ کیجئے۔ دوسرے یہ کہ کلاس کو پورے وقت مصروف رکھئے بجائے اس کے کہ آپ کا کام ۴۵ منٹ سے پہلے ختم ہو جائے یہ ہونا چاہیئے کہ آپ گھنٹہ بجنے کے بعد اپنی بات ختم کریں، تیسری یہ کہ نوٹ سامنے روسٹرم پر رکھکر تقریر کرنے کی عادت ڈالئے۔ "اشارات" کا کاغذ سامنے ہو اور آپ تقریر کیا کریں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ خواہ معمولی معمولی چیز پڑھانی ہو لیکن روز کا لکچر روز از سرِ نو تیار کیا کیجئے۔ صدیقی صاحب چونکہ خود محنتی آدمی ہیں اس لئے آپ کی محنت سے اچھا اثر لیں گے۔ اگر کوئی مشکل ہو تو خود انہی سے حل کیجئے۔ اسی طرح تلفظ کی غلطیوں کی خاص طور پر اصلاح فرمائیے۔ یہ بنیادی باتیں ہیں ان کا خیال رکھئے گا۔ تو انشاء اللہ پوری کامیابی کے ساتھ وقت گذرے گا۔ باقی میں ان کو ضرور لکھدوں گا، اس طرف سے مطمئن رہیئے — ۷ رنومبر"

اپنی نصیحت کی عادت ہی کے بارے میں جوہر صاحب کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

"شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری نصیحتوں کا برا نہیں مانا۔ نصیحت کرنا میری عادت میں بطور بیماری کے شامل ہو گیا ہے" ۱۰ ردسمبر

دوستی، دوستوں اور رفیقوں کے کام کرنے کا جذبہ بھی ان میں بہت زیادہ تھا اس کا ثبوت اس خط سے ملے گا جو انہوں نے پشاور سے ایران میں سید مرتضی شاہ اختر جعفری کے نام لکھا۔

"پارسال آپ لوگ مجھے اسٹاف کلب کا نائب صدر بنا گئے تھے۔ اسی سال

ایک سکیم تھی کہ یونیورسٹی اسٹاف کے لئے کوآپریٹو طور پر ایک بستی بسائی جائے۔ زمین حاصل کر کے سب کو دی جائے۔ مگر اس وقت کے سیکرٹری ایسے کہاں کے مستعد تھے کہ یہ سب کام کرتے، گذشتہ سال میں انتخاب ہوا تو خاطر صاحب پھر سیکرٹیری بن گئے، ان کے اقتدار میں اس سکیم کی تفصیلات طے ہوئیں۔ اور سنا ہے کہ کسی زمین کا بھی انتظام ہو جائیگا۔ جو یونیورسٹی سے ملحق مغرب میں یا شمال مغرب میں ہے۔ بہر حال سکیم چل پڑی فی الحال ایک سو پانچ روپے فی کس عرضی کے ساتھ دئے گئے ہیں۔ پانچ روپے اس کی فیس رکنیت اور سو روپے حصص کی رقم بختیار صاحب نے آپ کی طرف سے رقم دے دی اور رسید کاٹ دی۔ آپ کی رسید کا نمبر ۱۰۱ (ایک سو ایک) ہے۔ یہ فارم حاضر ہے اسے پُر کیجئے رسید کے نمبر کی جگہ ۱۰۱ لکھئے اور ادائیگی کی تاریخ ۷ ستمبر ۱۹۶۷ء ڈال دیجئے۔ (یہ کام میں نے کر دیا) اب آپ اس فارم میں اپنے قانونی وارث (ایک یا زیادہ) جن کو آپ چاہیں لکھ دیجئے اور دستخط فرما دیجئے تاکہ اس عرضی کی تکمیل ہو جائے۔ شکر گذار ہونگا۔ آپ یہ فارم واپس کریں گے تو یہ اپنی جگہ پہنچ جائے گا۔ جلد توجہ کیجئے گا تاکہ ضابطہ کی تکمیل ہو جائے۔" ۱۸ ستمبر ۱۹۶۷

دوستوں کے کام کے معاملہ میں بچگانہ کام کرتے کرتے بھی تھکتے نہ تھے بلکہ لطف لیتے تھے۔ ہمارے ایک مشترک دوست محبوب عالم صاحب اور خود میاں سعید الرحمن کو بھی ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہے ان کی فرمائشوں کے جواب میں الفرہ کے مختلف خطوط میں لکھتے ہیں:۔

" ٹکٹوں کی فرمائشیں حفظ یاد ہیں تعمیل کروں گا۔ محبوب صاحب مطمئن رہیں۔" ۶ دسمبر ۶۸

" محبوب عالم صاحب اور آپ کیلئے ٹکٹ خرید کر رکھ لئے ہیں۔ بس بھیجنے میں تساہل ہوا۔" ۱۲ جنوری ۶۹

" ترکی کے کچھ ٹکٹ ارسال ہیں۔ ایک سیٹ آپ کے لئے اور ایک محبوب عالم صاحب کے لئے۔" ۲۵ جنوری ۶۹

"محبوب عالم صاحب کے اور آپ کے لئے سات ٹکٹ اور حاضر ہیں قبول کیجئے۔"
۲ر جون ۶۹

"اورکا کی نمائش کے ٹکٹ یہاں ابھی نظر نہیں آئے۔ یہ یورپ کے جانے کا بے کے تین ٹکٹ جاری ہوئے ہیں، آپ کے لئے یہ اور دوسرے کئی ٹکٹ جمع کر رکھے ہیں۔" ۲۰ر مارچ

فاروقی صاحب کی طبیعت میں مزاح بھی بہت تھا، ویسے تو وہ اکثر لطیفے بھی سنایا کرتے لیکن اُن کے لطیفے وہ نہ ہوتے جو ہم بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر سنایا کرتے ہیں۔ اور جن کے احمد ندیم قاسمی "حافظ" ہیں۔ فاروقی صاحب کا لطیفہ دراصل محض کوئی واقعہ ہوتا تھا۔ ایسا واقعہ جس میں سے ہنسی والی بات منہا کر دی جائے، لیکن مزاح کے معاملے میں وہ بڑے باخبر شخص تھے، ان کا ایک مقالہ "طنز و مزاح" پر ایک اعلیٰ تنقیدی شہ پارہ ہے۔ جس میں مزاح کے مختلف مدارج کا تذکرہ بڑی تفصیل اور جزئیات سے کیا گیا ہے۔

ان کے خطوط دوستوں کی یاد اور یادوں کے خوابوں کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ "یارانِ ہر شب" کے بے تکلف دوستوں سے خطوط میں نوک جھونک بھی چلتی تھی۔ پھر میاں سعید کے پنجابی خطوط کا مذاق بھی اڑایا کرتے۔ چند ایسے اقتباسات ان کی حسِ لطیف کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرتے نظر آئیں گے:۔

"چوں چوں کا مربا پرسوں مل گیا تھا۔ طرح طرح کے ذائقے اور چٹپٹے مزے آئے جزاکم اللہ"

"یہاں حلیم اور نہاری اور کباب کی پارٹیاں بھی انہی مصروفیتوں کے ساتھ اڑائی جاتی رہیں۔ عجب شہر ہے مگر یار جب تک سیر و تفریح رہی سب ٹھیک، پھر جی گھبرا جاتا ہے۔ البتہ اگر روپیہ تھوک میں آئے اور تھوک ہی میں خرچ کیا جا سکے تو بڑا سکون ملتا ہے۔ سو ایسے کالے پیلے راستے ہمیں کب میسر آسکتے ہیں۔"
کراچی ۱۵ر اگست ۱۹۶۶

"یارانِ ہر شب" کے جرمانے انہیں پاکستان اور بیرون پاکستان یاد رہے، لطف دیتے رہے اور تڑپاتے رہے۔ چند ایسے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"محب عزیزم جوہر صاحب ، جب آپ سعید کمپنی کے اضافی رکن ہیں تو الگ خط لکھنے کے کیا معنی ؟ دیکھئے جرمانہ ہوگیا فیصلہ وصول کرنے والے سعید صاحب اور بشیر صاحب ، وصولیابی کا زمانہ اوائل ستمبر"

"محب مکرم محسن!

یادآوری کا شکریہ بھئی ! سعید کا علاج بھی کیا دشوار ہے ، بس چند لقمے خیر اب میں نے وعدہ کرلیا ہے میں واپس آکے پورا کراؤں گا لیکن اگر وہ اگست ہی میں آپ کو مونڈنے میں کامیاب ہوگئے تو جرمانہ ڈبل ہوجائیگا۔"

تحریر میں یارانِ ہر شب کے بجائے...... شپ چہ معنی دارد۔ ترکی زبان میں شپ کے معنی ہیں پھٹکری میاں سعید صاحب نے تو پھٹکری نہیں دی تھی ، یہاں کسی قسم کے لوشن یا پھٹکری کی کئی دن تلاش جاری رہی مگر بے سود۔ آخر نائی سے رجوع کرنا پڑا۔ اس مسخرے نے لاکر پھٹکری کی ٹکیہ دکھائی تو اس سے اسکا ترکی ترجمہ معلوم ہوا اور یہ مشکل حل ہوئی۔"

یار لوگو! سنو! یہاں سعید نے میرے ذمّے بہت سے جرمانے لگا رکھے ہیں اور اب طیّب میاں کی فرسٹ ڈویژن میں کامیابی' انہیں ایک اور بہانہ مل گیا۔ بلکہ اور جانے کیا کیا۔ اور لطف دیکھئے! عزیز صاحب سے لکھوایا ہے کہ صاحب سنگھ بلڈنگ (فاروقی کا دولت کدہ) میں کچھ کھانے کا پروگرام بھولا جارہا ہے ، جلدی آکر تازہ کرو۔ شاید اسی لئے میرے آنے میں کھنڈت پڑی ہے ، ورنہ میں تو جلد ہی بھاگنے کی فکر میں تھا۔ اور اب آئے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے کہ چندیا مونڈی جائے گی۔"

"شمیم صاحب ! یہ دانت کا درد یعنی چہ ؟ ایسا کہاں دانت مارا ہے جو درد چھوڑ گیا ہے ؟"

" صدر صاحب جرمانہ کس پر کریں ؟ سوال بے ڈھب ہے۔ نئی نئی

اسامیاں کہاں تک ایجاد ہوتی رہیں گی؟ یہ آپ کی رائے درست ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر جرمانہ کرلیا کریں۔ مگر اندیشہ یہ ہے کہ اپنا پیسہ مشکل سے ہضم ہوگا۔ دوسروں کا مال تو مالِ غنیمت کے حکم میں آکر ہضم ہوجاتا ہے۔ بہتر رہے کہ اور کوئی نہ ملے تو کبھی اپنے اوپر جرمانہ کریں۔ کبھی آپ کے اوپر اور کبھی جرمانہ میرے کھاتے میں ڈال دیں۔ اس "تقسیم کار" سے ہضم میں فتور آنے کا خطرہ جاتا رہے گا اور صحت بحال رہے گی۔"

عزیز صاحب لڑکیوں کے اسکول میں ملازم ہوگئے، خوب ہوا مگر خطرات کا کیا ہوگا، ان سے پوچھیئے تو۔"

بشیر ہوائی کی بچی پیدا ہونے پر لکھتے ہیں:

"بشیر ہوائی نے یہ کیا بے اعتدالی کی، یوں تو حکومت کا سنگھاسن ڈانوا ڈول ہے لیکن خاندانی منصوبہ بندی والوں کو اطلاع ہوگئی تو پیچھے پڑ جائیں گے۔ ان سے کہئیے آئندہ احتیاط فرمائیں"

"ڈاکٹر بشیر صاحب! ذرا تو اپنے ہم نام پر ترس کھائیے۔ شاید اب رمضان میں ان کی جیب محفوظ رہے، ایسے شریف و شائستہ آدمی پر بجائے جرمانے کے انعامات کی بارش مناسب ہے۔ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ کہیں جرمانے کی کہانی اندرونِ خانہ نہ پہنچ جائے۔ پھر تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"برادرم بشیر ہوائی آپ بھی جرمانے کے بجائے سخت قسم کے میوے پیش کیا کیجیے تاکہ ان کے دانتوں کی اور پھر معدے کی ورزش ہوا کرے۔ یہاں تو بعض ایسے میوے ہیں، کہئیے تو بھیج دوں، پھر زیادہ تر ورزش ہی ہوا کرے گی۔ لذتِ کام و دہن کی نوبت مشکل سے آئے گی۔ بس یار لوگ جرمانے سے توبہ کرینگے۔"

"ڈاکٹر صاحب محترم! جرمانہ، حلوا، کادہ اور اس سب کے ساتھ میری یاد، بیحد ممنوں ہوں۔ اچھا ہوا بشیر ہوائی صاحب لاہور چلے گئے۔ ورنہ کپڑے اترنے باقی رہ گئے تھے۔"

"اور یہ بتائیے کہ آپ نے آغا سے پورا ایک صفحہ بھر دینے کی وجہ سے

۲۵ پیسے وصول کئے یا ان کے بہلاوے میں آکے مٹھائی کھائی ان سے اور حساب میں ڈال دی میرے، اسی لئے تو دکان دار سے دوستی مہنگی پڑتی ہے۔ ان کا کھاتا کم بخت عدالت میں بھی مان لیا جاتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

اس لاحول کا لطیفہ سنیئے، یہاں ایک عزیز کے ہاں کھانا کھایا۔ دو سالن تھے دونوں نمبر ایک، میرے لئے انہوں نے پراٹھے ایجاد کئے تھے، اس لئے کھانا ضرورت سے زیادہ لذیذ ہوگیا تھا۔ کچھ زیادہ ہی کھایا گیا۔ اس کے بعد ایک میٹھی چیز آئی وہ کم بخت بھی بہت مزیدار تھی۔ میں نے پہلا لقمہ لیکر لاحول پڑھا۔ (انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا) اور اسی کے ساتھ میں نے کہا بہت مزیدار ہے۔ اور احتجاج کیا کہ اگر کھانے کی کئی چیزیں ہوں اور سب الگ الگ مزیدار ہوں تو خواہ مخواہ آدمی زیادہ کھا جائے گا۔ بولے میں تو گھبرا گیا تھا کہ آپ بدمزہ ہونے کی شکایت کرینگے آپ نے تو لاحول کی نئی توجیہہ کی۔"

فاروقی صاحب نے ادب، حکمت، مذہب، دوستی اور دشمنی میں بہت مصروفیت کی زندگی گزاری لیکن کھیلوں سے بھی ان کی دلچسپی شروع سے تھی۔ جب آگرہ میں پڑھاتے تھے تو کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس اور بیڈمنٹن سے شغل کرتے تھے۔ چنانچہ بعد میں مختلف بکھیڑوں میں پھنسنے کے باوجود کھیلوں سے غافل نہ رہے اور ان کا کھیلوں کا اشتیاق خطوط میں بھی جاری رہا۔ چند ایسے اقتباسات اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں:-

" پاکستان کا ہاکی میں طلائی تمغہ جیتنا مبارک ہو۔ ہندوستان تو لس بول گیا۔ اب دُنیا بھر کی ٹیمیں بہت اوپر آگئی ہیں۔ اس سال کے ہاکی کے میچ قابل دید و شنید ہوں گے۔ آگے کو اور سخت مقابلے ہونگے۔ خدا کرے پاکستان کا وقار آئندہ بھی سربلند رہے — ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ - الفرہ"

" آسٹریلیا کا میچ تو کل ختم ہوجائیگا اب نیوزی لینڈ اور پھر واپسی پر انگلینڈ سے میچوں کی خیر منائیے۔ خدا کرے کہ آسٹریلیا کے میچوں کا تجربہ کام آئے"

گجرات ۱۰ جنوری ۱۹۷۳

شطرنج کے منجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ پشاور میں ان کی شطرنج کی ٹکڑی الگ تھی۔ انقرہ میں شطرنج منجھے نہ ملے، ایک خط میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے:۔

"اب کے حاجی عبدالعزیز صاحب نے بھی محبت سے یاد کیا۔ بحد شکریہ۔ یہاں شطرنج کا موقع کہاں۔ مگر کچھ فرضی مصنوعی گر یاد کر لاؤں گا تاکہ ان کی ضیافت ہو سکے اور مری کا وقت سکون اور تفریح میں کٹے۔"

ان کے خطوط میں ہر رنگ اور ہر مزہ موجود ہے۔ ہر عمر اور ہر ذوق کے آدمی سے اسی کی سطح پر اتر کر بات کرتے تھے۔ ترکی گئے تو خطوط میں سیاحت ناموں کا حق بھی ادا کیا، حج بیت اللہ شریف کیلئے گئے تو عشق نبیؐ سے سرشار ایک ایک ذرے کا حال لکھا، کراچی جاتے، لاہور یا گجرات وہ وہاں کے موسموں، جیبیوں دوستوں اور تفریحات کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے۔

ادبی تقریبات برپا کرنے کا بہت ذوق و شوق تھا۔ پشاور یونیورسٹی میں ہر سال بہت بڑے پیمانے پر "یوم اقبال" ان کی وجہ سے منعقد ہوا کرتا۔ دوسری تقریبات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ترکی گئے تو یہ ذوق ساتھ رہا۔ چنانچہ ان کے ان اقتباسات سے تقریبات منعقد کرنے اور تقریبات کا حال سننے کا ذوق مترشح ہوتا ہے۔

"یہاں سفارت خانے میں تو تھوڑا اسٹاف ہے مگر سینٹو کے افراد ملکر پاکستانیوں کی خاصی تعداد ہوجاتی ہے۔ سینٹو والوں کی مستعدی کی وجہ سے یہ لوگ آپس میں ملتے جلتے بھی رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی کے گھر قرآن خوانی کی تقریب ہوجاتی ہے بس بہانہ چاہیئے۔ اسی طرح کبھی کبھار مشاعرہ بھی کر لیتے ہیں۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ طرحی مشاعرہ ہوتا ہے۔ اگلے ۲۵ رمئی کو ہے۔ غالباً سفیر پاکستان ہدایت کریں گے۔

کمال یہ ہے کہ ۲۴ سال کے بعد میں نے بھی طرح پر غزل کہہ لی ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا، کہ خدا کے فضل سے میں سکون سے ہوں ورنہ اس سے پہلے کبھی ارادہ بھی کیا تو شعر نہ ہو سکے" ۱۶ رمئی

"میں بخیریت ہوں خالی وقت گذارنے کا مشغلہ یہ ایجاد کیا ہے۔ کہ غزلیں لکھنے کی فکر میں رہتا ہوں۔ یہاں پاکستانیوں نے "بزمِ خیال"

قائم کر رکھی ہے۔ سال میں تین چار طرحی مشاعرے ہو جاتے ہیں۔ مئی کے بعد ۲۶ ر اکتوبر کو ہوا تھا۔ اس کے لئے غزل کہی تھی۔ پھر ایک اور زمین نکال کر اس میں غزل کہہ ڈالی۔ اب مزید غزل کی فکر میں ہوں۔ ہوٹل میں سارا وقت خالی گذرتا ہے اس لئے دل بہلانے کے لئے یہی مشغلہ مناسب معلوم ہوا۔" ۱۲ر نومبر

"میں نے بھی یہاں ایک مختصر جلسے کی تقریب ایجاد کی ہے۔ تفصیل جلسے کے بعد بھیجوں گا۔ چونکہ وسط ماہ لوگ حج کو جائیں گے۔ اور بعض اصحاب ان سے بھی پہلے تبادلے پر پاکستان واپس جانے والے ہیں اس لئے یکم فروری کو جلسہ رکھا ہے اول کچھ نظم و نثر غالب سے متعلق، پھر غالب ہی کے ایک مصرع پر طرحی مشاعرہ۔ میرے ایک ۳۴-۳۵ سال پرانے شاگرد یہاں ہیں، ان کے گھر تقریب ہوگی۔ تاکہ میزبانی کی عزت مجھے حاصل ہو۔" ۲۵ر جنوری۔

"یکم فروری کو میری تحریک پر غالب کی صد سالہ برسی کا جلسہ اور غالب کے مصرع پر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ ضیافت میں نے اپنے ذمے رکھی تھی اس لئے اس اجتماع کی اپنے ۳۵ سالہ پرانے شاگرد (سردار احمد خان صاحب) کے گھر میں دعوت دی تھی۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ میں صدارت کروں مگر مناسب معلوم نہ ہوا۔ گو دعوت نامہ یہاں کی اپنی انجمن "بزم خیال" کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ مگر سب کو علم تھا کہ بانی مبانی تو میں ہوں، بلکہ سکریٹری صاحب نے تفصیل سے میری اس تحریک اور سرپرستی کا شکریہ (باوجود میرے باصرار منع کر دینے کے) ضروری جانا۔ ہاں! تو جناب رشید تبسم صاحب سے جو سفارت خانہ میں سکریٹری ہیں صدارت کرائی۔ اجتماع بہت عمدہ تھا۔ بعض ترک بھی شریک تھے۔ پہلی قسط میں غالب پر نظمیں اور قطعات اور میرا مقالہ ہوا لوگوں نے میرا مضمون بہت پسند کیا۔" ۵ر فروری

"تازہ واردات کا کیا پوچھتے ہیں۔ غزلیں کہنے کے سوا کام ہی کیا ہے۔ مگر طبیعت کھٹل ہے۔ دیر میں شعر اترتا ہے۔ ویسے یوں سمجھئے کہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک ۳۹ غزلیں

ہوئی تھیں۔ اور مئی ۱۹۶۸ء سے اب تک ۲۵ ہوئی ہیں (۲۶ ویں زیرِ تعمیر ہے)
اور اسی سال واپسی کے بعد سے یعنی ۸ نومبر سے آج تک فقط ۱۸ ہوئی ہیں۔
میری رائے میں وقت گذاری کا بہترین مشغلہ اور معصوم گناہ شعر بازی ہے۔ یکم فروری ۶۹ء

"۲۱ اپریل کو یومِ اقبال منا رہا ہوں، کچھ اس کا انتظام و انصرام بھی درپیش ہے۔ خدا کرے اچھا جلسہ ہو جائے۔ ساری کارروائی، حد یہ کہ میرا مقالہ بھی ترکی میں ہوگا۔ ترجمہ تو کرا لیا ہے اب پڑھنے والے کی تلاش ہے، توقع ہے کہ مقالات کا کتابچہ بھی قبل از وقت تیار ہو جائے گا۔" ۶ اپریل

"یومِ اقبال کے تین پروگرام ملے۔ بیحد لطف آیا، گو ان خطوں اور ان پروگراموں نے مجھے پھر پشاور پہنچا دیا۔ اپنے طویل انتظار اور تشویش کی تلافی ہو گئی۔ یومِ اقبال کی گرما گرمی رہی ہوگی۔ آپ تو اکبر کا شعر پڑھکر تسکین حاصل کر لیتے ہونگے!

ہم تو سنتے ہیں یہ فسانے ؎ جس نے دیکھا ہو وہ جانے

بندۂ خدا! ایسے روح پرور جلسوں میں تو دوکان کو تیغا کر کے جانا چاہیئے۔
میں نے بھی یہاں ۲۱ اپریل کو یومِ اقبال منایا۔ خدا کے فضل سے بہت اچھا جلسہ ہو گیا۔ اُردو صرف اتنی تھی کہ میرے ایک طالب علم نے اپنا مضمون اُردو میں پڑھا۔ یا کلامِ اقبال ترنم میں اور کورس میں اُردو میں تھا۔ باقی سب کارروائی نقد ترکی میں تھی۔ میرا مضمون بھی ترکی میں تھا، سفیر صاحب کی تقریرِ صدارت بھی ترکی میں تھی مگر ان کو پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی اور انگریزی میں پڑھی۔ بہرحال خدا نے عزت رکھ لی کہ سب نے جلسہ پسند کیا۔ بعض حضرات نے تو بے ضرورت تعریف میں مبالغہ کیا، شکر ہے۔" ۷ مئی ۱۹۶۹ء

"خاطر صاحب محب مکرم! آپ نے تو یومِ اقبال (بلکہ ایامِ اقبال) کی ساری تفصیل کوزہ میں بند کر دی۔ خوب رونق رہی ہوگی۔ بلکہ آپ جیسے ہر دلعزیز اور ہر جانب یک احباب تو پروگراموں سے تھک گئے ہوں گے۔ خوب ہوا، ایسے ہنگامے صحیح رونق اور افادیت رکھتے ہیں۔ آپ کی اور محسن صاحب کی نئی نظموں کا اشتیاق رہیگا۔ میری شاعری مضمحل ہو گئی ہے۔"

غالب نے تعزیتی خطوط کا نرالا ڈھب نکالا۔ ان کے خطوط ان کے خیالات

ے تنوع ان کی شگفتہ تحریر کے لئے پڑھتے ہیں۔ فاروقی صاحب کا تعزیتی خطوط کا اور ہی انداز تھا۔ جو ان سے مخصوص تھا۔ اس میں اسلامی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ تاج سعید کی ایک عزیزہ کی ایک حادثہ میں وفات پر لکھتے ہیں:۔

"تاج سعید صاحب کی عزیزہ کی حادثہ میں رحلت یقیناً اندوہناک سانحہ ہے۔ خدا مغفرت کرے ھدمی (گر کر رحلت کرنے والے) کو فقہ میں شہید کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسلئے وہ تو اچھی رہیں مگر اعزہ کے لئے البتہ بہت سخت حادثہ ہے۔ خدا سب کو صبر عطا کرے"۔ ۱۳ر جولائی

"آج صبح فیکلٹی گیا تو آپ کا پہلا خط ملا، جس میں حضرت ضیا صاحب کی شدید علالت کی اطلاع تھی۔ سہ پہر کو جلسے کی شرکت کے لئے دوبارہ گیا تو آپ کا دوسرا خط ملا۔ جس میں مرحوم کے وصال کی اطلاع تھی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سخت سانحہ گذر گیا۔ آپ کے خسر صاحب مرحوم کے وصال کے بعد اتنے قلیل عرصے میں ایسے شفیق بزرگ کی رحلت کا حادثہ شدید سے شدید تر ہے۔ کیسی پیاری شخصیت تھی۔ کیسی اچھی زندگی گزاری۔ میرے ساتھ کیسی شفقت و محبت تھی۔ بیک وقت دونوں بزرگ یاد آرہے ہیں اور دل کو تڑپا رہے ہیں۔ پس ماندگان کے لئے کیسا جگر خراش اور دلدوز صدمہ ہے۔ آہ آہ!! خدا سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔

ابھی ڈاکٹر مرتضیٰ جعفری سلمہ کو خط لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا لکھوں۔ ان کو لکھنے کے لئے بھی قلم گنگ تھا۔ آپ کے اور دیگر احباب کے لئے یکساں روح فرسا حادثہ ہے۔ مجھے کیسی حسرت ہو رہی ہے۔ کہ میں اپنی دوری کے باعث نہ ایک شفیق کے کسی کام میں شرکت کر سکا اور نہ اب ان دوسرے مشفق مخدوم کے (دا)سم میں شرکت کے قابل ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ...... میں تو نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہتا تھا کہ پشاور پہنچوں گا۔ تو حضرت ضیا صاحب

۱؎ عبدالرشید صاحب محکمہ تعلیم کے ایک ہر دلعزیز افسر تھے جو موٹر کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔

(سید ضیا جعفری) مرحوم و مغفور کی خدمت میں اپنے مختلف مقامات کے تأثرات پیش کروں گا۔ افسوس کہ وہ پہلے ہی واصل بحق ہو گئے"

حقیقت یہ ہے کہ موت ایک حقیقی راستہ ہے کچھ لوگ پہلے واصل بحق ہو جاتے ہیں کچھ بعد میں ـــ لیکن جو لوگ زندگی میں کچھ ایسے کارنامے کر جاتے ہیں جو لوگوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں تو وہ ان کاموں کے حوالے سے مرحومین کو یاد کرتے ہیں اور یوں ایسے مرنے والے مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں۔ سید ضیا، جعفری بھی اپنے ادبی کارناموں اور علمی و روحانی فیوض کی وجہ سے زندہ ہیں۔ حضرت محمد طاہر فاروقی بھی اپنے گوناگوں مفید اور تاریخی کارناموں کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور وہ سب ان سے محبت کرتے تھے۔ اور محبت کرتے رہیں گے۔ ان کی مشفقانہ عادات، درس و تدریس، علمی کارناموں، مذہبی ملفوظات اور ادبی نگارشات ان کی ایسی اولادیں ہیں جن کا حرف حرف جب تک چمکتا رہے گا، فاروقی صاحب بھی زندہ رہیں گے۔

عبدالستار جوہر پراچہ
اُستاد شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی

تنقید کا روشن مینار

اُردو ادب میں جب بھی جدید دور کا تذکرہ ہوتا ہے، تو اس کا سلسلہ عام طور پر جنگِ آزادی کے بعد کے اثرات، رجحانات اور اقدار سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہمارے ادب میں ایک انقلاب آیا۔ حالی غالباً پہلے اُردو ادب کے محسن تھے، جنہوں نے اپنی تخلیقات اور تحریروں میں "پیروی مغرب" کی ترغیب دی۔ اور یہ ترغیب اتنی عام ہوئی کہ ہر ادیب، شاعر اور نقاد نے ادب اور زندگی کے لئے اس روش کو ضروری قرار دیا۔ اس بات سے غیر جانبدار مبصر انکار نہیں کر سکتے کہ مغرب کی تقلید نے ہمارے ادب کو نہ صرف مالا مال کیا۔ بلکہ اسمیں اضافہ کر کے اسے "جدید" کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اگرچہ ہمارا مشرقی معاشرہ مغرب سے اتنا متأثر ہوا کہ اسے بہت کچھ کھونا پڑا۔ لیکن مغربی تعلیم نے جہاں مغرب پرستی کا رجحان عام کیا۔ وہاں ہمارے علوم و فنون پر گہرا اثر ڈالا۔ اور ہر فرد مغرب کی روشنی میں ادب اور زندگی کو قدیم اور جدید کے پیمانوں میں باٹنے لگا۔ نئی نسل نے تو مغرب ہی کی ضیا میں راستے ہموار کئے۔ اور اکثر نے روایت سے بغاوت کر کے "جدیدیت" کی ترنگ میں قدیم ادب میں ہر قسم کی کمزوریاں تلاش کرنی شروع کر دیں۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی اور اسکی قدروں کے سانچے بدل گئے۔ تنقید نے بھی نئی جہتیں استوار کیں۔ اور آواز بلند ہونے لگی کہ اُردو ادب میں تنقید کا وجود تک نہیں۔ ہم اس سلسلے میں کسی دفاع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کہ قدیم اور جدید کی تقسیم اور مغرب پسندی نے ان ادبی نقوش کی جستجو تک نہ کی جو ارتقائی حیثیت سے قابلِ تقلید ہو سکتے تھے۔ اور اس طرح "مغرب پسند" نقادوں کو اُردو ادب تنقید سے خالی نظر آنے لگا۔ وہ تذکرے

اور تنقیدی تخلیقات جو حالی سے پہلے تھیں جدید دور کے علمی تقاضوں سے معریٰ قرار پائیں۔ اور اس طرح جدید نقادوں کو اُردو ادب کی توانائی وقار اور صحتمندی کا کوئی نقش تک نظر نہ آیا۔ اور نہ ہی انہیں حسن کی عظمت۔ صحیح احساسات۔ اسالیب کا امتزاج۔ صحیح موضوعات کا تنوع اور تجربات کی پیچیدگی اور تنقیدی فکر و نظر کہیں نظر نہیں آیا۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی تنقید کے روشن مینار تھے جنہوں نے تنقید کے اس نازک اور لطیف امتزاج کو نہ صرف سمجھا بلکہ سمجھانے کی کوشش کی۔

تنقید کے متعلق آج تک بے شمار تشریحات سامنے آئی ہیں جن کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ تنقید ادب وفن کی تشریح کرتی ہے۔ محاسن اور معائب کا تعین کرتی ہے۔ یہ تفسیر حیات بھی اور تشریح حیات بھی، کیونکہ اس کا تعلق ادب سے ہے۔ جو زندگی کے رنگا رنگ موضوعات کو پیش کرتا ہے۔ تنقید زندگی کا کھوج لگائے یا ادب کی تشریح کرے۔ روایت کو واضح کرے یا "ترفع" کی نشاندہی کرے۔ ادب میں اسلوب، موضوع اور ہیئت کو موضوع بنائے یا زندگی کی روشن قدروں سے بحث کرے وہ تنقید ہی ہوتی ہے۔

ادب اور زندگی میں تنقید کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ناقد کے کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں، اور ان میں اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ نقاد اپنے تنقیدی فیصلوں کے لیے اصول مرتب کرے۔ اپنے معیار کے تعین کیلئے نظریہ پیش کرے۔ وہ غیر جانبدار ہو۔ اور اسکی ادبی تنقید دیانت پر مبنی ہو۔ وہ باخبر اور ہمدرد ہو۔ اس طرح اسکی تنقید سیپی میں جھانک کر پوشیدہ خزانہ لا سکتی ہے۔ جس طرح ملک میں امن وامان قائم رکھنے کیلئے۔ قانون۔ جج یعنی قانون دان۔ پولیس جو قانون کو نافذ کرتی ہے۔ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دُنیائے ادب میں صحت مند ادب کیلئے امن و امان کی ضرورت ہے۔ کسی کتاب پر ریویو کرنے والا مبصر اس پولیس والے کی طرح ہوتا ہے، جو ٹریفک کنٹرول کرتا ہے پیادوں کو راہ دکھاتا ہے۔ بجلی گھر اور دیگر اہم تنصیبات کی حفاظت کرتا ہے۔ جس طرح جج قانون کی حفاظت کرتا ہے۔ قانون شکنی والے کو سزا دیتا ہے، اور قانون بھی بناتا ہے۔ نقاد بھی ادب کیلئے وہ جج ہے، جو اصول بناتا ہے۔ اور پھر ان کے مطابق ادب پر بحث کر کے اغلاط کی گرفت کرتا ہے۔ یہ ہے پولیس والا جو مبتدیوں کو ادب کی راہ دکھاتا ہے اور سمجھاتا ہے۔

زندگی کی اقدار زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ادب کے رجحانات بھی ہر دور میں یکساں نہیں رہتے۔ جس طرح بیسویں صدی کی سائینس نے پرانی سائینس کو ختم کردیا۔ اسی طرح نئی تنقید نے قدیم تنقید سے منہ موڑ لیا۔ لیکن ادب اور تنقید سائینس نہیں کہ ختم ہوکر رہ جائے۔ قدیم ادب زندہ ہے۔ اور شاید حال کے ادب سے اچھا اور دلچسپ۔ اس طرح ہم ماضی کی تنقید کو بھی فراموش نہیں کرسکتے۔

نقادوں کی بڑی قسمیں ہیں۔ اور تنقید کے بے شمار پہلو۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نصابی نقاد تھے۔ کیونکہ وہ زندگی بھر معلّمی کے پیشہ سے منسلک رہے۔ نصابی نقادوں سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں کہ وہ حقیقت کی ظاہری اور سطحی شکلوں پر توجّہ دیتے ہیں۔ وہ آزاد کو انشاء پرداز، حالی کو نقاد اور شبلی کو مورخ کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ ان کے لئے ولی دکنی جمال پرست میر حزن و یاس کا مجسمہ، درد صوفی، انیس فصاحت و بلاغت کا خزینہ ہے۔ اور وہ تنقید میں اپنی پسند کے اجزاء منتخب کرلیتے ہیں۔ لیکن ایسی غلط فہمیوں کے باوجود آج جتنے بھی نقاد ہیں۔ ان میں بڑی تعداد نصابی نقادوں کی ہے۔ جنہوں نے تخلیقی نقادوں سے زیادہ بصیرت افروز تنقیدی فیصلے دئے ہیں۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی کے تنقیدی کارناموں کی فہرست طویل ہے جنمیں اہم مقالات یہ ہیں:۔
۱۔ ہماری قدیم داستانیں۔ ۲۔ اُردو مرثیہ۔ ۳۔ اُردو مثنوی۔ ۴۔ اقبال کا مردِ مومن۔ ۵۔ ساقی نامہ ۶۔ اُردو قصیدہ۔ ۷۔ اُردو رسم الخط۔ اور دیگر کئی ایک۔

سیرت اقبال۔ اقبال اور محبت رسول کے علاوہ نصابی اور غیر نصابی کتب بھی ہیں۔

پروفیسر فاروقی کے ان تنقیدی کارناموں میں کوئی مخصوص نقطۂ نظر نہیں۔ لیکن ان کا تنقیدی شعور زمانے کے مسلّہ تنقیدی اصولوں سے میل کھاتا ہے۔ اگرچہ ہمارے یہاں اب تنقید معلّقیت کی کمرا اقلیدس کا موہوم نقطہ نہیں ہے۔ تأثراتی اور نفسیاتی تنقید سے قطع نظر عام طور پر تنقید کے کچھ اصولوں پر تمام مکاتیبِ فکر کا اجماع ہوچکا ہے۔ موضوع و مواد، ہیئت و اسلوب فکر و فن کے بارے میں اصولاً کچھ تنقیدی ضوابطاب متفق علیہ ہیں۔ اختلاف صرف علمی تفصیلات میں ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے تنقیدی کارناموں کے متعلق یہ کہنا کہ ان میں کوئی خاص تنقیدی شعور کا پتہ ملتا ہے غلط ہے۔ لیکن یہ حقیقت ان کے تنقیدی افکار میں ایک خاص جذبہ اور خلوص ملتا ہے۔

اُردو ادب کی قدیم داستانوں پر دور جدید میں مختلف قسم کے اعتراض کئے گئے ہیں۔ فاروقی صاحب نقادوں کا نام لئے بغیر اُردو ادب سے اپنی وابستگی کا اظہار ان داستانوں پر اعتراضات کا یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

ایک نقاد نے لکھا ہے: "اردو کی پرانی داستانوں میں جھوٹے واقعات اور من گھڑت قصوں کے سواد فراہم کیا ہے؟ طلسمات کے گورکھ دھندوں اور جن و پری کے ناقابلِ قبول کارناموں سے ان کا ڈھانچا تیار ہوتا ہے۔ نہ ان میں صداقت ہے نہ واقعیت" (ہماری قدیم داستانیں۔ پٹنہ یونیورسٹی جنرل دسمبر ۵۳ء)

ایسے ہی اعتراضات کا تذکرہ کرتے ہوئے خود ہی فرماتے ہیں: "میں اس وقت اسی بدذاقی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ اور صرف یہی نہیں کہ قدیم داستانوں کا نام زبان پر لاؤنگا۔ بلکہ ان کا ہمدرد اور مداح بن کر کچھ کہنے کی جرأت کرونگا۔" اس مقالے کو پڑھنے کے بعد داستان پر وارد کئے گئے مختلف اعتراضات کا نہ صرف جواب مل جاتا ہے۔ بلکہ یہ بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ داستان نہ صرف ہمارے مخصوص تہذیبی ورثہ کی یادگار ہے۔ بلکہ ادب اُردو کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اسی مقالے سے فاروقی صاحب کی حیثیت اس سرجن کی سی ہوجاتی ہے۔ جو نہ صرف مریض کی بیماری کی تشخیص کرتا ہے۔ بلکہ اپریشن سے زخم لگاکر مریض کا علاج بھی کرتا ہے۔ جب تک نقاد فن کار سے ہمدردی نہ کرے وہ اس کے فن کو سمجھ نہیں سکتا۔ داستانیں ہمارے ادب کا بہت بڑا حصہ ہیں۔ جدید ذہن نے سائنسی ایجادات کی روشنی میں ان کو رد کرنا چاہا، لیکن فاروقی صاحب نے ضیاافروز تنقید سے ادب میں ان کا مقام تسلیم کرانے کی پُرخلوص کوشش کی۔

"اردو مرثیہ" میں بھی وہ ایک مخصوص جذبے سے مرثیہ پر اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ وہ اعتراض یہ ہیں:۔

ا۔ مرثیہ محض رونا رلانا سکھاتا ہے۔ (ب) اسمیں تاریخی واقعات کو بڑی حد تک بدل دیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ "یاد رکھنا چاہئے کہ مرثیہ مجلسوں کیلئے لکھا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت کسی تاریخی کتاب کی نہیں۔ اس لئے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں کے مقصد کے لئے رنگ آمیزی اور مبالغہ ازبس ضروری ہے"۔ اسی طرح کہتے ہیں: "رلانا مرثیے کا ابتدائی درجہ ہے۔ اور یہ اس کا مقصد اعلیٰ ہیں۔ بلکہ اسکی اگلی منزل ہے بلند خیالات کو بیدار کرنا۔ اور اعلیٰ اخلاق کو ابھارنا۔" (اُردو مرثیہ مطبوعہ یونیورسٹی جنرل دسمبر ۶۲)

تنقید میں جذبہ خلوص کے ساتھ فیصلہ کو بھی بڑا دخل حاصل ہے۔ مرثیہ ہی کی بحث میں مختلف مرثیہ گو شعراء پر فاروقی صاحب نے بڑے جچے تلے الفاظ میں تنقیدی فیصلے دیئے

ہیں۔ انیس و دبیر ہی کے موازنہ ہی کو لیجیئے۔ شبلی سے لیکر ڈاکٹر احسن فاروقی اور اثر لکھنوی تک بیشتر نقادوں نے ان کے کلام میں موازنہ ہی کو ترجیح دی اور ہر ایک نے اپنے انداز سے فیصلہ بھی کیا۔ فاروقی صاحب نے یوں لکھا:-

"انیس و دبیر کا جامع فرق چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انیس کا مقصد اثر آفرینی ہوتا ہے۔ اور دبیر کا مضمون آفرینی۔ انیس کے ہاں نازک خیالی ہے۔ دبیر کے ہاں بلند خیالی۔ انیس انداز و بیان جذبات پر صرف کرتے ہیں۔ اور دبیر نکتہ آفرینی پر۔ انیس زبان و محاورے کی طرف متوجہ ہیں۔ اور دبیر شوکت الفاظ اور علمی نکات پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں" آگے چل کر لکھتے ہیں۔ مگر یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ وہ موازنہ مجموعی حیثیت سے ہے۔ ورنہ دبیر کا کتنا کلام ہے کہ انیس کے مرثیوں میں شامل کر دیا جائے تو ہرگز امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی جچے تلے فیصلے انہوں نے اُردو مثنوی کے سلسلے میں دیئے ہیں۔ خصوصاً گلزار نسیم اور سحرالبیان کا فرق بڑے اچھے انداز میں پیش کیا۔ اور دونوں مثنویوں کے خوبیوں کو اجاگر کیا۔

فاروقی صاحب کے "نصابی فیصلے" بھی ہیں، جو اکثر پڑھاتے وقت کلاس میں اپنے طلبہ کو سمجھانے کیلیئے دیتے تھے۔ مثلاً میر کے متعلق ان کے غم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے کہ زمانے نے ان کی قدر کی۔ اور ان کو خوشیاں بھی ملیں۔ لیکن وہ رنگِ طبیعت سے مجبور تھے۔ انہوں نے ہر اُس بات کو تلاش کیا جس میں حزن و یاس کا عنصر ہو سکتا۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ غالب کی زمانے والوں نے کافی قدر کی، لیکن وہ زمانے سے شاکی رہے۔ غالب کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے وہ اکثر کہتے کہ غالب محض شاعر ہے اور کچھ نہیں، غالب کے فلسفیانہ خیالات، صوفیانہ تصورات اور دیگر خصوصیات محض نقادوں کی نکتہ آفرینیاں ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی ہی بات نظیر اکبر آبادی سے متعلق کہتے کہ اسے چٹکلے باز کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نے عوام میں رہ کر دو صدی بعد کی شاعری کی۔ آج کے ادبی رجحانات اور ادبی تحریکات کے پیش نظر وہ ایک اچھا شاعر تھا۔ ایسے ہی بے شمار تنقیدی فیصلے ہیں جو اُردو ادب کے طالب علموں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اُردو مرثیہ میں آخر میں وہ یوں لکھتے ہیں: "حفیظ جالندھری کی نظم "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" شاہنامہ اسلام میں شامل ہو جانے

کے بعد اس کا ایک بلیغ حصہ بن گئی ہے۔ لیکن ابتداء میں اس کا موضوع مولانا محمد علی مرحوم کا سانحہ وفات ہے۔ اور اس لحاظ سے دیکھئے تو اس نظم کو رثائی شاعری میں ایسی منفرد حیثیت حاصل ہوتی ہے جسکی نظیر ملنی ناممکن ہے"۔

نصابی نقاد کی بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان گوشوں کو سامنے لاتا ہے، جو تشنہ ہوتے ہیں۔ اسلئے اسے تنقید اور تحقیق دونوں کا حق ادا کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ طلبہ کی واضح رہنمائی کیلئے موضوع کو الجھا کر تہذیب، دھرتی، ثنویت، اور دیگر مسائل میں نہیں الجھاتا۔ اسلئے وہ قدیم اور جدید تنقیدی خیالات میں توازن اور اعتدال بھی قائم کرتا ہے۔ فاروقی صاحب نے بیشتر مقالے تحقیقی لکھے ہیں۔ اور اس تشنگی کو دور کیا ہے۔ جو اردو ادب کا طالب علم محسوس کرتا ہے۔ ہماری قدیم داستانیں اردو مثنوی، اردو مرثیہ، اردو قصیدہ ایسے ہی موضوعات ہیں، جن پر مواد بہت کم ملتا ہے اور اگر جو مواد ہے بھی تو اتنا سطحی ہے کہ طالب علم پوری طور پر استفادہ نہیں کرسکتا۔ اردو قصیدہ بھی ان کا ایک معرکۃ الارا مضمون ہے جس میں انہوں نے قصیدہ کے فن سے بھی بحث کی ہے۔ اور ان عوامل کا جائزہ بھی لیا ہے۔ جو قصیدہ کے مقبول ہونے اور زوال پذیر ہونے میں معاون تھے۔ ساتھ ہی قصیدہ پر اعتراضات کا جواب بھی دیا۔ سودا اور ذوق کے قصائد پر وہ یوں رائے دیتے ہیں:

سودا اور ذوق اردو کے کامیاب ترین قصیدہ نگار ہیں نقادوں نے دونوں کے مقابلے میں کبھی ایک کو ترجیح دی ہے کبھی دوسرے کو۔ اس سے قطعاً انکار نہیں کہ سودا نے قصیدہ کو اس وقت علمی اور فنی رتبے تک پہنچایا جب اردو اس معاملے میں تہی مایہ تھی صنفِ قصیدہ کو مکمل کردیا کامیاب قصیدے لکھا، دوسروں کیلئے بہتر نمونے قائم کرنا۔ اس فضیلت میں سودا یقیناً منفرد اور لائق صد احترام ہے۔ لیکن ذوق کے وقت تک زبان و بیان نے نئے اسالیب پیدا کرلئے تھے۔ اور اس لحاظ سے قصیدے کا فن ذوق کے یہاں مکمل ملتا ہے"۔

اسی طرح منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغ وغیرہ کے قصائد پر انھوں نے بڑی متوازن آراء دی ہیں۔ محسن کاکوروی کے لامیہ قصیدے پر بڑی اچھی بحث کرکے انکی اعجاز بیانی کو سراہا ہے، آخر میں قصیدے کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ قصیدہ گوئی کوئی بیکار صنفِ سخن نہ تھی، بلکہ اس نے ہمارے ادب میں بہت کچھ اضافہ کیا۔

افکار علامہ اقبال پر سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ اور ہزاروں مقالات انکے

مختلف موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر فاروقی صاحب کو یہ اولیت حاصل ہے، کہ اقبال کی زندگی پر انہوں نے سب سے پہلے سیرت اقبال مرتب کی۔ سیرت اقبال کا پہلا حصہ علامہ کی زندگی اور ادبی کارناموں سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کی شاعری پیغام، اور افکار پر تبصرہ کیا گیا۔ یہ تبصرہ نہایت ہی خیال افروز ہے۔ اس میں جن موضوعات کو لیا گیا ہے۔ بعد میں ان پر اقبال شناسوں نے ضخیم کتابیں مرتب کی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ فاروقی صاحب کو اقبال سے والہانہ عقیدت تھی، لیکن اس عقیدت کا اظہار اُنہوں نے اپنے تنقیدی دلائل سے کیا۔ اور تنقید کا حق ادا کر دیا۔ نقاد جب تک فن کار کے فن سے ذہنی طور ہم آہنگ نہیں ہو جاتا۔ وہ فن کار کے اس تاثر کو پیش نہیں کر سکتا جو فن کی تخلیق کی عرق ریزی میں فن کار کے پاس تھا۔ سیرت اقبال کو اقبال پر ابتدائی کتاب سمجھ کر توجہ نہیں دی جاتی۔ لیکن اقبالیات پر تنقید کے منور گوشے اسی کتاب سے سامنے آسکتے ہیں۔ سیرت اقبال میں تنقیدی اور تحقیقی خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔ جن کا احاطہ اس مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک اچھا محقق ایک اچھا نقاد بھی ہو سکتا ہے۔ فاروقی صاحب نے یہ حق ادا کیا ہے۔ ان کے طویل غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے مرزا مظہر جان جاناں میں بھی تنقیدی شعور واضح انداز سے ملتا ہے۔

اقبال کا تصور مرد مومن، اس پر بارہا اقبال شناسوں نے مقالے لکھے ہیں۔ لیکن فاروقی صاحب نے خدا، توحید۔ بشر کی تفصیل پیش کرتے ہوئے، احادیث۔ اور آیات سے اقبال کے مرد مومن کو اسلام سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ اور اقبال کا بھی یہی منشا تھا۔ وہ اس مقالے کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"الغرض بندۂ مومن توحید کا رازدار اور متاع مصطفویؐ کا امین ہوتا ہے۔ جو احکام الٰہی اور فرامین مصطفویؐ کے اتباع کی بدولت جذبہ عشق کا حامل ہوتا ہے۔ عشق رسول صلعم جس کا رازدار اور قرآن عظیم جسکا ساز و برگ ہوتا ہے؛ اسے وہ شوکت و سطوت نصیب ہوتی ہے۔ جو اسے ساری کائنات پر تصرف اور غلبہ بخشتی ہے۔ اور وہ بطن گیتی اور سینۂ افلاک کو چیر کر ان کے اسرار سربستہ کو حل کرتا اور سلطان موجودات بن جاتا ہے۔"

فاروقی صاحب کے تنقیدی مقالات میں ان کی تنقید ان کی علمیت کے تحت آگے بڑھتی ہے۔ وہ ایک باخبر نقاد ہیں۔ اور مشرق و مغرب کے اقدار کے امتزاج سے وہ تنقید کرتے ہیں۔

سفرِ ترکی

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

انقرہ یونیورسٹی سے تقرر کا پروانہ ہمارے ترکی کے سفارت خانے کے توسط سے پشاور میں ۵ر فروری ۱۹۶۸ء کو ملا تھا۔ "پروفیسر زبان اُردو و مطالعہ پاکستان" کے عہدے پر تقرر ہوا ہے۔ یکم مارچ تک طلب کیا ہے۔

میں پشاور سے ۲۵ر فروری کی صبح ہوائی جہاز سے روانہ ہوا۔ لاہور میں ۵ گھنٹے کا وقفہ تھا۔ پروفیسر وقار عظیم صاحب کے گھر پہنچا۔ وہاں کچھ کرم فرما جمع تھے۔ ان سے نیاز حاصل کیا۔ ایک بجے شیزان میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ہمراہ کھانا کھانا تھا۔ کھانے کے بعد حمید صاحب اور وقار صاحب ڈھائی بجے مجھے ایر پورٹ پہنچانے آئے۔

شام کو سات بجے حیدر آباد پہنچا۔ یہاں دو دن قیام کیا۔ ۲۷ر کو اسی جہاز سے کراچی پہنچا۔ یہاں بھی دو دن قیام کیا۔ حیدر آباد اور کراچی میں بھی ملاقاتیں کیں۔ اور دعوتیں کھائیں۔ یکم مارچ کی صبح روانہ ہو کر براہ بیروت شام کو انقرہ پہنچا۔ اسی دن سے ملازمت محسوب کی گئی۔

انقرہ یونیورسٹی مختلف فیکلٹیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر فیکلٹی دوسری سے بہت دور ہے۔ ہماری فیکلٹی کا نام زبان، تاریخ، جغرافیہ فیکلٹی ہے۔ مگر یہاں آرٹس کے جملہ مضامین اور داخلی و خارجی السنہ کے شعبے ہیں۔ فیکلٹی ایک خود مختار ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈین فیکلٹی کا سربراہ ہے۔ سرخ فیتہ نہیں ہے۔ لکھے بغیر بھی زبانی طور پر جلد کام انجام پاتے ہیں۔

یہاں کا نظامِ تعلیم یہ ہے کہ سات سال کی عمر میں بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے۔ تعلیم آغاز سے انجام تک مفت ہے۔ پرائمری تک لازمی ہے۔ اسکول کو لیسہ کہتے ہیں۔ اس کی مدت گیارہ سال ہے۔ لیسہ کے آخری برسوں میں (گویا میٹرک میں) طالب علم چودہ مضامین پڑھتا ہے۔ جن میں آرٹس سائنس سب کچھ ہے۔ کامیاب طلبہ تین درجات میں کامیاب قرار دئے جاتے ہیں بہت عمدہ، عمدہ اور اوسط۔ لیسہ سے پاس ہو کر فیکلٹی میں آتے ہیں۔

یہاں چار سال تعلیم حاصل کرتے ہیں اور سند پاتے ہیں۔ یہ سند لیسانس کہلاتی ہے۔ (لسانس کے معنی محض سند یا ڈپلوما کے ہیں۔ یہ لفظ بی اے کے مترادف ہے بھی اور نہیں بھی ہے) اس کے بعد ایم اے قسم کی تعلیم نہیں ہے۔ بس ڈاکٹریٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جس کی کم از کم مدت دو سال ہے مگر عموماً تین سے پانچ سال تک وقت صرف ہوتا ہے۔ یہاں تعلیم یافتہ اشخاص کا اوسط چالیس فی صد بتایا گیا۔

فیکلٹی کی تعلیم بی اے اور بی اے آنرز کی درمیانی شکل ہے۔ یعنی ایک مضمون خاص لینا ہوتا ہے۔ (جیسے بی اے آنرز میں میجر سبجکٹ ہوتا ہے۔) اس کے ذیل میں تین چار موضوعات یا مضامین ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور مضمون لینے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک (یا دو) خارجی زبان بھی ہوتی ہے۔ ان کے ماسوا تاریخ ترکیہ کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے۔

ہر شعبہ خود مختار ہے۔ ڈاکٹر کوئی من نے اس خود مختاری کی دلچسپ تشریح کی کہ انقرہ یونیورسٹی میں ہر فیکلٹی خود مختار ہے۔ ہر فیکلٹی میں ہر شعبہ خود مختار ہے۔ ہر شعبہ میں ہر صدر شعبہ خود مختار ہے۔ بایں معنی کہ اوقات ونظام درس، امتحانات، پرچے حاضری تحریری یا زبانی امتحان وغیرہ سب کا انتظام صدر شعبہ خود کرتا ہے۔ فیکلٹی کے دفتر کو صرف نتیجہ سے غرض ہے۔ ہر سیمسٹر کا الگ امتحان ہوتا ہے۔ پہلا سیمسٹر اکتوبر سے جنوری تک (فروری کی تعطیل) اور دوسرا سیمسٹر مارچ سے مئی تک ہوتا ہے۔ جون میں گویا سالانہ امتحان ہوتا ہے۔ تاریخ کا تعین صدر شعبہ کی رائے پر ہوتا ہے۔ امتحانات کی تاریخیں "پروفیسروں کی کونسل" مقرر کر دیتی ہے۔ مگر ہر صدر شعبہ ان کو آگے پیچھے کر سکتا ہے۔

امتحان میں کامیاب ہونے کیلئے کم از کم پچاس فی صد نمبر لانے ضروری ہیں۔ نمبر دس میں سے دئے جاتے ہیں۔ نو اور دس فرسٹ ڈویژن۔ سات اور آٹھ سیکنڈ ڈویژن پانچ اور چھ تھرڈ ڈویژن۔ مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی بالکل امریکن طرز پر ہے۔ وہاں کامیابی کے لئے ساٹھ فیصد نمبر لانا ضروری ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ترکی کی باقی یونیورسٹیوں میں وہی قاعدہ ہے جو انقرہ یونیورسٹی میں ہے حاجی تیپے یونیورسٹی انقرہ میں تیسری یونیورسٹی ہے۔ اول یہ بچوں کے اسپتال کے طور پر قائم ہوئی تھی، پھر میڈیکل کالج بنا۔ اس کے بعد دوسرے شعبے اور فیکلٹیاں کھل گئیں۔ اب مستقل یونیورسٹی ہے اور دوسرے جامعات کی طرح خود مختار ادارہ۔

ہماری فیکلٹی میں آٹھ ہزار کے لگ بھگ طالب علم ہیں۔ دن کے علاوہ رات کو بھی باقاعدہ ساری فیکلٹی میں کام ہوتا ہے۔ رات کی کلاسیں ملازمت پیشہ افراد کے لئے ہیں۔ عموماً حاضری بہت اچھی ہوتی ہے۔ طلبہ بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور پابندی سے حاضر رہتے ہیں۔ معیار بھی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ طلبہ ہوش گوش رکھتے ہیں۔ اور عام معلومات بھی ہمارے یہاں سے بہتر ہیں۔ تعلیم ابتدا ہی سے مخلوط ہے۔ فیکلٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب پانچ اور تین کا ہے۔ یعنی لڑکے زیادہ ہیں۔ اسکرٹ تو تقریباً سو فیصد استعمال ہوتا ہی ہے۔ ویسے بھی کامل آزادی ہے۔ سگرٹ بھی لڑکیاں اکثر پیتی ہیں۔ بلکہ ادھیڑ اور عمر رسیدہ عورتوں کو بھی سگرٹ پیتے دیکھا۔ لڑکیاں بال کٹی ہوتی ہیں۔ مگر اب شاید لمبے بالوں کا رواج بڑھ رہا ہے۔ مردوں کا نائی Berber کہلاتا ہے۔ اور عورتوں کا نائی Kuafor ۔ نائی مرد عورت سب کے لئے گراں ہے۔ مگر Berber کے مقابلہ میں Kuafor کی اجرت کہیں زیادہ ہے۔ سر میں تیل ڈالنے کا رواج اس حد تک مفقود ہے کہ سر کا تیل کہیں نہیں ملتا۔ کریم بھی نہیں ملتی۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے استنبول میں ایک ٹیوب کریم کا ملا۔ ترکی ہی کی بنی ہوئی ہے مگر بہت معمولی۔ دانتوں کی صفائی اس درجے پر نہیں جیسی ہونی چاہیئے۔ صرف پیسٹ دانتوں کی صفائی کیلئے ملتا ہے۔ منجن قسم کا سفوف کہیں نظر نہیں آیا۔ اسی طرح After Shave Lotion بھی کسی طرح نہ ملا۔ کئی ہفتے کے بعد آخر نائی سے رجوع کیا۔ تو اُس نے پھٹکری کی ٹکیہ لاکر دی۔ میرا ترک اسسٹنٹ جو لاہور میں پانچ سال رہ چکا ہے اور وہاں سے عربی اور اسلامیات میں ایم اے کر کے آیا ہے، میرا مددگار اور رہنما رہتا ہے۔ اردو اور انگریزی اسے کام چلاؤ آتی ہے۔ وہ کسی طرح پھٹکری کا مترادف ترکی لفظ نہ بتا سکا تھا اب نائی نے بتایا کہ اسے شپ (Sep) کہتے ہیں۔

کلاس پڑھانے میں اسسٹنٹ سے بہت مدد ملتی ہے۔ پہلا سیمسٹر طلبہ کا یونہی گذرا۔ پڑھانے والا ہی نہ تھا۔ اس دوسرے سیمسٹر میں دونوں سیمسٹروں کا کام کرنا ہے۔ اکثر طلبہ نے دوسرے مضامین انگریزی اور فارسی لے رکھے ہیں۔ مگر ابھی انہیں انگریزی، فارسی یا اُردو کام چلاؤ حد تک نہیں آتی۔ اس لئے ترکی کا توسل ہے۔ میرے مترجم کا کام میرا اسسٹنٹ (جناب شوکت بوِلو) کرتا ہے۔

ہماری فیکلٹی میں داخل ہوتے ہی کھلی جگہ ہے۔ وہاں سامنے ایک بڑا بلیک بورڈ رکھا ہے جس کے دو پرت ہیں۔ اس پر کھیل کے یا دوسرے ضروری اعلانات چاک سے جلی حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ روزانہ اعلان بدلتے رہتے ہیں۔ امتحانات کی بابت ضروری اعلان لگا تو کئی ہفتے نہ ہٹایا گیا۔ ویسے نوٹس بورڈ بھی ہیں اور ان پر ٹائپ کردہ اعلانات چسپاں ہوتے ہیں۔ ہاتھ سے پوسٹر لکھ کر جا بجا لگانے کی رسم بھی کافی ہے۔

انقرہ اچھا بڑا شہر ہے۔ بڑی رونق اور ہجوم سڑکیں کشادہ۔ ٹریفک کنٹرول کے لیے سپاہی ہوتا ہے۔ غریب ذرا سی دیر میں تھک جاتا ہوگا۔ صرف ایک جگہ روشنی کا کنٹرول نظر آیا اس کے مقابلے میں استانبول میں کئی بڑے چوراہوں پر روشنی کا کنٹرول نظر آیا لیکن وہاں بھی اکثر مقامات پر سپاہی ہی کنٹرول کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ترکی میں بہت زیادہ ٹریفک کے حادثات ہوتے ہیں۔ اور بہت سی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ مجھے اتفاق نہیں۔ لوگ بڑی بے جگری سے سڑک عبور کرتے ہیں۔ مگر میں نے اپنے قیام ترکی میں ایک بھی ٹکراتے اور زخمی ہوتے نہیں دیکھا

فوجی تربیت سارے ترکوں کیلئے لازم ہے۔ بیس سال کی عمر کو پہنچتے ہیں تو دو سال فوجی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ جائز عذر پر تین سال تک ٹال سکتے ہیں لیکن پچیس سال کی عمر سے قبل پوری کرنی ضروری ہے۔ طلبہ یا مدرسین کیلئے ۲۹ سال کی عمر تک پوری کرنی لازم ہے۔ یعنی وہ سات سال ٹال سکتے ہیں۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ عموماً مستعد اور تندرست اور قوی ہیکل نظر آتے ہیں۔ ویسے بھی آب و ہوا صحت بخش ہے۔

مارچ کا پورا مہینہ خوب ٹھنڈا تھا۔ اندر سب جگہ سنٹرل ہیٹنگ ہے۔ کمروں غسلخانوں برآمدوں دکانوں غرض سب جگہ۔ اسلئے اندر تو سردی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ عیدالاضحیٰ کے دو دن بعد ۱۲ مارچ کی رات سے ۱۳ مارچ کی دوپہر تک بارش کے ساتھ برفباری بھی ہوئی اور ٹمپریچر نقطہ انجماد سے آٹھ ڈگری نیچے گر گیا۔ ہلکی بارش اور اسکے ساتھ ہلکی برف پڑے تو اسے ترکی زبان میں SULU SEPKEN کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا مترادف کیوں ہو۔ جہاں برف پڑتی ہے وہاں کوئی مترادف لفظ ہو سکتا ہے۔ میں نے شروع ہی سے کمرے کا ہیٹنگ بند کر رکھا تھا اسے ان دنوں میں بھی کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ باہر نکلنے پر

البتہ سردی لگتی ہے۔ شدید سردی اور اس کے ساتھ اکثر دھیمی اور کبھی تیز ہوا جو کپڑوں کے اندر، نہیں جسم کے اندر گھستی محسوس ہوتی ہے۔ قراقلی ٹوپی نے ان دنوں میں خاص طور پر آرام دیا۔ جاڑوں کے موسم میں کیا ہوگا۔ وقت آنے پر پتہ چلے گا۔ اسلئے کہ نومبر تا فروری اتنی شدید سردی ہوتی ہے کہ نقطۂ انجماد سے نہیں صفر سے نیچے گنتی گننی پڑتی ہے۔ ۲۵-۳۰ ڈگری صفر سے نیچے درجہ حرارت ہوتا ہے اور برف ہی برف ہوتی ہے ۱۹۶۹ء کا مارچ کا مہینہ گزشتہ سال کے مقابلہ میں بہت معتدل سردی کا رہا۔ مگر اب کے اپریل سالِ گذشتہ کے اپریل سے بدرجہا سرد تھا۔ تھوڑی تھوڑی برف بھی پڑی۔

انقرہ اور اسی طرح استانبول میں قدیم و جدید آبادیاں بالکل دست و گریباں ہیں۔ قدیم حصے بھی اب نئے ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن غریب افراد کے مکانات اور آبادیاں اب بھی نمایاں ہیں۔ ان میں بھی اب سنٹرل ہیٹنگ بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن چند فی صد مکانات ابھی بغیر ہیٹنگ کے ہیں یہ لوگ کوئلہ جیسے اسٹوپ استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی مکان بوسیدہ ہو جائے یا ناقابلِ رہائش ہو جائے تو اسے پھر اسی طرح نہیں بنا سکتے۔ بلدیہ نے مختلف قسم کے نقشے منظور کر رکھے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نقشے کے مطابق مکان نیا بنانا ضروری ہے۔ اس طرح بتدریج سارا شہر نیا ہو جائے گا۔

یہاں کی مسجدیں دیکھے بغیر سمجھنی مشکل ہیں۔ پرانی اور چھوٹی مسجدیں بس ایک مکان نظر آتی ہیں۔ ایک کونے پر اونچا سا مینار ہوتا ہے۔ اس سے امتیاز ہو جاتا ہے۔ مسجدیں بڑی ہوں یا چھوٹی اندر سے سادہ مگر خوبصورت ہیں۔ قالینوں کے فرش اور جابجا خط نسخ میں کتبے لٹکے ہوئے ساری مسجد مسقف ہوتی ہے صحن کا کہیں نام نہیں۔ سرد اور برف باری کے مقامات جو ہوئے۔ جن حصوں میں گرمی ہوتی ہے۔ وہاں کی مساجد بھی رسم و روایت کی بدولت غالباً بغیر صحن کے ہیں۔

اذان نماز سب عربی میں ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ۴۵ سال قبل حصولِ آزادی کے بعد اذان ترکی زبان میں ہونے لگی تھی۔ لیکن نماز اس وقت بھی عربی میں ہوتی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں جب عدنان مندریس برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے اذان دوبارہ عربی میں میں جاری کی۔ ان کے وقت سے مساجد ہی رونق زینت اور آبادی بھی اضافہ ہوا۔ پنج وقتہ جماعت میں اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ اور جمعہ کی نمازیں میں تو عموماً سڑکوں پر صفیں آجاتی ہیں۔ بغیر ٹوپی کے نماز عام طور پر پڑھی جاتی ہے لیکن مساجد میں

ساتھ ستر فیصد لوگ ٹوپی کے ساتھ نماز پڑھتے نظر آتے ہیں۔ مساجد کے علاوہ خط نسخ میں آیات یا مبارک دعائیں اکثر دوکانوں میں فریموں میں آویزاں نظر آئیں۔ ترکی زبان میں ہزاروں الفاظ عربی کے اب بھی موجود ہیں۔ تلفظ میں البتہ فرق ہے۔ خاص طور پر اسکے کہ زیر کے لئے E استعمال ہوتی ہے۔ اس استعمال نے آواز کے املے میں اور اضافہ کردیا ہے۔ انقرہ میں کم اور استانبول میں زیادہ میلاد شریف کی محفلوں کا بہت رواج ہے۔ گھروں میں بھی ہوتی ہیں، مگر زیادہ تر مساجد میں منعقد کی جاتی ہیں۔ اخباروں میں باقاعدہ اعلان کرکے دعوت دی جاتی ہے۔ استانبول میں روزانہ چند در چند محفلوں کی دعوت اخبار میں ملے گی۔ مجھے موقعہ نہ ملا جو دیکھتا کہ کیسی ہوتی ہیں۔ چھوٹی مسجدوں میں بھی سارا فرش قالینوں کا ہے۔ جملہ مساجد سرکاری اوقاف کے محکمے کی نگرانی میں ہیں لیکن لوگ بھی قالین نذر کرتے رہتے ہیں۔ چھوٹی مسجدوں میں بھی خطیب کے لئے بہت اونچا منبر ہوتا ہے۔ نیز خطیب کے وعظ کے لئے علیحدہ بلند جگہ (بلکہ لکڑی کا چھوٹا سا اسٹیج) اسی طرح بڑی مساجد کی تقلید میں کھلے حصے میں ایک طرف یا دونوں طرف چھوٹے دالان بنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح دونوں بازدوں میں لکڑی کے ستونوں پر لکڑی ہی کے بالاخانے ہوتے ہیں۔ مساجد میں اللہ، محمد، کلمہ طیبہ ہوتا ہے۔ بعض آیات بھی لکھی ہوئی یا فریم کی ہوئی ملتی ہیں۔ محراب کے ہر دو طرف اللہ، محمد اور کونوں پر چاروں طرف چاروں خلفائے عظامؓ کے نام اور پشت کی طرف حسنؓ حسینؓ لکھا ہوتا ہے۔

رمضان میں روزے رکھنے کی رسم عام ہے۔ فیکلٹی کے اوقات یہی رہتے ہیں۔ افطار کے وقت طلبہ دس پندرہ منٹ کا وقفہ کرلیتے ہیں۔ اور افطار کرکے پھر کلاس میں آجاتے ہیں۔ مجالس وعظ و ذکر محفل سماع، مجلس عزا اور اس طرح کے دوسرے دینی اجتماع قانوناً ممنوع و مسدود ہیں۔ حضرت مولانا رومؒ کے مزار شریف پر سالانہ عرس کے موقع پر ایک ہفتہ تک فرقہ مولویہ والوں کو محفلیں منعقد کرنے کی خصوصی اجازت ہے۔ ان کی خصوصی محفل جس میں نے نوازی ہوتی ہے "رقص مولویہ" کے لئے منعقد ہوتی ہے۔ اب صرف نمائش جانئے، سماع کہاں؟

اذان جلد اول وقت دینے کا رواج ہے اور نماز بھی اذان کے بعد جلد

ہی پڑھ لیتے ہیں۔ یہاں ۸ رجون کو ۱۲ ربیع الاول شریف ہے۔ استانبول میں تو گذشتہ شب میلاد شریف بڑی کثرت سے اور ہر مسجد میں ہوئے ہوں گے۔ یہاں انقرہ میں سنا کہ حاجی بیرامؒ کی مسجد میں میلاد شریف ہوتا ہے۔ چنانچہ ۷ رجون کو مغرب کی نماز جامع حاجی بیرام میں پڑھی۔ نمازیوں کی بڑی تعداد تھی۔ نماز سے گھنٹہ پون گھنٹہ بعد تقریر شروع ہوئی۔ اس کے اختتام پر قیام کے مختصر سلام ہوگا۔ پھر عشاء کی نماز۔ اس کے بعد پھر ایک اور تقریر۔ چونکہ سب کارروائی ترکی میں تھی۔ اسلئے میں تو ذرا دیر کی شرکت کے بعد چلا آیا۔

حاجی بیرامؒ سترھویں صدی عیسوی کے ایک بڑے بزرگ ہیں۔ یہ محلہ بھی انہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح اور بہت سے گرجا توڑ کر مسجد بنائے گئے تھے۔ اسی طرح یہ مسجد بھی گرجا کی بجائے بنائی گئی ہے۔ باہر مزار مبارک ہے۔ جو یہاں کے دستور کے مطابق (دفاتر کے اوقات کی طرح) ۹ بجے سے ۵ بجے تک کھلتا ہے۔ جس طرح استانبول میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار مبارک کے دائیں پہلو پر ایک دریچہ تھا۔ اسی طرح یہاں بھی سرہانے ایک کھڑکی ہے۔ تاکہ فاتحہ کے وقت یہاں سے مزار شریف کو دیکھا جا سکے۔

مزار کے قریب ہی گرجا کی دیوار اور بڑا پھاٹک ہے جو بطور یادگار کے باقی ہے۔ خوش عقیدہ لوگوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ جب حضرت حاجی بیرامؒ نے گرجا کو مسجد میں تبدیل کیا تو سمت قبلہ درست کرنے کیلئے ساری عمارت کا رخ ہی بدل دیا۔ مسجد کے دروازے سے داخل ہوں تو ایا صوفیا کی طرح اول ایک گیلری پڑتی ہے۔ اس میں سے دروازے میں ہو کر اندر آئیے تو مسجد کی اصل عمارت ہے۔ یہ انداز مساجد میں نظر نہ آیا۔ بلکہ خاص گرجا کا انداز ہے۔ اس مسجد میں بھی تمام و کمال قالین کا فرش ہے۔ اس مغرب کی نماز میں جو میں نے یہاں پڑھی تقریباً اسی فیصد لوگ ٹوپی پہنکر نماز پڑھ رہے تھے۔ اور ان میں ہر عمر کے اور ہر طبقے کے لوگ نظر آتے تھے۔ البتہ زیادہ تعداد غرباء ہی کی تھی۔ وہ جو مغرب زدہ طبقہ ہے اسے کسی بھی اسلامی ملک میں ایسی باتوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ اِس بارے میں ترکی کا بھی استثنا نہیں ہے۔ بس سب ممالک میں فرق

کی مشتی کا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اور تو اور اب تو سعودی عرب بھی اسی راستے پر چل رہا
ہے۔ وہاں برقع لازم ہے مگر جب اترے گا تو اسکرٹ نظر آئے گا۔ یہودیوں اور
عیسائیوں نے ذہنی طور پر قلب ماہیت کی جو علمی اور ثقافتی جنگ جاری کر رکھی ہے
یہ سب اسی کے کرشمے ہیں اور قرونِ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کے مقابلے میں ازحد خطرناک
اور دہشت ناک حد تک مؤثر۔ مذہبی خیالات میں آزادی، عبادات و اطاعات میں بے پروائی
اور اجتناب، شراب، جوئے، عریانی و فحاشی کی عمومیت، تہذیب جدید کے یہ انعامات
ہیں جو بڑی کثرت سے اسلامی ممالک میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ ان سب کے پشت یہودیوں
اور عیسائیوں کی شرکت، دولت اور کوشش ہے۔ علمی ترقی، سائنسی ترقی، صنعتی ترقی سب
کی بنیادوں میں مغرب کا یہ سنہرا روپہلا سموم "دینی جہاد" پھیلا ہوا ہے۔ اور افسوس
ہے کہ انہوں نے ذہنی طور پر سب ممالک کو ایسا مفلوج کر رکھا ہے کہ سوچنے کی صلاحیت
ہی غائب ہو گئی ہے۔

جمعہ ۱۴؍جون کی نماز کیلئے جامع حاجی بیرامؒ گیا۔ یہ تو معلوم تھا کہ ظہر یا جمعہ
کی نماز کی اذان بارہ بجے ہوتی ہے یہ نہیں معلوم تھا کہ کتنے قبل جانا ضروری ہے،
تاکہ اندر جگہ مل جائے۔ میں کوئی سوا گیارہ بجے پہنچا۔ مسجد بھر چکی تھی۔ باہر لوگ بیٹھے
تھے۔ خیر میں اندر گھس گیا اور جگہ بھی مل گئی۔ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جوتوں کے رکھنے کی جگہ ہوتی ہے
وہ بھر چکی تھی۔ وہیں باہر جوتے رکھ دئے۔ بعد میں جب واپسی کا وقت ہوا تو جوتے والے
نے کہا کہ باہر کے سب جوتے اندر ڈھیر کر دئے ہیں ڈھونڈ لیجیے۔ چنانچہ مل گئے۔

نماز سے اول جو وعظ کا رواج پاکستان میں ہے یہاں بھی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ بلکہ
دو گھنٹہ قبل شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سوا بارہ بجے تک وعظ جاری رہا۔ بارہ بجکر
بیس منٹ پر خطبے کی اذان ہوئی۔ خطبہ بھی ہماری طرح کا تھا۔ یعنی پہلے حصے میں آیات
کے بعد ترجمہ مع تشریح کیا گیا۔ دوسرا حصہ سب عربی میں تھا۔ نماز کے بعد مسجد سے نکلے تو
معلوم ہوا کہ بڑا اجتماع تھا۔ سڑکوں تک پر صفیں تھیں۔ احاطے کے باہر پولیس کے کئی دستے
اور بینڈ تھے۔ مزارات پر چڑھانے والے گنٹھے ایک سڑک پر بار تھے۔ میری تو سمجھ میں نہ
آیا کہ یہ کیا ہے۔ بعد کو پتہ چلا کہ جامع حاجی بیرامؒ میں ہر جمعہ کو یہی کیفیت ہوتی ہے،
کہ پندرہ بیس جنازے جمع ہو جاتے ہیں۔ نمازِ جنازہ کے بعد ان کو دفن کرنے کیلئے لیجاتے

ہیں۔ بتایا گیا کہ باہر عورتوں کے بڑے ہجوم کا بھی یہی سبب تھا، کہ وہ اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے جنازے کے ساتھ آئی تھیں کوئی پولس افسر ہوں گے اس لئے بینڈ اور پولس دستے بھی تھے تاکہ ان کو پورے پولس اعزاز کے ساتھ لے جایا جائے۔

کچھ دوستوں نے بتایا کہ روزانہ سب نمازوں سے زیادہ عشاء کی جماعت میں ہجوم ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تراویح کی نماز میں بہت زیادہ مجمع ہوتا ہے۔ روزہ رکھنے کا رواج بہت زیادہ ہے۔ ایک پاکستانی دوست نے جو تین چار سال سے انقرہ میں ہیں بتایا کہ رمضان میں روزے رکھنے کا رواج واقعی خوب ہے۔ اولوس کا علاقہ بڑا تجارتی مرکز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم شام کو خریداری کے لئے جاتے تھے تو احتیاطاً افطار کا کچھ سامان جیب میں رکھ لیتے تھے۔ اولوس میں اکثر مغرب کی اذان ہوگئی تو ہم نے بہت سی دوکانوں میں دیکھا کہ سب دوکان والے خریداروں کو چھوڑ چھاڑ ایک طرف ہو بیٹھے اور سب نے ایک ہی برتن میں سے افطاری کھائی۔ بکری کا بھی خیال نہ کیا۔ اس علاقے میں بڑی دوکانیں اور اوسط درجے کے یا بڑے سوداگر ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر طبقات میں روزے کا رواج ہے۔ شکر ہے۔

سگرٹ کا رواج کافی ہے عورتیں اور لڑکیاں بھی خوب پیتی ہیں۔ کم عمر لڑکے بھی سگرٹ پیتے نظر آئے۔ ہمارے ملک سے یقیناً زیادہ ہے۔

اپریل کا مہینہ آیا تو گھروں میں، دوکانوں میں اور ہوٹلوں میں کامل صفائی ہوتی دکھائی دی۔ یہ سلسلہ مئی تک جاری رہا۔ ترک دوستوں نے بتایا کہ سال میں دو بار صفائی کی رسم ہے۔ اپریل میں اور پھر اکتوبر میں۔ دفاتر اور اسکول کالج یونیورسٹی میں بھی صفائی ہوتی دیکھی۔ جہاں ضرورت ہوئی وہاں قلعی بھی ہوئی۔ اور فرنیچر وغیرہ پر رنگ کا ہاتھ بھی پھیرا گیا۔

یہاں کا انتخابی قانون بہت دلچسپ ہے۔ منتخب ہونے کیلئے کم از کم چالیس ہزار ووٹ حاصل ہونے چاہئیں۔ سارے ملک کے ووٹ جمع کر لئے جاتے ہیں۔ جس شہر اور علاقے میں جتنی نشستیں ہیں۔ وہ حاصل کردہ ووٹوں کے لحاظ سے (فی نشست چالیس ہزار) شمار کی جائیں گی اور ہر پارٹی کو اتنی ہی نشستیں مل جائیں۔ اگر اس پارٹی کے حاصل کردہ ووٹ کسی جگہ زیادہ ہیں۔ تو وہ زائد

ووٹ منسوخ نہوں گے۔ بلکہ ان کو اس دوسرے علاقے میں کام میں لایا جائے گا جہاں اس پارٹی کو کم ووٹ ملے ہیں اور اس علاقے کی نشستیں دوسری جگہ سے مستعار ووٹوں کے لحاظ سے پُر کی جائیں گی۔ اسی اپریل میں موجودہ حکومت نے کم زیادہ ووٹوں کے اس لین دین کی شق میں ترمیم کر دی تھی۔ حزب اختلاف نے پارلیمنٹ کی سب کمیٹی سے بھی تعاون نہیں کیا تھا اور پارلیمنٹ میں جب یہ ترمیمی بل پیش ہوا تب بھی شرکت نہیں کی تھی۔ ایک آئینی Constitutional court ہے جس میں پارلیمنٹ میں منظور شدہ ترمیمات کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس انتخابی اصلاح و ترمیم کے خلاف حزب اختلاف نے اس عدالت سے رجوع کیا۔ معلوم ہوا عدالت نے پارلیمنٹ کی منظور کی ہوئی ترمیم کو رد کر دیا۔ اور اصل قانون کو برقرار رکھا۔

گوشت کھانے کا بیحد رواج ہے۔ ہر طرح کے گوشت کو کباب کہتے ہیں۔ مرغی اور مچھلی بھی عام ملتی ہے۔ مگر بکری یا گائے کا گوشت اس سے زیادہ مروج ہے۔ پنیر بھی بہت عام ہے۔ کئی قسم کا ملتا ہے۔ لسی اور دہی کا استعمال بھی بہت ہے۔ لسی بوتلوں میں بند ہوتی ہے۔ دہی ایلومینیم کی قلفیوں میں ملتا ہے۔ اپنا برتن لیجانے کی ضرورت نہیں اگر برتن واپس کر دیجیے تو اس کی قیمت نہ لیں گے۔ اسی طرح دودھ کی بوتلیں ملتی ہیں۔

چائے بغیر دودھ کے فنجانوں میں پیتے ہیں۔ بڑے ہوٹلوں کو چھوڑ کر چینک کا رواج نہیں۔ شکر کی ٹکیاں (کیوب) فنجان کے ساتھ طشتری میں ہوں گی۔ جی چاہے ڈال لیجیے کافی کو قہوہ کہتے ہیں۔ آپ کہہ دینگے تو اس میں شکر ملائیں گے ورنہ تلخ۔ کافی اور چائے خاص ذائقے کی ہوتی ہے۔ عام مزے سے مختلف۔ اس لیے جب تک عادت نہ ہو ترکی کافی اور ترکی چائے بری لگتی ہے۔ میں نے تو یہ سوچ کہ ہر جگہ یہی ملیگی شروع سے عادت ڈالنے کی نیت کی چنانچہ کچھ عرصہ بعد اچھی لگنے لگی۔ کافی (قہوہ) عرب ممالک سے کم گاڑھی اور کم تلخ ہے لیکن مغربی کافی کے مقابلہ میں زیادہ تلخ ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ چائے قہوے کی دوکان کو قرأت خانہ کہتے ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ پرانے زمانے میں انہی دوکانوں میں کتابیں ہوتی تھیں یہیں بیٹھکر پڑھتے تھے۔ اور حسب ضرورت تھوڑی تھوڑی دیر میں چائے

یا قہوے کا شغل بھی کرتے رہتے تھے۔ کتابیں تو چھپ کر عام ہوگئیں اس لئے قہوہ خانے میں نہ رہیں۔ مگر نام اب بھی باقی ہے۔ بلکہ یہاں اب تاش۔ نرد شطرنج وغیرہ آگیا۔ کافی وسیع قہوہ خانے یا قرأت خانے ہوتے ہیں اور لوگ ان کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عوام اور اوسط طبقے کے کلب اب بھی یہی ہیں۔

سنیما بہت کم ہیں۔ خیال ہوسکتا ہے کہ ان کے بجائے تھیٹر اور اوپیرا زیادہ ہونگے مگر وہ بھی زیادہ نہیں ہیں۔ سنیما، تھیٹر، اوپیرا کا شوق کافی ہے مگر نہ اتنا جتنا ہمارے ہاں ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ ان کا ایک اور بدل بھی یہاں ہے یعنی نائٹ کلب۔ بالائی، متوسط طبقہ یا پیسے والے لوگ نائٹ کلب میں جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

عام طور پر بازاروں اور سڑکوں پر بھی وہ شور نہیں پایا جو ہمارے ملک میں ہے۔ پھیری والے یا منڈی کے دکاندار آوازیں لگاتے ہیں مگر نہ اس طرح کہ آپ کے لئے گذرنا مشکل ہوجائے۔ فیکلٹی اور اسکولوں میں بھی طلبہ کا شور بہت کم ہے۔ بہت آہستہ بولتے ہیں۔ اتنی آہستہ آواز سے کہ مجھ جیسے کو تو سمجھنا بھی مشکل ہوجائے۔ ہمارے ملک جیسا زور سے بولنے کا رواج کہیں نظر نہ آیا۔ بعض دفاتر اور بینک جانا ہوا۔ بات کرنے کے لئے میرے اسسٹنٹ ہمراہ تھے اس لئے میری ترجمانی تو وہ کرتے رہے۔ لیکن پولس کے دفتر والے بھی اتنی آہستہ آواز میں بات کررہے تھے۔ کہ حیرت ہوئی۔ معلوم ہوا آہستہ آواز میں بولنا قومی شعار کا درجہ رکھتا ہے۔

بینکوں کا وقت بھی وہی ہے جو دفاتر کا ہے۔ یعنی ۹ سے ۵ تک۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بینکوں کی بڑی شاخیں اس پورے وقت میں گاہکوں کے کاروبار کے لئے کھلی رہتی ہیں۔ بلکہ دفاتر میں درمیان میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ کھانا کھانے کے لئے ہوتا ہے۔ بڑے بینکوں میں وہ بھی نہیں۔ میں نے اِش بینک میں حساب کھولا ہے۔ یہ بینک ہمارے نیشنل بنک کے قائم مقام بتایا گیا۔ اسٹاف کافی نظر آیا۔ سامنے ہی پانچ سات لڑکیاں بیٹھی رہتی ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ آپ کاؤنٹر پر گئے۔ اپنی ضرورت بتائی انہوں نے سب کاغذات پر کئے۔ آپ کو صرف دستخط کرنے ہوتے ہیں۔ پھر کاغذ اپنے راستے ہوتا ہوا آخری منزل پر آگیا۔ چند منٹ میں کام ختم۔

بڑا ڈاکخانہ صبح ۹ بجے سے جو کھلتا ہے تو رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔

تار گھر اور پبلک ٹیلیفون بھی یہاں ڈاکخانے کے ساتھ ہی ہے۔

دوکانوں میں رات کو روشنی جلتی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور چونکہ بیرونی دیوار عام طور پر شیشے کی ہوتی ہے اس لئے اندر کی ہر چیز صاف نظر آتی رہتی ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ دوکان کھلی ہے۔ یہاں رات کی چوری چکاری کی محافظت کا انتظام عمدہ ہے یعنی ہر علاقے اور محلے میں چوکیدار (بیکچی) مقرر ہوتے ہیں جو رات بھر جاگتے اور گشت کرتے ہیں۔ اگر کہیں چوری ہو جائے تو سب سے پہلے ان کی گرفت ہوتی ہے۔ پہلے اہل محلہ یا دوکان دار ان کی اجرت دیا کرتے تھے۔ اب ان کو بلدیہ باقاعدہ تنخواہ دیتی ہے۔

حیدر آباد دکن کی یہ رسم جسے معلوم نہوتی تھی وہ بہت الجھتا تھا۔ وہاں "ہاں" اور "نہیں" کے گردن کے اشارے ہمارے اشاروں کے بالکل برعکس ہوتے تھے۔ یعنی "ہاں" کے لئے سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے تھے، اور "نہیں" کے لئے سر کو اوپر نیچے ہلاتے تھے۔ ترکی کا "نہیں" کا اشارہ بھی ہمارے لئے بالکل اجنبی بلکہ دھوکا دینے والا ہے۔ مگر باوجود بتانے کے جب تک کئی دفعہ میں نے خود نہ دیکھا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جب "نہیں" کا اشارہ کرنا ہوتا ہے تو بس سر کو تھوڑی سے اوپر اٹھا دیتے ہیں۔ یہ "نہیں" ہوا۔ لطف جب آیا جب مجھے خود کئی بار دھوکا ہو چکا بلکہ سر کی اس حرکت کے بجائے صرف ابرو اور آنکھ کا اشارہ کافی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ زبان سے چ چ کی آواز بھی نکالتے ہیں۔

سارے ترکی کا حال تو معلوم نہیں لیکن انقرہ میں خصوصاً اور استانبول میں بھی نل کا پانی پینے کے قابل نہیں سمجھتے۔ اس میں چونا اتنا زیادہ ہے کہ گلاس سفید ہو جاتا ہے۔ اس لئے عام رسم یہ ہے کہ چشمہ کا پانی بوتلوں میں بند ملتا ہے اسی کو پیتے ہیں۔ یہ مستقل ایک صنعت ہے۔ شیشے کی مٹکے جیسی بڑی بوتلیں (قرنبیق) پانی سے بھری ہوئی بکتی ہیں۔ انہی میں سے یہ چھوٹی بوتلیں بھر کر استعمال اور فروخت ہوتی ہیں۔

ملاقات کے وقت عرب ممالک کی طرح یہاں گال پر بوسہ دیتے ہیں۔ اگر بڑا ہوگا تو وہ چھوٹے کے دونوں گالوں پر باری باری بوسہ دیگا۔ اگر برابر

کے ہوں گے، تو ایک ایک گال پر بوسہ دے گا، پھر دوسرا دوسرے گال پر بوسہ دے گا. مرد عورت باہم ایسا نہیں کرتے لیکن مرد مرد کے ساتھ اور عورت عورت کے ساتھ یہ عمل کرتی ہے. عموماً ایسا مخلص، بے تکلف اور صمیمی تعلقات میں ہوتا ہے. یا اظہار خصوصیت کے لئے جیسے میرے ساتھ دو ایک بزرگوں نے کیا.

یہاں ۲۳ر اپریل کو بچوں کا تہوار "چلڈ بیرام" بڑے جوش سے منایا جاتا ہے. مگر اس کا حلقہ زیادہ تر بچوں کے اسکول ہوتے ہیں. یکم مئی کا یوم مزدوران یہاں بہار کے تہوار "بہار بیرام" کے نام سے منایا جاتا ہے. ۱۹ر مئی کو جوانوں کا تہوار ہوتا ہے جس میں کھیل کود (اسپورٹس) شامل ہوتا ہے. اس لئے اس کا نام "گینچلک واسپور بیرام" ہے. یہ بہت شان سے منایا جاتا ہے. گینچلک پارک اور گھڑدوڑ کے میدان کے درمیان جو اسٹیڈیم ہے وہ اس کا مرکز ہوتا ہے. یہ کافی بڑا اسٹیڈیم ہے یقیناً پچاس ہزار سے زیادہ آدمی سماتے ہوں گے. سردار احمد خان صاحب نے میرے لئے بھی پاس کا انتظام کرلیا تھا. نو بجے آغاز ہوتا تھا. ہم لوگ آٹھ بجے تک اسٹیڈیم پہنچے اس وقت بھی بھرا نظر آتا تھا. اور لوگ تھے کہ برابر آئے جارہے تھے. سردار صاحب نے جگہ بھی اچھی پالی اور ہم سیڑھیوں پر بیٹھ گئے. ہم نیچے سے دو سیڑھیاں اوپر تھے اس لئے جب ہجوم اور بڑھا تو آگے راستے میں لوگ کھڑے ہو گئے. جس کے نتیجے میں ہم کو اور ہمارے پیچھے والوں کو بھی کھڑے ہو کر دیکھنا پڑا. پولس والوں سے کہا جاتا تھا کہ ان آگے والوں کو بٹھاؤ. مگر وہ بے بس تھے. درخواست کرتے تھے اور کوئی نہ سنتا تھا. (ڈنڈے بازی کی یہاں رسم نہیں ہے.) سردار صاحب قسم قسم کے جتن کرتے تھے مگر سب بے سود. آخر کچھ دیر بعد پولس افسر سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو بٹھانے کا انتظام نہیں کرسکتے تو ہمیں باہر پہنچانے کا انتظام تو کر دیجیے. اسٹیڈیم کے دروازے ۸½ بجے بند ہو چکے تھے. اسلئے درمیان میں باہر نکلنا بھی ناممکنات سے تھا. اس پولس افسر کی مدد سے بہ آسانی باہر نکل آئے. اور باقی تماشا نہ دیکھ سکے.

اس اسٹیڈیم سے ملحق جوانوں کا باغ "گینچلک پارک" ہے. بہت بڑا باغ ہے. درمیان میں بہت ہی بڑا تالاب ہے جو عرض میں کم اور طول میں زیادہ ہے. دور تک چلا گیا ہے. اس پر ادھر سے اُدھر عبور کرنے کے لئے پل بنے ہوئے ہیں. ایک اسٹیمر بھی ہے اس تک پہنچنے کے لئے بھی پل بنا ہوا ہے. اس پارک کی سیر کا پورا لطف گرمیوں

میں آتا ہے۔ تالاب کے کنارے رنگین روشنی کی جھالریں لگائی ہیں۔ بیچ میں فواروں کی تہہ میں رنگ برنگے بلب ہیں۔ بیرونی پھاٹک سے تالاب تک حوض ہیں۔ ان میں بھی رنگین فوارے لگے ہیں۔ پورے پارک میں جا بجا چائے خانے اور دکانیں بھی ہیں۔ ان چائے خانوں میں بیٹھکر چائے پینے کا لطف آتا ہے۔ یہاں حقہ بھی ملتا ہے شیشے کی فرشی پیچوان۔ چلم بہت چھوٹی ہوتی ہے اس میں بھیگا ہوا تمباکو رکھتے ہیں۔ جو دیر میں سلگتا ہے اور دیر تک چلتا ہے۔ سارا پارک لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ پارک ہی میں نہیں باہر اردگرد کی سڑکوں پر بھی بیحد ہجوم تھا۔ اس پارک میں تفریحی ریل بھی چلتی ہے۔ یہ ریل کراچی کی ٹرام کی مانند ہے۔ مگر اس سے قد و قامت میں چھوٹی۔ ایک بجے کے قریب ہوٹل واپس آیا۔ تو موسلا دھار بارش شروع ہوئی جو شام تک جاری رہی۔ اچھا ہوا کہ اسٹیڈیم سے مجبوراً باہر نکل آئے تھے ورنہ خوب بھیگتے۔

۲۲ مئی ۱۹۶۸ء کو "یوم اقبال" منایا گیا۔ "ترک پاکستان انجمن یگانگت" اس کی داعی ہے۔ صدارت بظاہر کسی نے نہ کی۔ ڈائس پر صرف مقرر آتا تھا۔ اسی انجمن کے صدر ڈاکٹر فرمان جمہور (ریکٹر انقرہ یونیورسٹی) ہیں وہ نہیں آئے تھے تو یونیورسٹی کے ایک اور پروفیسر صاحب نے جو غالباً اس انجمن کے نائب صدر ہوں گے۔ جلسے کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے سفیر پاکستان نے انگریزی میں اپنا افتتاحیہ مقالہ پڑھا اس کے بعد کچھ اور پروفیسر صاحبان نے جن میں صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر ملیحہ اور رادام پری ہانم اربرون بھی شامل تھیں۔ اپنے اپنے مقالے پڑھے۔ درمیان میں "لا الٰہ الا اللہ" والی اقبال کی غزل کورس میں گائی گئی۔ سب سے زیادہ اسی کو پسند کیا گیا۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" تحت اللفظ پیش کیا گیا۔ جو تاثر پیدا کرنے کی صورت کی گئی تھی۔ وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اقتباسات کافی طویل تھے۔ سب سے زیادہ اسی نے بور کیا۔ کہا گیا کہ فیکلٹی کے اس ھال میں مجمع بہت کم ہوتا ہے۔ مگر آج ہال بھر گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آخر تک نصف لوگ اکتا کر چلے گئے تھے۔ جلسہ بحیثیت مجموعی کامیاب تھا۔

میں شروع ہی سے ٹوپی پہنتا رہا ہوں۔ اول قراقلی تھی۔ اپریل سے جناح کیپ۔ محض اس ٹوپی سے کافی اعلان کا کام ہو جاتا ہے۔ کئی لوگوں نے خود مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا ہوں۔ طلبہ اور طالبات کی ٹولیوں میں اکثر سنائی دیا۔ کہ کسی باخبر نے پاکستان کہہ کر میری قومیت

بتائی۔ اگر اپنے لباس یا کسی ایسی نمایاں علامت کو اختیار کیا جائے تو یہ بڑا فائدہ ہے کہ "اعلان" ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہاں ہندوستانی فلم چل رہے ہیں تصویر ان کی مکالمات ترکی میں۔ ڈب کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ پاکستان کے دستاویزی فلم آئے اور مفت دکھائے گئے۔ تو سنا ہے بہت مقبول ہوئے۔ ہمارے طلبہ کا بیان ہے کہ بہت عمدہ تھے۔ انہوں نے اور بعض دوسرے ترکوں نے بھی کہا۔ کہ اگر پاکستانی فلم آئیں تو ہم ان کو بہت شوق سے دیکھیں اور ہندوستانی فلموں پر ترجیح دیں۔ یہ بھی جا بجا سُنا کہ یہ لوگ ہمارے فلمی گانوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کاش ہمارے فلمساز ترکی میں ڈب کرکے فلم بھیجتے !!

۲۵ رمئی ۱۹۶۸ء کو جناب رشید تبسم تھرڈ سیکرٹیری سفارت خانہ کے گھر مشاعرہ تھا۔ تبسم صاحب پُرگو شاعر ہیں۔ کچھ اور پاکستانی حضرات بھی شعر کہتے ہیں۔ مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی بعض طلبہ بھی شعر کہتے ہیں۔ ان میں ایک صاحبزادے جمیل احمد مزاحیہ شعر لکھتے ہیں۔ ۸½ بجے کا وقت تھا۔ خواتین و حضرات کی تعداد چالیس سے کم تھی۔ سفیر صاحب کے آنے پر مشاعرہ شروع ہوا۔ شعرا کی تعداد پندرہ تھی پہلا دور ختم ہوا تو چائے کا وقفہ ہوا پھر دوسرا دور غیر طرحی شروع ہوا۔ اس وقت سفیر صاحب اجازت لیکر چلے گئے۔ دوسرے غیر طرحی دور کی صدارت مجھ سے کرائی گئی۔ گذشتہ بیس سال میں مجھ سے کبھی غزل نہ ہو سکی۔ تعجب ہے کہ یہاں آسانی سے کہہ سکا تبسم صاحب اور شمیم صاحب بہت پُرگو ہیں۔ طرح پر طویل دو دو غزلیں سنائیں۔ تبسم صاحب نے دو اور غزلیں نئی کہی ہوئی بھی سنائیں۔ بارہ بجے محفل ختم ہوئی بہت ستھری اور پُرلطف صحبت تھی۔

یہاں سفارت خانے سے کچھ زیادہ سنٹو میں پاکستانی حضرات ہیں۔ مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی میں بھی کافی پاکستانی طلبہ ہیں۔ سنٹو اور سفارت خانے کے ملازم حضرات کوچک اِسات اور چانکایہ میں رہتے ہیں۔ اور باہم میل جول ہے۔ یہ مشاعرے بھی میل جول کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک دلچسپ ذریعہ ملاقات "قرآن خوانی" کی تقریب ہے۔ ہر ہفتے نہیں تو ہر پندرھواڑے ضرور کسی نہ کسی کے گھر یہ محفل ہوتی ہے۔ دو ترک حافظ صاحبان کو شرکت کی زحمت

دی جاتی ہے۔ اور وہ پابندی سے آتے ہیں۔ صاحب خانہ ان کی خدمت میں نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں۔ قرآن خوانی کے بعد پنج آیت پڑھکر فاتحہ ہوتی ہے۔ اسکے بعد دربار رسالت میں سب لوگ کھڑے ہوکر سلام کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اسکے بعد (موسم کے لحاظ سے) عصر یا مغرب کی نماز پڑھکر سب جائے بیٹھے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ ملنے کا یہ بہانہ سب سے بابرکت اور عمدہ معلوم ہوا۔

یہاں لوگ ریلوں میں سفر کم کرتے ہیں۔ بسیں بہت خوبصورت اور آرام دہ ہیں۔ بس دو سیٹیں اِدھر دو اُدھر اور ہوائی جہاز جیسی گدے دار سیٹیں۔ اس لئے بسوں سے مسافرت زیادہ ہے۔ سفر کم ہونے کی وجہ سے سُنا گیا کہ ریلیں برسہا برس سے بڑے خسارے پر چل رہی ہیں۔ پرانی ریلوں کا رنگ باہر سے بڑا مکروہ ہے۔ میلا سا رنگ جس کا میں نام متعین نہیں کرسکتا۔ لیکن اندر سے آرام دہ اور بھاری بھرکم گدیاں۔ مگر تھرڈ کلاس میں وہی لکڑی کے تختے کی سیٹیں۔ ساری ریل میں ایک طرف راستہ اور کیبن بنے ہوئے ہیں۔ فرسٹ کلاس میں ہر کیبن میں چار نشستیں اور سیکنڈ کلاس میں چھ۔

شہروں میں عام بسیں تو چلتی ہی ہیں ان کے علاوہ بجلی سے چلنے والی بسیں بھی ہیں جو بڑے بڑے راستوں پر چلتی ہیں۔ بسوں میں خوب بھیڑ ہوتی ہے مگر سستی ہیں۔ ٹیکسیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک کو ٹیکسی کہتے ہیں۔ اس کا کرایہ فی میل نہیں ہوتا۔ بلکہ قریب اور دُور کے لئے الگ الگ ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی ٹیکسی کو دولمش کہتے ہیں۔ ان میں عام طور پر سات آدمی بیٹھتے ہیں۔ ان کا ایک مقام سے دوسرے مقام کا کرایہ مقرر ہے۔ یہ بغیر مسافروں کے انتظار کے چلتی رہتی ہیں۔ ان میں سفر آسان اور سستا ہے۔

ریل کے سفر کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پلیٹ فارم ٹکٹ کا رواج نہیں، اس لئے کہ مسافروں سے بھی اسٹیشن پر ٹکٹ نہیں پوچھے جاتے۔ نہ آتے وقت نہ جاتے وقت۔ بڑے اسٹیشنوں پر ریل کے پہنچنے سے قبل ہی ٹکٹ کلکٹر ریل میں ٹکٹ جمع کرلیتا ہے۔ اسٹیشن پر اتریئے اور گھر کا راستہ لیجئے۔ راستے میں ٹکٹ کلکٹر ایک یا دو مرتبہ ٹکٹ دیکھنے آتا ہے۔ چونکہ ریلوں میں یہاں سے وہاں

تنگ راستہ ہوتا ہے۔ اس لئے مسافروں کی مدد کے لئے ریل کے اہل کار برابر ریل میں چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ سات سال سے کم عمر کے بچے کا ٹکٹ نہیں لگتا۔ اس کے بعد پورا لگتا ہے۔

عورتوں کا لباس اسکرٹ ہے۔ مگر محض چند ایسی عورتیں بھی نظر آئیں جو برقع میں تھیں وہی کالا برقع۔ منہ کھلا۔ اندر اسکرٹ۔ گاؤں کی تھیں۔ اسی طرح دیہات اور قبائل کی کچھ عورتیں بڑی بڑی گھیردار شلواروں میں بھی نظر آجاتی ہیں۔ نچلے متوسط طبقے میں نیز دیہات میں نیز نچلے طبقوں میں عورتوں کے سر پر عام طور پر دو سال بندھا ہوتا ہے۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر دیہات میں چلے جائیے تو وہ عورتیں جو اسکرٹ پہنے ہوئے ہیں (اسلئے کہ یہ لباس قانوناً لازم ہے) وہ بھی اس کے اوپر ایک کالا لمبا سا پیراہن یا برقع سا پہنے ہوتی ہیں۔ بہت سی عورتیں منہ چھپائے بھی نظر آجاتی ہیں۔

میوے بہت سستے ہیں۔ مارچ اپریل میں سیب کیلے اور مالٹے تھے۔ بڑی کثرت سے۔ مالٹے بھی سستے ہیں مگر عام طور پر زیادہ میٹھے نہیں ہیں۔ کیلے دیکھنے میں سوکھے ہوئے اور مدقوق سے نظر آئے مگر میٹھے اور اچھے تھے۔ کیلے تل کر بکتے ہیں۔ سیب خوب سرخ اور خوش رنگ۔ مزے میں شیریں اور بیحد سستے۔ یعنی بارہ آنے سے سوا روپے سیر تک۔ سوا روپے سے زیادہ والی کوئی قسم نہیں۔ انگور۔ زرد آلو اور شفتالو بھی بہت اور بے حد مزیدار ہوتے ہیں۔ انگور بہت اچھے اور کئی قسم کے ہیں اور چیری بھی اچھی اور کثرت سے ہوتی ہے۔

مٹھائیاں بہت قسم کی ہیں مگر نہ پاکستان جیسی۔ یہ لوگ ہماری مٹھائیاں کھائیں تو حیران رہ جائیں۔ یہاں عام طور پر شیرینی بہت ہوتی ہے اور پھر بھی شیرے میں ڈوبی ہوئی۔ منہ بھر جائے۔ سویّوں کے مزعفر سے ملتی جلتی مٹھائی بہت عام ہے قدائف کہتے ہیں۔ بکلاوہ سب سے عام مٹھائی ہے۔ اور کئی دوسری مٹھائیوں سے بہتر ہے۔

روٹیاں طرح طرح کی ہیں۔ ہماری جیسی ڈبل روٹی بھی ہے اور سب جگہ ملتی ہے۔ مگر کھانے کی رسم عام نہیں۔ پشاوری نان بھی ہے۔ مگر زیادہ عام ایک اور روٹی ہے۔ خوب بڑی گول یا لمبی۔ اسے کاٹ کر دیتے ہیں پشاور میں ایک صاحب نے بتایا تھا کہ اتنی بڑی ہوتی ہے۔ کہ ایک روٹی میں چار کا پیٹ بھر جائے۔ یہاں آ کر دیکھا تو ان کے بیان کی تصدیق ہوئی۔ یہاں پلاؤ خشکے کو کہتے ہیں۔ کبھی اس میں الگ بریاں گوشت کا بڑا سا بوٹا بھی ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ لوگ چاول کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں یا تفہیدو میں

ایک کھانے کا نام ہے القرہ کباب۔ دیکھا تو معلوم ہوا بلاؤ ہے۔ چپ کباب اور چپ کوفتہ خوب چیز ہیں۔ مزے میں شامی کباب جیسے اور مرچیں خوب زیادہ۔

۱۹۵۳ء میں جب میں تعلیمی ثقافتی وفد میں ایران گیا تھا تو وہاں ڈھونڈنے تلاش کرنے پر بھی گدھے گھوڑے کی سواری نظر نہیں آئی تھی۔ مگر یہاں القرہ اور استانبول میں باربرداری کے لئے گھوڑوں کے ریڑھے اکثر نظر آتے ہیں۔

ترکی زبان خاصی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ سابقے اور لاحقے ملکر بیس اور تیس حرفوں کا ایک لفظ ہو جاتا ہے۔ افعال اور ضمائر ابھی تک قابو میں نہیں آئے۔ نیت بخیر ہے۔ انشاءاللہ سیکھ سکوں گا۔ لاطینی حروف کے رواج کے ساتھ اپنی ابجد کو انہوں نے صوتی اصولوں پر ڈھالا ہے۔ اس لئے حروف کی آوازیں منطقی اور صوتی ہوگئی ہیں۔ یہ کام بے حد مفید اور عمدہ ہے۔ مگر ایک بات باوجود کوشش کے نہ سمجھ سکا کہ ب (B) کی آواز کے موجود ہوتے ہوئے ب کو پ (P) سے کیوں بدل دیتے ہیں۔ جیسے Kebap (کباب) یا Kitap (کتاب) اسی طرح دال (D) کو ت تلفظ کرتے ہیں۔ جیسے Imdat (امداد) ، Ahmat (احمد) اب تک اس تلفظ کی تبدیلی کی موافقت میں جو دلائل سنے وہ دل کو نہ لگے، بلکہ بے معنی معلوم ہوئے۔

کمال اتاترک نے جہاں اور بہت سی اصلاحات نافذ کی تھیں ان میں ایک زبان کی تطہیر کی اصلاح بھی تھی۔ یعنی پرانے عربی الفاظ خارج کر کے ترکی الفاظ رائج کئے جائیں۔ یہ کام کافی حد تک عمل میں لایا گیا۔ ایک جماعت بھی اس کام کے لئے بنائی گئی تھی۔ "دِل کرومو" (انجمنِ زبان) اب بھی موجود ہے۔ اس کا کام ہے زبان کی اصلاح اور نئے الفاظ رواج دینا۔ دورِ عثمانیہ میں عربی کا رواج بہت ہی زیادہ تھا۔ فارسی کا بھی تھا۔ مگر کم۔ اس انجمن کا اصل مقصد یہ تھا کہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ جو سخت نامانوس ہیں۔ اور اصل زبانوں میں بھی جن کا استعمال متروک ہے ان کو بدلا جائے۔ مگر کارکن ایسے متعصب تھے کہ انہوں نے بہت عام مروج الفاظ بھی بدل دئیے۔ ریڈیو ترکی مطلق آزاد ادارہ ہے۔ ریڈیو میں بھی زبان کی اصلاح پر زور دیا جا رہا ہے اور بکثرت نئے نئے الفاظ جاری کئے جا رہے ہیں۔ یہ کام اس سابقے سے ہو رہا ہے کہ ترکوں نے ہی بتایا کہ ریڈیو کی زبان اکثر ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں فیکلٹی آف پولیٹیکل سائنس نے زبان کی ... تبدیلی کے بارے میں جو ترکی ریڈیو

نے اختیار کر رکھی ہے، اہل الرائے سے استصواب رائے کیا تھا۔ اخبار میں اس استصواب کا نتیجہ پڑھا۔ دلچسپ ہے۔ کوئی چودہ فیصد نے کوئی رائے نہ دی۔ صرف چھ فیصد نے ریڈیو کی زبان کی موافقت میں رائے دی۔ باقی تقریباً اسی فی صد نے یہ رائے دی کہ یہ تبدیلیاں لغو ہیں۔ وہی پرانی ترکی زبان چلتی رہنی چاہیئے۔ یعنی وہ زبان جس میں بکثرت عربی الفاظ ہیں وہی مقبول عام ہے۔ یہ رائے ہے بھی حقیقت پر مبنی۔ ہزارہا الفاظ عربی کے ہیں جو جزو زبان بن چکے ہیں۔ پرانی اور نئی کتابوں میں اور ہر سن و سال کے لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ ان کو تبدیل کرنا ظلم عظیم ہے۔ گویا نئی زبان ایجاد کرنی پڑے گی۔ یہی حال ایران کی اس انجمن کا ہوا تھا۔ اور ہے جو اسی مقصد سے قائم کی گئی تھی اور جس نے اس کام کی نیت کی تھی۔ اور اب بھی کہنے کو یہی کام کر رہی ہے۔ مگر وہاں بھی عملاً یہی صورت ہے۔ بلکہ ترکی سے زیادہ فارسی میں عربی الفاظ اب بھی مروج ہیں۔ تیرہ سو سال وہاں اور تقریباً سات سو سال یہاں ہو گئے کہ زبان کا ایک خمیر ایک مزاج ایک ترکیب بن چکی۔ اس میں جبریہ تبدیلی نہ عقل کے مطابق ہے نہ رواج کے۔ نہ نفسیاتی ہے نہ تاریخی۔ نہ کوئی اصول لسان ولسانیات اس کی موافقت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اندرون ملک میں چلے جائیے تو ایسی بیشمار مثالیں ملیں گی کہ وہاں کے لوگ نئے الفاظ سے قطعاً ناواقف ہیں۔ آپ وہ نئے الفاظ بولیں گے تو وہ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ مثلاً اول کا لفظ عام استعمال کا لفظ ہے نئی زبان میں اسے اُنجی (ONCE) کہیں گے۔ اس لفظ سے عوام بے خبر ہیں۔ اسیطرح سال کو ہمیشہ سے سنہ کہتے ہیں نیا لفظ یل (YIL) لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسری مغربی زبانوں سے الفاظ لینا یا نئے علوم و فنون کی اصطلاحات جدیدہ کو رواج دینا اور ہی بات سے علٰحدہ ہے۔ اس میں کوئی حرج ہوتا تو درکنار، اس سے زبان وسیع اور قوی ہوتی ہے۔ اور یہ کام بالکل فطری اور نفسیاتی بھی ہے۔ اتنا پھر بھی ہے کہ اس اخذ و جبر میں بے اعتدالی اور تعصب کو دخل دینا چاہیئے۔ بلکہ اگر خود ان زبانوں (ترکی فارسی) کی پرانی بارہ سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام ہمیشہ ہوا اور ہوتا رہا ہے۔

آجکل کا تجربہ بتاتا ہے کہ وزرا، پروفیسران، بڑے فوجی افسر اور اسی طرح کے دوسرے اکابر اب بھی کہ چالیس سال اس لاطینی رسم الخط کو گذر چکے ہیں نسخ رسم الخط

میں اپنی یادداشتیں لکھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں۔ کہ یہ آسان ہے۔ کرنل تحمل حسین صاحب بتاتے تھے کہ ایک دوکان سے انہوں نے کچھ خریدا۔ اس نے نسخ رسم الخط لکھا تو انہوں نے ٹوکا۔ اس دوکاندار کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ اس نے کہا کہ میرے بچپن میں ہی رسم الخط تبدیل ہو گیا تھا۔ مگر ابتدا رمیں مجھ کو نسخ میں جو سہولت محسوس ہوئی تھی وہ اب بھی باقی ہے چالیس سال سے اس نئے رسم الخط میں کام کرنے کے بعد بھی میں نجی کام اسی نسخ میں کرتا ہوں یہ حال ہزاروں لاکھوں دوسرے افراد کا بھی ہے۔ ترکی میں تقریباً چھپن مدارس عربی اور اسلامی تعلیم کے لئے قائم ہیں جن میں کثیر تعداد ہے۔ اوسط ہزار طلبہ ہر مدرسہ میں ہیں۔ گویا ۵۶ ہزار اب بھی اکسی پرانے رسم الخط میں لکھتے پڑھتے ہیں۔

چالیس پچاس برس قبل جو اصلاحات کی گئی تھیں ان میں ایک اصلاح یہ بھی ہے کہ پرانے تمام معالجات کے طریقے ممنوع قرار دیدیئے گئے ہیں۔ صرف ایلوپیتھک طریقۂ علاج کو سرکاری اجازت حاصل ہے۔ اسلئے صرف اسی کا وجود ہے۔ ہومیوپیتھک طریقہ علاج یا قدیم یونانی اور اسلامی طب کا وجود نہیں رہا۔ چونکہ عربی الفاظ عام طور پر مروّج ہیں اسلئے طب اور طبی الفاظ ان ایلوپیتھک ڈاکٹروں کے یہاں بھی نظر آجاتے ہیں مثلاً ایک ڈاکٹر صاحب کے بورڈ پر لکھا دیکھا "ہر نوعی طبی تحلیل" (her no vi tibbi tehlil) نوعی کا لفظ ان حضرت نے البتہ غلط املا سے لکھا ہے۔

اتاترک کے مزار پر حاضری دی۔ عظیم الشان عمارت ہے۔ بالکل سادہ اور پتھر کی قبر بہت بلند ہے قدآدم سے زیادہ۔ اس کی بلندی دیکھ کر دہلی کی سلطان شمس الدین التمش کی قبر یاد آگئی۔ بہت بڑا صحن ہے اور اس کے دونوں جانب دالان اور کمرے جن میں عجائب خانہ ہے۔ جنگ آزادی کے اسلحہ رکھے ہیں۔ اتاترک کے استعمال کا جملہ سامان الگ الگ کمروں میں مرتّب رکھا ہے۔ اُن کا لباس اور وردیاں۔ ٹوپ اور ٹوپیاں۔ جوتے اور دوسرا ہر قسم کا استعمال کا سامان، جو تحائف ان کو قوم یا اکابر یا سلاطین نے پیش کئے تھے۔ اور ان کا ذاتی کتب خانہ۔ کتب خانے میں مختلف علوم وفنون پر اور مختلف زبانوں کی کتابیں ہیں۔ ترکی۔ عربی۔ جرمن۔ فرانسیسی زبانوں میں، جن سے اتاترک کے شوق مطالعہ اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں کی آرائش کی ترکیب اور رواج بہت سادہ ہے۔ کئی بیرام (تہوار، عید)

ئے۔ کئی سربراہان مملکت اس عرصہ میں انقرہ آئے۔ ہر موقع پر بس اتنا کرتے ہیں کہ خاص ارات پر اور سربراہانِ مملکت کی گذرگاہوں پر چھوٹے بڑے جھنڈے لٹکا دیتے ہیں۔ پنے تہواروں میں صرف اپنے جھنڈے اور بیرونی ملک کے سربراہ کی آمد پر ایک نیا اور ایک ان کے ملک کا جھنڈا۔ اہم تہوار ہوا تو اکثر عمارتوں والے روشنی کا نتظام بھی کر دیتے ہیں۔ اکّادکّا پر بھی نظر آیا۔ بعض لوگوں نے کاغذی آرائش سڑک پر کر دی تھی مگر کہیں بھی سڑک کھود کر اور بلّیاں گاڑنے اور دروازے بنانے کا رواج نظر نہ آیا۔

یہاں NATO کا کافی بڑا مرکز ہے جس کی وجہ سے بیس ہزار امریکن یہاں رہتے ہیں۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ سڑکوں اور بازاروں میں بہت کم امریکن چلتے پھرتے نظر آئے۔ ترکوں کو ان کا وجود ہی پسند نہیں ہے۔ عوام سخت نفرت کرتے ہیں۔ کئی جگہ دیواروں پر ہاتھ سے لکھے ہوئے اعلان "NATO YOK" (ناٹو نہیں چاہیئے) پڑھے۔ ممکن ہے اسی لئے امریکنوں کو یہ ہدایت ہو کہ بازار میں نہ گھومیں۔ چند بار NATO کے دفاتر کے سامنے سے بھی گذر ہوا مگر وہاں بھی امریکنوں کو ٹہلتے نہ دیکھا۔ یہاں ایک بازار ہے جس کو امریکن بازار کہتے ہیں نہ اس وجہ سے کہ وہاں امریکن خرید و فروخت کرتے نظر آتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہاں امریکہ کا چوری کا سامان خوب بکتا ہے۔ لیکن جیسے ہمارے پشاور میں بڈھ بیر سے چوری کیا ہوا مال کباڑی بازار میں بے حد سستا مل جایا کرتا تھا ویسے نہیں بلکہ یہاں سامان اپنی اصل قیمت سے کہیں زیادہ مہنگا فروخت ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ لوگ جو بدیسی سامان استعمال کرنا جزو ایمان سمجھتے ہیں وہاں خریداری کے لئے جاتے ہیں۔

فیکلٹی کی ایک ضروری بات رہ گئی۔ پروفیسروں کے تقرر کی توثیق اوپر سے ہونی ضروری ہے۔ یعنی اول وزارت تعلیم سے اور پھر وزیراعظم اور باقی کیبنٹ سے۔ ظاہر ہے ان حضرات کو ہزاروں مصروفیتیں ہیں۔ اس لئے ذرا دیر لگتی ہے۔ میرے کاغذات وسط مارچ میں بھیجے گئے تھے اور ایک جرمن پروفیسر جو مجھ سے دو ماہ پہلے آئے تھے ان دونوں کی منظوری آخر ماہ مئی تک نہیں آئی تھی۔

جہاں تک تحقیق ہو سکا پتہ چلا کہ ترکی میں تنخواہیں بہت کم ہیں۔ ہوٹل کے بیرے، دفاتر کے چپڑاسی، چوکیدار عموماً ڈھائی/تین سو لیرا تنخواہ پاتے ہیں۔ (لیرا = ½ ۸ آنے)۔ کلرکوں کی تنخواہ چار پانچ سو لیرا ماہانہ ہوتی ہے۔ یہاں تک تو معاوضہ قدرے معقول ہے۔

افسران ہزار سے بڑھکر دو ہزار لیرا تک پہنچتے ہیں۔ دو ہزار لیرا سے زیادہ تنخواہ مشکل ہی سے ہوگی۔ بتایا گیا کہ وزراء کی تنخواہیں بھی پانچ ہزار لیرا سے زیادہ نہیں ہیں۔ اسی طرح فوج میں بھی تنخواہیں کم ہیں۔ مثلاً ایک فوجی افسر نے بتایا کہ میجر کی تنخواہ بارہ سو لیرا ماہانہ ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر طرح کے افسروں کی بیگمات بھی ملازمت کرنے پر مجبور ہیں۔ اشیاء کی قیمتیں عموماً پاکستان سے زیادہ ہیں۔ خوردنی، پوشیدنی اور دیگر جملہ اشیاء کی قیمتیں عموماً پاکستان سے گراں ہیں۔ بس پھل سستے ہیں۔ البتہ ہر چیز خالص ہے۔ رہائش سب کو کرایہ پر حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اور سب سے گراں رہائش ہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی میں تنخواہیں بہت اچھی ہیں۔ ایک یونیورسٹی پروفیسر یوں تو چار ہزار لیرا تنخواہ لیتا ہے۔ مگر شام کی شفٹ کا معاوضہ ملاکر اس کی ماہانہ آمدنی بعض اوقات دس ہزار لیرا سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ پیشہ وروں کو بھی غالباً اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہوٹل سے ملحق اسی عمارت میں نائی کی دوکان بھی ہے۔ ایک روز اس دوکان میں کام کرنیوالے حجام لڑکوں میں سے ایک سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس دوکان میں ملازم ہے۔ آقا سے یہ معاہدہ ہے کہ جو آمدنی ہوگی وہ نصفا نصفی تقسیم ہو جائے گی۔ اس نے بتایا کہ اسے پانچ چھ سو لیرا ماہانہ مل جاتے ہیں۔

انقرہ میں METO مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی قائم ہے۔ امریکہ کے روپے سے بنی ہے۔ اب بھی ترکی حکومت سے کئی گنا زیادہ روپیہ امریکہ سے آتا ہے۔ سائنس کے جملہ شعبے اور انجینئرنگ آرکیٹکچر وغیرہ کی فیکلٹیاں ہیں۔ زیادہ تر طلبہ تو ظاہر کہ ترکی کے ہوتے ہیں لیکن اُردن، عراق، ایران پاکستان وغیرہ کے بھی سینکڑوں طلبہ ہیں طالبات بھی ہیں۔ سب سے کم تعداد پاکستانیوں کی ہے۔ یہاں بی ایس سی اور ڈاکٹریٹ کی تعلیم ہے۔ بہت مشکل نصاب اور اس سے مشکل امتحان ہے۔ لڑکا امتحان میں فیل ہو جائے تو وظیفہ بند ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ فیل ہو جائے تو نکال دیتے ہیں۔ معیار تعلیم بہت اونچا ہے۔ ایم ایس اور ڈاکٹریٹ اور بھی مشکل اور بلند معیار کے ہیں۔

ایک دن شوکت بولو صاحب کے ساتھ میں بازار سے آرہا تھا۔ جب عدلیہ کے سامنے پہنچے تو شوکت صاحب نے روکا اور کہا کہ آئیے آپ کو ایک صاحب سے ملائیں۔ ایک بزرگ شخص سے انہوں نے میرا تعارف کیا۔ بہت اخلاق سے ملے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے اس لئے بات چیت نہ ہو سکی۔ ان ترک صاحب کی عمر اسّی سے متجاوز ہوگی۔ مگر اچھے خاصے

صحتمند تھے۔ معلوم کہ ان کا نام جنرل موسی .... ہے تیس سال اتا ترک کے پرائیویٹ سیکرٹیری رہ چکے ہیں۔ جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اب عرصے سے ریٹائر ہیں مگر قومی کاموں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں ایک لائبریری قائم کی ہے۔ عمارت بھی خود بنائی ہے اور کتابیں بھی اپنے پیسے سے فراہم کی ہیں۔ اب بھی اپنی پنشن کی تقریباً سب رقم اس لائبریری کے لئے کتابیں خریدنے میں صرف کرتے ہیں۔ اسی طرح اور دوسرے قومی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔

ترکی میں روزہ رکھنے کا رواج نماز کے مقابلے میں زیادہ ہی ہے۔ رمضان کا مہینہ آیا تو ایک نے دوسرے کو ماہ مبارک کی آمد کی مبارک باد دی۔ ہمارے یہاں سے زیادہ افطار نامے چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر بجائے مفت تقسیم ہونے کے فروخت ہوتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ فروخت کے پیسے مصارف خیر میں کام آتے ہیں۔ افطار نامے کو امساکیہ کہتے ہیں۔ امساک کے معنی ہیں، سحری کا آخری وقت۔ امساکیہ کے اوپر "رمضان مغفرت نشان" چھپا ہوتا ہے۔ ترکی کے شہروں میں بھی پاکستان سے زیادہ روزہ رکھنے کا رواج ہے مگر قصبات اور دیہات میں تو بہت زیادہ اکثریت روزہ رکھتی ہے۔ ترکی سیکولر اسٹیٹ ہے۔ اس لئے سڑکوں پر دن میں بھی لوگ سگرٹ پیتے نظر آجائیں گے مگر مشاہدہ اور روایت سب شاہد ہیں کہ لوگوں کی اکثریت روزے دار ہوتی ہے۔ مسرت زبیری صاحب سیکرٹیری آرسی ڈی رمضان میں انقرہ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میٹنگز میں یہ بات عام دیکھی کہ اکثر ترک افسران روزے سے ہوتے تھے۔ تراویح کا رواج بھی بہت ہے۔ مساجد خوب آباد رہتی ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ سورت تراویح ہے پورا قرآن شریف بہت کم جگہ ہوتا ہے۔ یہ بات خوب ہے کہ افطار سے سحری تک مساجد کے میناروں پر بجلی کے قمقموں کی روشنی جگمگ کرتی ہے۔ افطار کے لئے ریڈیو سے اذان ہوتی ہے۔ بعض جگہوں پر افطار اور سحری کے اوقات میں توپ بھی داغی جاتی ہے۔

بعض ہوٹل سحری کو بھی کھلتے ہیں اور ان میں تازہ کھانا ملتا ہے۔ یہاں رمضان میں افطار و سحر کے لئے کھانوں میں کوئی خصوصیت نہیں پائی۔ جس ہوٹل میں میں افطار کرتا ہوں وہاں سو سے زیادہ نشستیں ہیں۔ افطار سے دس پندرہ منٹ پہلے سب بھر جاتی ہیں۔ کچھ لوگ سلاد کی بڑی پلیٹ منگواتے ہیں۔ اور شوق

سے کھاتے ہیں کھجوریں یہاں ملتی ہیں ۔ لیکن زیادہ رواج زیتون کے پھل سے افطار کرنے کا ہے ۔ زیتون کا پھل کچھ جامن سے مشابہ ہوتا ہے ۔ مفید تو ہے مگر مجھ سے تو کیا دوسرے پاکستانیوں سے بھی نہیں کھایا جاتا ۔ صرف ایک کھانے کی چیز کا خاص اہتمام ہوتا ہے ۔ یہ ہے PIDE نان سے ملتی جلتی روٹی ہوتی ہے ۔ کلچے کی قسم کی ۔ جا بجا بیکریوں اور دوکانوں پر ملتی ہے ۔ مرچ مسالے کا کوئی ذوق ہی نہیں ۔ اسلئے چٹ پٹی چیزیں خارج از بحث ہیں ۔ تمام مساجد میں افطار کے بعد سے تراویح تک اور بعض میں دن میں بھی وعظ ہوتا ہے ۔

انقرہ کے بازاروں میں ویسے بھی بڑی رونق ہے عید کے قریب یہ اور بڑھ جاتی ہے ۔ اور عید سے دو دن پہلے تو کھوے سے کھوا چھلتا ہے ۔ مبارکباد کے کارڈوں کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے ۔ عید کارڈ بھیجنے کا رواج اب پاکستان میں بھی پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے ۔ مگر یہاں اُس سے کہیں زیادہ ہے ۔

عید ملنے کے لئے احباب اور اعزہ کے گھروں پر جانے کا بھی بہت رواج ہے مگر تحقیق اور مشاہدہ ہوا کہ عید پر معانقہ کی رسم نہیں ہے ۔ مطلق نہیں ہے ۔ یہ رواج ضرور ہے کہ کسی کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے ۔ مٹھائی کا ڈبہ اور کولون کی بوتل ضرور لے جاتے ہیں ۔ یہ کولون یہاں بڑی خوبصورت شیشیوں میں ملتا ہے ۔ اور بہت استعمال ہوتا ہے ۔ ہائی کورٹ کی عمارت کے مقابل ایک عطار کی بڑی فیشن ایبل قسم کی دوکان ہے اس دوکان پر تو عید سے دو ہفتے قبل ہر وقت قطار در قطار خریدار کھڑے نظر آئے ۔ نظم و ضبط ایسا ہے کہ بوڑھے جوان بچے عورت مرد سبھی ان قطاروں میں نظر آئے لیکن مجال ہے جو کوئی لائن کو توڑے ۔ بالکل خاموش سردی میں کھڑے سب اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔

ترکی میں چودھویں صدی سے کٹھ پتلیوں کا رواج مستند ہے ۔ کاراگوز اور حاجی دت کی یادگار ہے ۔ یہ دونوں دوست چودھویں صدی میں تھے ۔ نہایت مسخرے تھے ۔ ایک سنگ ساز تھا دوسرا لوہار ۔ لیکن تھے دونوں نکمے ۔ سلطانِ وقت نے ایک مسجد کی تعمیر کا کام ان کے سپرد کیا ۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ شمہ برابر کام نہیں ہوا ۔ اس لئے کہ دونوں دوست لطیفے کہتے اور مسخرہ پن کرتے وقت گذارتے تھے ۔ بادشاہ نے ان کو برطرف کر دیا ۔ یا شاید قتل کروا دیا ۔

بادشاہ کا ایک مصاحب تھا۔ نام تھا گسنتری اس نے کٹھ پتلیاں بنا کر ان دونوں دوستوں کے مزاحیہ واقعات اور قصے بادشاہ کو دکھائے۔ بس اس وقت سے کٹھ پتلیوں کی روایت برقرار ہے۔

ایک مرتبہ ترک امریکن ثقافتی انجمن کے زیر اہتمام کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھا۔ یہ تماشا ہندوستان اور پاکستان کے کٹھ پتلیوں کے تماشے سے بدرجہا دلچسپ تھا۔ جسے بچوں بڑوں سب نے یکساں پسند کیا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے دکھانے والا ایک ترک تھا۔ حیالی کوچک علی۔ یہ شخص ۱۹۰۴ سے یہی کام کر رہا ہے۔ اور پورے ترکی میں اپنے فن میں سب سے ماہر سمجھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اشخاص کے سامنے بھی یہی کھیل دکھاتا ہے۔ کٹھ پتلیاں بہت خوبصورت اور اس کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہیں۔ اب اسّی سے کیا کم عمر ہو گی، مگر تندرست نظر آتا ہے۔

استانبول کی سیر

استانبول کی سیر کی نیت تو بہت پہلے سے تھی۔ اپریل میں چار دن کی چھٹی آئی تو ارادہ کر لیا۔ اپنے اسسٹنٹ شوکت بولو صاحب کو بطور رہنما ساتھ لیا۔ انقرہ سے استانبول رات بھر کا سفر ہے۔ استانبول کا وہ اسٹیشن جہاں تک ریل جاتی ہے "حیدر پاشا" کہلاتا ہے۔ یہ اسٹیشن استانبول کی آبادی کے ایشیائی حصے میں ہے۔ سلطان عبدالحمید نے شہر کی تزئین کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ یہ اسٹیشن بھی انہی کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت شاہی تعمیر کی جھلک دکھاتی ہے۔ کئی منزلہ اور خوبصورت ہے۔ یہاں ریل ختم ہے۔ اسلئے عمارت کے سامنے پلیٹ فارم لمبے لمبے بنے ہوئے ہیں۔

حیدر پاشاہ سے استانبول کی اصل اور بڑی آبادی (یا یورپی حصے) میں آنے کے لئے باسفورس کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ اسٹیمر چلتے ہیں۔ ٹکٹ لیتے اور اسٹیمر تک پہنچنے میں ذرا دیر لگی۔ اتنے میں اسٹیمر چل پڑا۔ شوکت صاحب تو کود کر چڑھ گئے میں ادھر کھڑا رہ گیا۔ اسٹیمر آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ایک خلاصی نے میری مجبوری دیکھی تو وہ تختہ جو مسافروں کو اتارنے چڑھانے کے لئے لگایا جاتا ہے، لگا دیا۔ اس طرح میں اسٹیمر پر آسکا۔

اس وقت شدید سردی اور اس سے شدید تر ٹھنڈی ہوا بھی۔ ہم نے

اسٹیمر کی نیچے اور اُوپر کی منزل میں اندر جانا چاہا تو معلوم ہوا سب بند ہیں یعنی مقفل ہیں۔ مجبوراً عرشے پر ہوا کھاتے رہے اور اِدھر اُدھر کی سیر کی تاکہ سردی کا احساس کم ہو جائے۔ اسی طرح ہوا کھاتے دوسرے کنارے پر پہنچے۔ درہ دانیال تو یہاں سے بہت دور ہے۔ بحیرہ مارمارا۔ باسفورس اور گولڈن ہارن کی دور سے سیر کرتے رہے۔ استانبول سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ اس لئے سارے شہر میں نشیب و فراز سے سابقہ ہے۔ چوڑی سڑکیں صرف نئی آبادی میں ہیں۔ شہر میں اپنے زمانے کے لحاظ سے جو بڑی سڑکیں تھیں وہ بھی اب آبادی کی کثرت اور موٹروں بسوں کی بہتات کے باعث بے حد مصروف اور ہجوم سے پُر نظر آتی ہیں۔ اسٹیمر سے اُتر کر علاقہ پُل عبور کرکے آبادی میں آ گئے۔ دودھ مکھن روٹی کا ناشتہ کیا جائے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ آخر دوکان دار سے کہہ کر منگوائی۔ القرہ کی طرح یہاں بھی چائے کی دوکانیں بالکل الگ ہوتی ہیں۔ اور قرأت خانہ کہلاتی ہیں۔

نئی سڑکیں تو ڈامر کی بنی ہوئی ہیں۔ لیکن بکثرت ایسی پرانی سڑکیں بھی موجود ہیں جو پتھر کی کمتا اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ میں نے شوکت صاحب سے کہا کسی ایسی جگہ ہوٹل تلاش کرو جو شہر کے وسط میں ہو تاکہ سیر سپاٹے میں آسانی ہو۔ چنانچہ "بایزید" کے قریب انقلاب ہوٹل میں آ گئے۔ یہاں سے یوسف عیسیٰ البتگین صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک امریکن پروفیسر آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کو "قونیہ ہوٹل" مدعو کیا ہے۔ آپ دونوں بھی ظہرانہ ہمارے ساتھ وہیں کھائیے۔

ابھی وقت کافی تھا۔ اسلئے ہم سب سے پہلے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار مقدس کی زیارت کیلئے روانہ ہوئے۔ آپؓ کے نام کی مناسبت سے اس سارے محلے کا نام ہی ایوب ہے۔ راستے میں استانبول یونیورسٹی کی عالیشان عمارت پڑی۔ یہاں پہلے وزارت دفاع تھی۔ بہت وسیع عمارت اور احاطہ ہے۔ اسی میں مزید عمارات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار پاک اور روضہ مبارک سنگ مرمر کا ہے۔ اندر نہیں جانے دیتے۔ روضہ شریف کی عمارت وسیع ہے بس وہیں سے فاتحہ پڑھو۔ شوکت صاحب نے میرے پاکستان سے آنے کی دھونس جمائی تو خادم نے تالا کھول کر مزار شریف کے قبہ میں داخل

کردیا۔ خوبصورت نقش و نگار۔ آیات طلائی بہت خوشنما لکھی ہوئی۔ مزار مبارک خوب بلند، گرد کٹہرا اور خوبصورت چادر چڑھی ہوئی۔ مزار پاک کے گرد کی جالی سلطان سلیم ثالث نے بنوائی تھی۔ اسی گنبد میں ایک اور بزرگ کا بھی اونچا سا مزار ایک گوشے میں سا ہے۔ یہ ایک پاشا تھے جنہوں نے فتح قسطنطنیہ میں بڑے کارنامے انجام دئیے تھے۔ برابر میں مسجد بھی ہے۔ سنگ مرمر کی بہت خوبصورت۔ استانبول کی بڑی مسجدوں کے مقابلے میں چھوٹی مگر پھر بھی کافی وسیع۔ بڑی اور چھوٹی سب مسجدوں کی وضع ایک ہے۔ یعنی ساری مسقف، دروازے پر نہایت موٹا چمڑے کا پردہ۔ اس کے اندر نہ معلوم کیا بھرا ہوتا ہے کہ بیحد وزنی ہوتا ہے۔ ساری مسجد میں قالین کا فرش۔ محراب، منبر، واعظ کے وعظ کے لئے ایک، کافی بلند جگہ۔ ایک سمت میں (بعض مساجد میں دونوں سمت) گیلری عورتوں کے لئے۔ بڑی مساجد میں بائیں طرف سلطان کے لئے بلند گیلری) اور وسط سے ذرا آگے ایک دالان (شاید امرا کیلئے ہوتا ہوگا) محراب کے دونوں طرف جناتی سائز کے دو پیتلی شمعدان، جن میں اب بلب روشن ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے جھاڑ۔ وسط میں بہت ہی بڑا۔ ان جھاڑوں میں عام طور پر کنول روشن ہوتے ہیں۔ محرابوں میں مطلا نقش و نگار۔ اور آیات کلمہ لکھا ہوا۔ مطلا و مذہب۔ چاروں طرف چاروں خلفائے کرام ؓ کے اسمائے گرامی، پشت پر حسن ؓ و حسین ؓ۔ محراب کے ہر دو طرف اللہ اور محمد ؐ۔ تقریباً سب مساجد میں یہی صورت ہے۔ نقش و نگار اور آرائش البتہ کم زیادہ ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری ؓ کی مسجد مبارک میں ظہر کی نماز کے وقت تقریباً ڈھائی سو آدمی تھے۔ نماز کے بعد ایک ترک مجھ سے بڑے اخلاق سے ملے۔ اور کئی آدمیوں سے مجھے پاکستانی کہہ کر ملایا۔ پھر امام صاحب کے حجرے میں لیجا کر اُن سے ملایا۔

جماعت کی شان سب مساجد میں ایک ہے۔ یعنی پیچھے دور مؤذن اقامت پڑھتا ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ کلمہ شہادت دوسری دفعہ کہتا ہے تو امام صاحب اپنے مصلے پر آجاتے ہیں۔ اور اسی وقت سب نماز کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک بجے قونیہ ہوٹل پہنچنا تھا مگر ہم کوئی پونے دو بجے پہنچے۔ قونیہ ہوٹل استانبول کے بہت اچھے ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہے۔ امریکن پروفیسر اور ان کی بیگم کو سادہ کھانے پر اصرار تھا اس لئے کورس مختصر تھا۔ الپتگین صاحب ترکی میں ترکمانوں کی انجمن کے سربراہ

ہیں کچھ دوسرے ترکمان بھی شریک تھے۔ اگلے دن الحان صاحب نے اپنے گھر کھانے
پر مدعو کیا۔

قونیہ ہوٹل سے آکر کچھ دیر آرام کیا۔ شام کو جامع سلطان بایزید یلدرم گئے،
بہت بڑا احاطہ ہے۔ بے حد عظیم اور شاندار مسجد ہے۔ اسے کبوتروں والی مسجد
بھی کہتے ہیں۔ اسلئے کہ ہزاروں کی تعداد میں کبوتر ہیں۔ وسیع صحن سے گذر کر شادوران ۔
نام کی گول عمارت ہے۔ اس میں چشمہ ہوتا ہے (پانی کے حوض جیہ کو چشمہ کہتے ہیں)
چاروں طرف دالان (رواق) ہیں۔ اس مسجد کی وضع اور ساخت اور آرائش
وہی ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے بس ان بڑی مساجد کی آرائش، نقش و نگار
جھاڑ فانوس قالین وغیرہ زیادہ شاندار خوشنما اور قیمتی ہیں۔

جامع بایزید کا باہر کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ یہاں مدرسہ تھا کتب خانہ تھا
اور طلبہ کے لئے بورڈنگ ہاؤس تھے۔ کتب خانہ اب بھی ہے۔ مخطوطات اور مطبوعات
کے دو الگ الگ کتب خانے ہیں۔ اس سے ملحق ایک بازار ہے جس کی صورت بتاتی
ہے کہ پہلے ہوسٹل ہوگا۔ اب دوکانیں ہیں۔ صحن سے سامنے استانبول یونیورسٹی کا
شاندار اور خوبصورت دروازہ نظر آتا ہے۔ اس پر لکھا ہے "دائرہ امور عسکریہ" ملٹری ہیڈکوارٹر
اور وزارتِ دفاع شاہی زمانے میں اسی عمارت میں تھے۔ شکر ہے کہ دروازہ اسی شکل و صورت
میں برقرار ہے۔ اس دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک بلند مینار ہے۔ جو غالباً دیدبان ہوگا۔

اس مسجد کے باہر قریب ہی ایک مسقّف بازار ہے۔ ہے تو پرانا مگر سلطان عبدالحمید
مرحوم نے اس کی توسیع و تزئین کرکے زیادہ بارونق بنا دیا ہے۔ بے حد رونق ہے۔ لاتعداد
دوکانیں۔ ہر چیز کی دوکانوں کے الگ الگ حصے۔ زیورات، گھڑیاں، قالین، جوتے، کپڑے
پوستین۔ برتن۔ فرنیچر غرض ہر نوع کا سامان ایسا اور اتنا کہ سیر کیے جائیے۔ کہتے ہیں کہ یورپ
کے دُور دُور کے مقامات سے ہر قسم کی خریداری کے لئے لوگ یہاں آتے ہیں۔ واقعی ہمہ نوع
اور ہمہ نعمت یہیں مل جائے گی۔ اور بازار اتنا وسیع ہے کہ اگر کھو گئے تو نکلنے کے لئے رہبر
کی ضرورت لاحق ہوگی۔ چھتہ بازار سے یہ فائدہ ہوا کہ آرام سے گھومتے رہے۔ باہر
اتنی سخت سردی تھی کہ ہوا کی وجہ سے چلنا مشکل تھا۔ ریڈیو سنکر شوکت صاحب نے بتایا
کہ انقرہ اور ادانہ کے درمیان اتنی سخت بارشیں ہوئی ہیں کہ راستے خراب ہو گئے۔ اس

اثر ہو نہ ہو۔ استنبول میں تو سمندر کی سرد ہواؤں نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس چھتہ بازار کی دوسری طرف جامع نور عثمانیہ ہے۔ خاصی بڑی اور خوبصورت مسجد ہے یہاں بھی ایک سمت مدرسہ ہے۔ اور دوسری سمت کتب خانہ۔ سردی اتنی شدید تھی کہ باہر پھرنا مشکل تھا۔ مجبوراً سات بجے ہی ہوٹل لوٹ آئے۔

اگلے دن سب سے پہلے اول "توپ کاپی سرائے" گئے۔ راستے میں جامع سلطان ورایا سوفیہ ہیں۔ لیکن ان کو بعد کے لئے رکھا۔ سرائے محل کو کہتے ہیں۔ توپ کی وجہ سے اس محل کا یہ نام ہوا۔ اندر جانے کا وقت دس بجے سے ہے اسلئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس سارے محل اور عجائب خانے کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ یہ محل عجیب وغریب اور قابل دید ہے۔ محل کے بیشتر حصوں کو پرانی طرح سجا کر رکھا گیا ہے۔ پھر یہ کہ سلاطین آل عثمان کے سارے خزانے جن کو چشم فلک بھی نہ دیکھ سکتی، یہاں جمع ہیں۔ سلاطین کے ملبوسات، اسلحہ، زیورات گھنٹے گھڑیاں، شمعدان، بخوردان، سنگاردان، تلواریں زرہ برتن، غرض اس طرح کی تمام چیزیں الگ الگ کمروں میں آراستہ بکسوں میں رکھی ہیں۔ محض ان ناموں سے چیزوں کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ اسلئے کہ ساری چیزیں طلائی اور جواہرات سے مرصع ہیں۔ ان کی صنعت کاری، مرصع کاری اور قیمت کا تخمینہ کرنا بھی آج مشکل ہے۔ مثلاً شمعدان آدمی کے قد سے بھی بڑے تھے۔ گھنٹے بہت بڑے سائز کے گھڑیاں۔ ڈبے سنگار دان مطلا جواہرات سے مرصع۔ غرض ہر شے بیحد قیمتی اور خوبصورت۔ جواہرات کے ڈھیر کے ڈھیر رکھے ہیں۔ لعل، زمرد، یاقوت، زبرجد، ہیرے، موتی اور جانے کیا کیا۔ ایک بڑا سائز ہیرا ۸۶ قیراط کا جسکے گرد ۴۸ چھوٹے ہیرے نصب ہیں۔ ایک اور بڑا ہیرا ہے کوکب دری۔ چونکہ ناتراشیدہ ہے، اس لئے اس کی قیمت کا تعین بھی ممکن نہیں۔ اس طرح سلاطین کے کئی طلائی تخت ہیں۔ جن میں ان گنت قیمتی جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی خوبصورتی اور صنعت کاری تحسین سے بالاتر ہے۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کا تخت جواہر ان سے فتح کے وقت لایا گیا تھا۔ قدر وقیمت اور زینت و آرائش کے لحاظ سے بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ انہی عجائب و نوادر میں حضرت یحییٰؑ کا دست مبارک کٹا ہوا رکھا ہے۔ اوپر سونے کا خول ہے چند انگلیاں زیارت کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح آپ کی کنپٹی کی ہڈی کا ایک ٹکڑا زیارت

کے لئے موجود ہے۔

ایک کمرے میں مخطوطات اور تصاویر ہیں۔ سب سے عجیب چار تصویریں احمد موسیٰ نامی مصور کی چودھویں صدی عیسوی کی بنائی ہوئی ہیں۔ جن میں آنحضرتؐ کی معراج شریف کی عکاسی کی گئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضورؐ کی تصویر بھی بنائی ہوئی ہے۔ ایران میں تو یہ چیز عجیب نہ ہوتی ترکی میں عجیب معلوم ہوتی ہے۔ سلاطین کے زمانے میں تو کہیں خزانے میں نظروں سے غائب رہتی ہوگی۔ اب خزائن کے ساتھ یہ تصویریں بھی منظر عام پر آگئیں۔ سلطان محمد فاتح کے خاص البم کی چودھویں پندرھویں صدی کی بہت سی تصویریں ہیں۔ سلاطین آل عثمان کی بڑی بڑی تصویریں ترتیب سے لگی ہوئی ہیں۔ ایک بہت بڑی تصویر میں سب کا گروپ بیضوی چوکھٹوں میں بنا کر یکجا کر دیا گیا ہے۔ سب تصویریں بہت خوبصورت اور مطابق اصل ہیں۔

اس محل میں "مقدس تبرکات" بھی ہیں۔ مجھے اسی کو دیکھنے کی جلدی تھی۔ مگر غلط سمت سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ بلکہ اس میں ہمارا قصور نہ تھا۔ تیر کا نشان کہ ادھر سے شروع کرو اس طرح لگایا گیا ہے کہ ان مقدس تبرکات کا نمبر آخر میں آتا ہے۔ ان تبرکات کو بڑے احترام سے رکھا گیا ہے۔ شاہی زمانے میں ان کے لئے مرصع اور مطلا صندوقچے، ڈبے، خول اور غلاف تیار کئے گئے تھے۔ جو اب بھی موجود ہیں۔ اپنی صناعی اور حسن کے لحاظ سے یہ خود قابل دید ہیں۔ سترھویں صدی میں زرین کام کے نہایت حسین قالینی پردے تیار کرائے گئے تھے جو ان کمروں میں جا بجا آرائش کا کام بھی دیتے ہیں۔ اور اس مخصوص صنعت کا بہترین نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ مقدس اسلامی تبرکات ساری دنیا کے تبرکات سے زیادہ مستند اور معتبر سمجھے گئے ہیں۔ انکی مختصر تصریح یہ ہے۔ یہ سارے تبرکات مقدسہ محل کے ایک حصے میں محفوظ ہیں جسے سلطان محمد فاتح نے ۱۴۷۴ء اور ۱۴۷۸ء کے درمیان نہایت شان و شوکت اور آرائش و زینت کے ساتھ تعمیر کروایا تھا۔ یہیں اس نے "چادر مبارک" کو قیمتی بکس میں محفوظ کیا تھا۔ اس مقام کا نام "عزوۂ خاص" تھا۔ سلطان خصوصی محفل یا دربار بھی یہیں منعقد کرتا تھا۔ سلطان سلیم اول نے مصر فتح کیا تو دوسرے قیمتی اور مقدس تبرکات مصر سے استانبول لے آیا۔ اور ان کو اس حصے میں

محفوظ کیا۔ سلطان محمد رابع (۴۰-۱۶۴۳) کے حکم سے امانات مقدسہ کے لئے موجودہ قبہ بنوایا گیا۔ جو نہایت خوبصورت، مطلا و مذہب ہے۔ نہایت خوشنما کام اور آیات تحریر ہیں۔ قیمتی جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔

ان کمروں میں اور خصوصاً مذکورہ بالا قبہ میں طلائی قندیل جو جواہرات سے مرصع ہیں، اور انتہائی خوبصورت ہیں۔ لٹکے ہوئے ہیں۔ پردوں پر زردوزی میں آیات کڑھی ہیں۔ خوبصورت اور صنعت کے اعلیٰ نمونے۔ خرقہ سعادت (آنحضرتؐ کی بردہ مقدس) اور علم مبارک صندوقوں میں بند اندر ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں رکھے ہیں۔ وہاں آنے کی اجازت نہیں۔ باہر چاندی کا ایک کٹہرا لگا ہے۔ جو دروازے سے دور رکھتا ہے۔ دور سے شان اور رونق اور زینت آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ کئی بکس ہیں جو صندل یا اخروٹ کی لکڑی اور جواہرات سے مرصع ہیں جو مختلف سلاطین نے ان مقدس تبرکات کے لئے دئے تھے۔ یہ سب کمرے دیکھنے کے لائق ہیں ان کی آرائش اور صنعت کاری (خصوصاً غرفۂ خاص کی) تحسین سے بالاتر ہے۔

امانات مقدسہ کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ آنحضرتؐ کا نامۂ مبارک مقوقس والی مصر کے نام (جڑاؤ طلائی فریم میں)۔

۲۔ آنحضرتؐ کی دو تلواریں (سلطان احمد اول نے اس پر سونا چڑھوایا اور جواہرات سے مرصع کیا۔

۳۔ آنحضرتؐ کی کمان (بانس کی) (سلطان احمد اول نے اس کا طلائی جڑاؤ غلاف بنوایا جو ساتھ رکھا ہے)۔

۴۔ حضورؐ کی بردہ شریف (جو حضرت کعب بن زبیرؓ کو آپ نے انعام میں عطا کی تھی)۔

۵۔ حضورؐ کا علم مبارک (لوائے سعادت) (یہ دونوں تبرکات (یعنی ۴ اور ۵) قیمتی طلائی ہیرے جواہرات سے جڑے ہوئے صندوقوں میں بند ہیں۔ کہتے ہیں کہ علم مبارک کے تو ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہیں)۔

۶۔ حضورؐ کی مہر مبارک عقیق پر (طلائی جڑاؤ ڈبے میں)۔

۷۔ حضورؐ کا دندان مبارک (طلائی جڑاؤ ڈبے میں)

۸۔ حضورؐ کی لحیہ مبارک کا ایک موئے مقدس (طلائی جڑاؤ ڈبے میں)

۹۔ حضور کی لحیہ مبارک کا ایک موئے مقدس (ایک شیشے میں تاکہ دیکھا جاسکے)۔

۱۰۔ حضورؐ کا قدم شریف (قدم سعادت) جڑاؤ طلائی چوکھٹے میں)۔

۱۱۔ سونے کے مرصع گول اور لمبے ڈبے جن میں مزارِ مقدسِ نبوی صلعم کی خاک مبارک رکھی ہے۔

۱۲۔ خلفائے راشدینؓ (چاروں) کی تلواریں (سلاطین نے ان کو بھی آراستہ کر کے محفوظ کیا ہے۔) جواہرات جڑے ہوئے دو تلواریں حضورؐ کی اور چار یہ۔ ان کے علاوہ پندرہ تلواریں اور اکابر سلف کی یادگار ہیں)۔

۱۳۔ خط کوفی میں ہرن کی کھال پر لکھا ہوا قرآن مجید (ممکن ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ یہ روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ جس وقت شہید کئے گئے ہیں تو آپ اسی مصحف شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ آپ کے خون کے دھبے بھی صفحات پر موجود ہیں)۔

۱۴۔ خانہ کعبہ شریف کے پردوں کے دو ٹکڑے۔ جن پر زردوزی میں آیات تحریر ہیں۔

۱۵۔ 〃 〃 کی چاندی کی دو کنجیاں۔ خوبصورت جڑاؤ چوکھٹے میں۔

۱۶۔ 〃 〃 کا چاندی کا تالا 〃

۱۷۔ 〃 〃 کی چاندی کی دو اور کنجیاں 〃

۱۸۔ 〃 〃 کا پرنالہ چاندی کا جسے سلیمانِ اعظمؒ کے حکم سے بنوایا گیا تھا منقش و مرصع۔

۱۹۔ 〃 〃 کا پرنالہ سونے کا جو سلطان احمد اول نے بنوایا تھا۔ معلق۔

۲۰۔ 〃 〃 کے سلیمان اعظم کے بنوائے ہوئے پرنالہ کی حفاظت کے لئے ایک خول جو سلطان مراد چہارم نے بنوایا۔ معلق۔

۲۱۔ خانہ کعبہ کا باب التوبہ (پورا پرانا دروازہ) جب سلطان مراد ثالث نے ضروری تعمیر و مرمت کرائی تو نیا دروازہ لگوایا تھا۔

۲۲۔ خانہ کعبہ کا زردوزی کے کام کا ایک پردہ۔ جس پر آیات لکھی ہیں سونے کے تاروں سے۔ یہ باب التوبہ کے پیچھے لٹکا ہوا ہے۔

۲۳۔ سونے کا بنا ہوا دہ چوکھٹا جس میں پہلے حجر اسود رکھا تھا۔

۴۴۔ سلطان احمد ثالث (۱۷۰۳-۳۰) کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت اعلیٰ خطاطی کا نمونہ "کلمہ طیبہ"۔ اس کا فریم طلائی ہے جس میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔

۴۵۔ قرآن مجید رکھنے کے لئے تین گول اوسط سائز کے ڈبے ڈھکن دار جن پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ سلاطین آل عثمان کے دور میں ان ڈبوں میں قرآن شریف ہوتے تھے اور یہ ڈبے برکت کے لئے سلاطین کے جھنڈوں کے اوپر نصب کئے جاتے تھے۔ یہ قرآن شریف اب بھی ان ڈبوں میں ہیں اور خطاطی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

زہے نصیب! کہ ایسے مقدس تبرکات کی زیارت نصیب ہو۔ ان کمروں میں ہر چیز مطلّا و مذہّب ہے۔ جو ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں ان کی مالیت کا اندازہ مشکل ہے۔ پھر خطاطی، زردوزی اور میناکاری کے جو نمونے دیواروں اور چھت پر ہیں ان کی وجہ سے قابل دید مقام ہے۔ چمک دمک اور زینت و آرائش دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔

اسی محل کے ایک بڑے کمرے میں خطاطی کے بے مثال نمونے جمع ہیں۔ طرح طرح کے حسین و خوشنما خطوط، دور بدور مختلف قسم کے خوبصورت نمونے۔ خط طغرا کے بیحد خوشنما نمونے۔ مطلّا و مذہّب تحریریں، جلدوں کے خوبصورت نمونے۔ مختلف زمانوں کی خوشنما جلدیں پرانے ادوار کے آلات تحریر یعنی قلم، قلمدان، دواتیں، چھریاں، اسی طرح شاہی ادوار کی مہریں دھاتوں پر کندہ، نیز قیمتی پتھروں پر کندہ، انگوٹھیوں پر مہروں کے نقش۔

اس محل کو اور اس کے عجائبات کو دیکھنا کئی دن چاہتا ہے۔ باغات، رواق، کوشکیں، حمام، اسلحہ خانہ سبھی کچھ ہے۔ باغات اور کوشکوں کو سرسری دیکھا۔ کئی سلاطین اور وزراء کی کوشکیں اُسی وضع سے قائم کی گئی ہیں۔ پرانی آرائش تو نہیں ہے مگر گذشت کا انداز معلوم ہوجاتا ہے۔ صحیح ترکی دیوان کا نقشہ اور نمونہ یہیں نظر آتا ہے۔ تین اطراف میں دیوان۔ قالین کا فرش۔ ایک طرف آتش دان۔ درمیان میں بخوردان۔ کوشک رواں (مراد رابع) کوشک بغداد (مراد رابع) کوشک مصطفیٰ پاشا وغیرہ مع اپنی آرائش اور بچے کچھے تھوڑے بہت نقش و نگار کے قابل دید ہیں۔ بعض حصوں میں مرمت ہو رہی تھی، اس لئے کئی چیزیں خاص طور پر حمام نہ دیکھ سکا۔

چونکہ ہم نے الپتگین صاحب سے کہہ دیا تھا کہ ہم ہوٹل ہی میں ملیں گے اس لئے ایک بجے سے قبل ہوٹل واپس آگئے۔ ڈیڑھ بجے وہ خود ہمیں لینے آگئے۔ معلوم ہوا کہ سمندر پار استانبول

کی دوسری آبادی میں جاتا ہے۔ ویسے تو کم وقت کی وجہ سے ہم وہاں کیا جاتے دعوت کے بہانے آبادی کے اس حصے کی بھی سیر ہوگئی۔ آج گولڈن ہارن کے دوسرے پل کو عبور کیا۔ ذرا آگے بڑھے تو استقلال جدیسی آگیا۔ بہت لمبا اور بڑا بازار ہے۔ دو طرفہ چھ سات منزل عمارات ہیں جس سے مشرقیت نمایاں تھی۔ استقلال جدیسی میں ترک بھی آباد ہیں لیکن عموماً ایک طرف یہودی اور دوسری طرف ارمنی آبادی ہے۔ اسی لئے دولت کی ریل پیل ہے۔ استقلال جدیسی کے آغاز ہی میں گلاتہ سرائے اسکول ہے۔ اب تو یہ ایک عام اچھا اسکول ہے۔ بہت وسیع اور شاندار مگر اس کا نام یوں مشہور ہے کہ سلطان عبدالحمید نے اسے یورپی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا۔

دعوت میں بہت دیر ہوگئی۔ وہاں سے واپس آتے آتے چھ بج گئے۔ پھر بھی ہم نے مغرب سے قبل مسجد سلطان احمد (یا نیلی مسجد) کی زیارت کا ارادہ پورا کیا۔ نہایت وسیع اور خوشنما مسجد ہے۔ چھ مینار ہیں۔ کہتے ہیں کہ سلطان احمد نے چھ مینار بنائے تو خوش عقیدہ لوگوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس لئے کہ حرم کعبہ مکرمہ کے بھی چھ مینار تھے۔ آخر سلطان نے حرم کعبہ میں ساتویں مینار کا اضافہ کیا تو بات دبی۔

باہر بہت بڑا احاطہ ہے۔ جس کے درمیاں سے ایک سڑک جاتی ہے۔ اسی بیرونی احاطے یا میدان میں شاہ ولیم قیصر جرمنی کی آمد کی یادگار میں سلطان عبدالحمید نے ایک خوبصورت قبہ بنوایا تھا، موجود ہے۔ اس کے بالمقابل دوسری سمت دو یادگاری ستون ہیں اندرونی احاطہ میں مدرسہ موجود ہے۔ ہوسٹل بھی ہے۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ مسجد ایا سوفیہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایا سوفیا عرض و طول میں تقریباً برابر ہے۔ جامع سلطان احمد کا عرض کم اور طول زیادہ ہے۔ اس سے بھی بڑی مسجد برصہ میں ہے، جسے سلطان سلیم فاتح مصر نے بنوایا تھا۔ وہ دُنیا بھر میں یقیناً سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں جملہ مساجد تمام و کمال مسقّف ہوتی ہیں، اسی لئے گنبد در گنبد مخصوص فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ درمیانی گنبد بہرحال سب سے بڑا ہوتا ہے۔ ان بڑی مساجد میں مسجد کی چھت کو قائم کرنے کے لئے جو چار ستون بنے ہوئے ہیں وہ ایسے ضخیم اور عظیم ہیں کہ کبھی دیکھے سنے نہ تھے۔ جامع احمد میں یہ سبھی سے زیادہ ضخیم و عریض ہیں۔ مسجد کی آرائش میں نیلا رنگ، نیلی چینی، نیلے شیشے خاص طور پر

استعمال ہوئے ہیں بڑے خوبصورت نقش ونگار ہیں۔ دیکھے جائیے۔

بڑی مسجدوں کے ساتھ کے مقبرے اور مزار سلاطین، امرا، وزرار، علمار وغیرہ کے ہیں چھوٹے مقامات و مقابر و مدارس وغیرہ میں اور جانے کیسے کیسے اکابر دفن ہونگے۔ علمار، فضلار، شعرار، شرفار سبھی جانے کتنے ان پانچ سو سال میں پیوند زمین ہوچکے ہیں!!

ایا سوفیا کا حال بیان سے رہ گیا۔ یہ عیسائیوں کا نہایت مقدس گرجا تھا جسے شاہ کانسٹنٹائن نے بنوایا تھا۔ کچھ مدت بعد برباد ہوگیا۔ تو جسٹنین نے دوبارہ زیادہ مستحکم اور یادگار فن تعمیر میں بنوایا۔ کہتے ہیں کہ جب بن گیا اور شہنشاہ نے آکر دیکھا تو اتنا خوش ہوا کہ خدا سے خطاب کرکے کہا کہ میں نے تعمیر سلیمانؑ کو مات کر دیا ہے۔

جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو بہت سے گرجاؤں کو مساجد میں تبدیل کر دیا۔ یہی حال ایا سوفیا کا ہوا۔ انقلابی حکومت نے گذشتہ ۴۵ سال سے نہ مسجد رکھی نہ گرجا۔ بلکہ بازنطینی فن تعمیر کے نام سے عام زیارت کے لئے عجائب خانہ قرار دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسائیوں کے زمانے کی تصاویر کو مٹایا نہیں گیا تھا، بلکہ ڈھک دیا گیا تھا۔ اب ان کو کھولا گیا تو جوں کی توں نکلیں۔ ایا سوفیا کے باہر بھی بہت بڑا احاطہ ہے جس میں مدارس اور ہوسٹل تھے۔ کتب خانہ اب بھی ہے جس میں چالیس ہزار سے زیادہ مخطوطات ہیں۔

بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اوپر نظر اٹھاؤ تو ایک عظیم تصویر نظر آتی ہے۔ درمیان میں حضرت مریمؑ شیرخوار بچے کو گود میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک طرف کانسٹنٹائن کی شبیہہ ہے جس کے ہاتھ میں قسطنطنیہ ہے۔ دوسری طرف جسٹینین ہے جس کے ہاتھ میں ایا سوفیا ہے جسے وہ گویا حضرت مریم کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

اصل عمارت میں داخل ہونے کیلئے بہت بڑا دروازہ ہے۔ نہایت وسیع عمارت ہے۔ جامع سلطان احمد کی طرح بے حد عظیم اور شاندار۔ عیسائی گرجا اور اسلامی مسجد دونوں کی یادگاریں جمع ہیں۔ محراب، بہت اونچا شاندار منبر، واعظ کے لئے بلند مقام، دائیں طرف اوپر عورتوں کی گیلری، بائیں طرف سلطان وقت کے لئے بلند جگہ، ایک دالان یا بارہ دری، وسط سے ذرا آگے۔ بڑے بڑے جھاڑ جن میں کنول لگے ہیں محراب کے سر دو طرف اللہ اور محمدؐ۔ اوپر چار کونوں میں خلفائے راشدینؓ کے نام اور

پشت پر حسنؓ ، حسینؓ ۔

ایا سوفیا اور جامع احمد واقعی ایسی وسیع وضخیم و عریض وعظیم عمارات ہیں کہ باید و شاید ۔گنبدوں کی شان وہی ہے جو پہلے بتائی گئی ۔

اگلے دن جامع سلیمانیہ دیکھی یہ سلطان سلیمان اعظم کی یہ مسجد بھی بے حد عظیم الشان اور رفیع البنیان ہے ۔یہیں سلطان کا روضہ بھی ہے ۔ اور دیگر اکابر اور خاندان شاہی کے مزارات بھی ہیں ۔ جامع کے ساتھ بہت بڑا کتب خانہ ہے ـــ کہتے ہیں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مخطوطات ہیں ۔متعدد کتب خانوں کی کتابیں یہاں آگئی ہیں اسلئے اور بڑا ہوگیا ہے ۔ سلطان عبدالحمید نے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرواکر طبع کروادی تھیں ۔ان کی سیر کرتا رہا ۔اس کتب خانے سے متصل خطاطی کے نمونوں کا ایک چھوٹا مگر قیمتی عجائب خانہ بھی ہے ۔ اس کی بھی سیر کی ۔بہت ہی اعلیٰ خطاطی کے نمونے نظر آئے ۔قرن اول کے کلام پاک کے بھی مختلف خطوں میں نمونے موجود ہیں ۔

یہاں سے جامع سلطان محمد فاتح گئے ۔ راستے میں اسکول کے بچے مختلف لباسوں میں جاتے نظر آئے ۔معلوم ہوا آج بچوں کی عید (یا تہوار) ہے ۔ان کے اسکول میں فینسی ڈریس کی نمائش ہوگی ۔ شاہی دور کے خوبصورت لباسوں میں یہ گورے گورے صحتمند بچے اور بھی بھلے لگتے تھے ۔

جامع سلطان فاتح بہت شاندار مسجد ہے ۔اس کے احاطے میں مدرسہ بھی ہے دونوں طرف غالباً مدرسہ کے ہوسٹل ہوں گے جو اب استانبول یونیورسٹی کے ہوسٹل بن گئے ہیں ۔سلطان کا مزار بہت خوبصورت عمارت میں ہے ۔ اور حسب دستور نقش و نگار آیات وغیرہ سے آراستہ ہے ۔مزار کا تعویذ سرہانے سے پائنتی کی طرف کو ذرا ڈھلوان رکھتا ہے ۔سنگ مرمر کے تعویذ پر غلاف چڑھا ہوا تھا ۔اس مسجد کے قالین دوسری مساجد کے مقابلے میں زیادہ اچھے حال میں نظر آئے ۔مسجد میں ایک جگہ حفاظ قرأت میں مصروف نظر آئے ۔ دوسری جگہ کچھ علماء علمی مکالمات میں منہمک تھے ۔مگر اس سیر کو مختصر کرنا پڑا ۔ وقت کم اور کام بہت مجھے ترکی زبان آتی ہوتی تو شاید وقت نہ ہوتے ہوئے بھی رک کر ذرا دیر تو سنتا ۔

یہاں سے نکلے تو بس میں ساحل تک آئے ۔کل کی صبح واپسی کے لئے حیدر پاشا

جاکر سیٹ بک کرانی ہے۔ اسٹیمر کا اسٹیشن مستقل ہنگامہ ہے۔ اسٹیمر کا ٹکٹ روپیہ کے سکے جیسا ہوتا ہے۔ اسے حاصل کئے بغیر اسٹیمر کے پلیٹ فارم تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ اسٹیمر بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا ہجوم تھا مگر سب سما گئے۔ بلکہ اب بھی بہت سی جگہیں خالی ہیں۔ وہی ریل کے تھرڈ کلاس کی سی سیٹیں ہیں۔ اندر بیٹھکر محسوس ہوتا ہے کہ دھوپ کی وجہ سے شاید سردی کم ہے۔ لیکن حیدر پاشا پہنچکر وہی تیز ہوا اور سردی ملی۔ اس اسٹیشن سے ایشیا اور ترکی کی مختلف مقامات کو ریل جاتی ہے۔ ایک ریل انقرہ ہوکر حلب اور بغداد تک جاتی ہے۔ حیدر پاشا سے واپسی کی نشستیں محفوظ کراکے لوٹے تو ایک کھلا اسٹیمر ملا۔ اس میں سخت ہوا اور سردی نے مزاج درست کر دیا۔ ساحل سے علاننہ پل عبور کر کے دوسرے کنارے سے آئے۔ کنارے پر ہی ینی مسجد ہے۔ یہ بھی یہاں کی مشہور مسجدوں میں ہے۔ اس سے متصل باہر ایک اور چھتہ بازار ہے جو اس سے پہلے ذکر کئے بازار سے چھوٹا ہے، مگر پھر بھی اس میں سب کچھ مل جاتا ہے۔

تجویز ہوئی کہ باسفورس کی سیر کی جائے۔ سمندر کی اس سخت سردی اور اور ہوا میں کھلی کشتی میں سمندر کی سیر بڑی ہمت کا کام تھا۔ بیمار ہونے کی نیت نہ تھی اسلئے میں نے کشتی میں سیر کا ارادہ ملتوی کیا۔ معلوم ہوا کہ ساحل کے کنارے کنارے دور تک بس بھی جاتی ہے۔ اس لئے امینونو سے بس میں سوار ہوئے۔ ایک طرف ساحل دوسری طرف عمارات۔ واقعی دلچسپ سیر تھی۔ ساحل کے دونوں طرف سلاطین کے قصر بھی ہیں۔ انہی میں دولمہ بہچہ سرائے نامی محل بھی ہے۔ اس کی زینت و آرائش قابل دید بتائے جاتے ہیں۔ اس شاہی محل کو نہ دیکھنے کا بہت افسوس رہا، اس لئے کہ یہ بتایا گیا کہ یہاں کے کمروں میں شاہی دور کی تمام آرائش برقرار رکھی گئی ہے۔ کچھ کمرے سلاطین اور بیگمات کی رہائش کے اسی زمانے کی زینت و آرائش کے ساتھ قائم ہیں۔ اسی طرح آج بھی آدمی ان کے رہنے سہنے کے ڈھنگ اور عادات و اطوار کا اندازہ کرسکتا ہے۔ یہاں سیاحوں کے لئے ٹکٹ بھی اور سب جگہ سے زیادہ بتایا گیا۔ اگلی دفعہ آنا ہوگا تو دوسرے مقامات کے علاوہ اس کی سیر کا بھی موقع ملے گا۔ راستے میں امیرالبحر خیرالدین باربروسا کا چھوٹا مگر خوبصورت مقبرہ بھی ملا۔ اس نے

عیسائی حکومتوں کی متحدہ بحری طاقت کو شکست پر شکست دیکر عثمانیوں کی بحری برتری قائم کی تھی۔ انقرہ میں ہماری فیکلٹی سے متصل اس کا ایک مجسمہ بھی ہے۔ اس کی وفات کی تاریخ اس پر پھول چڑھائے گئے تھے اور مختصر جلسہ بھی ہوا تھا۔ واپسی پر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری دی۔ مغرب کی نماز بھی وہیں پڑھی۔

اگلی صبح واپس انقرہ جانے کے لئے حیدر پاشا آئے۔ اس دفعہ جو ٹرین ملی وہ پچھلی سے بہت خوبصورت اور آرام دہ تھی۔ واپسی پر اس نے وقت بھی کم لیا۔ استانبول کے مضافات پچیس تیس میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گھروں کے درمیان سے ریل جارہی ہے۔ دونوں طرف صرف چند گز دور گھر بنے ہوئے ہیں اور تار وغیرہ بھی کھینچے ہوئے نہیں ہیں۔ یہاں بہار انقرہ سے بہت پہلے آچکی ہے۔ پٹری کے دونوں طرف چھوٹے خوبصورت بنگلہ نما مکانات، اکثر دو منزلہ، سبزہ، درخت اور پھول۔ ذرا کہیں دائیں طرف مکانات نہ تھے تو بحیرہ مار مارا نظر آنے لگتا تھا۔ سمندر اس طرف اتنے اندر گھس آیا ہے اور بہت زیادہ وسیع اور عریض ہے۔ اور آگے ایک طرف سمندر اور دوسری طرف آبادی بہت ہی خوبصورت اور دلچسپ منظر تھا۔ گھر ختم ہوئے تو ایک طرف سمندر دوسری طرف پہاڑ۔ اب استانبول سے انقرہ ڈبل لائن بنانے کی تیاری ہے۔ راستے میں چھوٹے موٹے قصبے اور اسٹیشن کئی تھے۔ نسبتاً بڑی جگہیں صرف دو پڑیں۔ ایک IZMIT جہاں پٹرول کی ریفائنری اور بحریہ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ دوسرے ESKISEHR جہاں ریلوے کا بڑا ورکشاپ ہے۔ ریلوں کے ڈبے یہیں بنتے ہیں۔ بتایا گیا کہ ہم جس ریل میں سفر کر رہے ہیں یہیں تیار ہوئی ہے۔

سمندر، آبادی اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا تو موٹروں کی پکی سڑک ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ کبھی قریب کبھی ذرا دور ہوگئی۔ اس سڑک پر سفر بہت تھا۔ موٹر ٹرک لاریاں بہت زیادہ۔ پھر بھی ہماری شاہراہ سوری والی بات نظر نہ آئی۔ وہاں میرے خیال میں اس سے بہت زیادہ مسافرت ہے۔

المختصر استانبول کا یہ سفر نہایت مختصر تھا۔ اسلئے بہت کم تاریخی مقامات دیکھے جاسکے۔ عیسائی دور کی یادگاریں اور کھنڈر بھی بہت ہیں اور اسلامی دور کی عمارات اور مساجد ابھی بہت باقی رہ گئیں۔ آدمی آئے اور دس پندرہ دن گذارے تو حسب

دلخواہ سیر ممکن ہے۔ کتب خانوں کی سیر کے لئے بھی وقت درکار ہے۔ جب ہماری چھٹی ہوگی تو کتب خانے بھی بند ہوں گے۔ بہر حال استانبول کے حق میں یہ جملہ کچھ زیادہ ہی صادق آتا ہے کہ " ایک بار دیکھا اور بار بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

سفر قونیہ

القرہ سے قونیہ بس میں چار گھنٹے کا سفر ہے۔ ہماری بس راستے میں خراب ہوئی اس لئے ہم ساڑھے چھ گھنٹے میں پہنچے۔ قونیہ ویسے تو ایک صوبہ ہے مگر چھوٹا شہر ہے۔ ڈھائی تین لاکھ کے قریب آبادی ہے۔ سلجوقیوں کے زمانے میں دالحکومت تھا۔ اب اُس زمانے کی کوئی عمارت باقی نہیں ہے۔ شاید کہیں کوئی کھنڈر وغیرہ ہوں تو معلوم نہیں۔

شوکت بولو صاحب ہمراہ تھے وہ قونیہ آچکے ہیں لیکن راستوں اور ہوٹلوں سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ بہر حال ایک ہوٹل میں بیگ رکھ کر حضرت مولانا رومؒ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ تو معلوم تھا کہ مزار شریف بند ہوگا مگر سوچا کہ ان کی مسجد میں نماز تو پڑھ ہی لیں گے۔ وہاں ایک بچے نے بتایا کہ جمعرات کو شام کو بھی کھلتا ہے۔ ۶½ سے ۹½ بجے رات تک۔ ابھی وقت تھا اس لئے نماز کے بعد بازار کی سیر کو نکل گئے۔ چھوٹا شہر ہے۔ مین بازار یہی ہے، جو مولاناؒ کے مزار پاک سے شروع ہوتا ہے۔ صاف ستھرا، خوبصورت دکانیں، چوڑی سڑک ہے۔ دو پرانی مسجدیں راستے میں دیکھیں۔ قونیہ میں ٹیکسیوں کے علاوہ دو گھوڑوں کی فٹن بھی بہت ہیں۔ یوں تو فٹن ہر وقت چلتی پھرتی نظر آئی لیکن اتنے چھوٹے شہر میں کیا آمدنی ہوتی ہوگی جو فٹن والا دو گھوڑوں کو بھی کھلائے اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ اسی بازار میں ایک جگہ ٹیکسیوں کا اڈا ہے۔ بے شمار ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ مجھے تو دریافت پر بھی نہ معلوم ہو سکا کہ ان کو آمدنی کہاں سے ہوتی ہوگی۔ یہاں چھ سواری والی کراچی جیسی رکشائیں بھی نظر آئیں۔

مغرب کے وقت تک حضرت مولاناؒ کی مسجد میں واپس آگئے۔ مسجد چھوٹی ہے۔ مگر اسی پرانی وضع کی۔ ساری مسجد میں قالین کا فرش، جھاڑ فانوس، محراب، منبر سب اُسی طرح کے جیسے دوسری چھوٹی بڑی مسجدوں کی حسب حیثیت دیکھے تھے۔ مزار شریف پر حاضری دی۔ مسجد اور درگاہ شریف کے درمیان میں اور ارد گرد مختصر پارک ہے۔ درگاہ شریف کا بیرونی دروازہ بند ہو تو اندر جانے کا اور کوئی راستہ

نہیں۔ کھلنے کے اوقات وہی ہیں جو سرکاری دفاتر کے ہیں۔ جمعرات کو شام کو بھی کھلتا ہے۔ اندر جانے کے لئے ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ اور حکومت حال کے نزدیک اس کا نام محض عجائب خانہ ہے۔ یہی دروازے کے بورڈ پر بھی لکھا ہے۔ اندر کا صحن گذر کر مزار شریف کے گنبد تک پہنچے۔ یہاں جوتیاں اتاری گئیں۔ تو خادم نے جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا پہننے کے لئے سلیپر دئے۔ میں نے تو نہ لئے مگر چونکہ عجائب خانہ کہلاتا ہے اس لئے اوروں نے لئے۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔

ساری عمارت اور اندر باہر کا صحن سنگ مرمر کا ہے۔ اندر سارے حصے میں چھوٹے بڑے خوبصورت قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ اندر داخل ہو کر یہ صورت ہے کہ دائیں جانب اور سامنے کے حصے میں اونچے چبوترے پر مزارات ہیں۔ بائیں طرف بھی چھوٹے سے چبوترے پر دو مزار ہیں۔ ان کے پیچھے مسجد ہے۔ اور اس ساری عمارت کے محاذ میں بائیں طرف مسجد کا حصہ چھوڑ کر "محفل" ہے یعنی سماع خانہ۔ سامنے دیوار کے پیچھے دو سہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ اب اسی حصے کو محفل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسجد کے کٹہرے اور دیوار اور ان سہ دریوں کے درمیان جو کشادہ حصہ ہے۔ اب اس میں تبرکات و نوادر کا عجائب خانہ ہے۔ پہلے سماع خانے کا حصہ ہوگا "محفل" کی سہ دریوں میں صاحب سند اور دوسرے اکابر بیٹھتے ہوں گے۔ اور یہاں مطرب و قوال اور دوسرے شرکائے محفل مجھے تو خیال ہوتا ہے، کہ مسجد کی حد فاصل بعد کی ہوگی اور وہاں تک شرکاء اور سامعین کا مجمع ہوتا ہوگا۔ یہاں حضرت مولانا رومؒ کا مزار شریف موجودہ چبوترے کے وسط میں ہے، ارد گرد ان کے اہل وعیال اور خلفاء اور دوسرے اکابر کے مزارات ہیں، جن میں حضرت حسام الدین چلپیؒ حضرت سلطان ولدؒ حضرت صلاح الدین آفندیؒ۔ مولاناؒ کی زوجہ، حضرت ملکہ خاتون اور دوسرے شیوخ طریقت اور اکابر کے مزارات ہیں، سب مزارات پر سرہانے بڑے بڑے عمامے رکھے ہیں جن کے درمیان بطور کلاہ کے پتھر کے سے گول حصے نکلے ہوئے ہیں۔ اکثر عمامے سفید ہیں۔ حضرت مولاناؒ کے مزار مبارک پر سیاہ ہے۔ حضرتؒ کا مزار ڈھلوان ہے۔ سرہانے سے اونچا۔ مزار کی اس صورت کی

بابت یہ روایت ہے کہ جب حضرت سلطان ولدؒ کا جنازہ لایا گیا تو آپ کے مزار مبارک کا سر کی طرف والا حصہ بلند ہوا۔ گویا آپ نے اُن کا استقبال فرمایا۔ اسلئے یہ تعمیر پھر اسی طرح برقرار رکھی گئی۔ غالباً تقلید میں بعض خواص کے مزارات کی بھی یہی شکل قرار دی گئی۔ استانبول میں سلطان محمد فاتح کا مزار بھی اسی طرح ڈھلوان ہے۔ غالباً تبرک و تقلید میں ایسا کیا گیا ہوگا۔

عمارت کا یہ حصہ بہترین کام اور نقش و نگار سے آراستہ ہے اس چبوترے کے کونے پر سنگ مرمر کا چھوٹا سا جالی دار کٹہرا ہے جو چبوترے کے لئے حدِّ فاصل ہے۔ حضرت مولاناؒ کے مزار مبارک کے محاذ میں یہ کٹہرا چاندی کا جالی دار بنا ہوا ہے۔ یہاں کی اصل قیمتی چیز مخطوطات اور کتبے ہیں۔ دیواروں پر چاروں طرف بہترین خطاطی کے نمونے آویزاں ہیں۔ جن میں آیات، دعائیں، فقرے اور اشعار وغیرہ تحریر ہیں۔ اشعار و عبارات عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں ہیں۔ درمیان میں لکڑی کے ڈبوں میں جن میں شیشے لگے ہیں قیمتی اور قدیم مخطوطے ہیں۔

سماع خانے کے کسی دالان سے کچھ پڑھنے کی اور بانسری کی آواز آرہی تھی، نہایت ہلکی اور دلنواز۔ بتایا گیا کہ یہ ریکارڈ ہے جو بج رہا ہے۔ اول کچھ پڑھنے کی آواز تھی پھر نے کی آواز آنے لگی۔ کچھ اور دیر بعد اشعار پڑھنے کی سی آواز تھی۔ مگر جو کچھ بھی پڑھا جارہا تھا سمجھ میں نہ آیا۔ اپنے ساتھی سے میں نے پوچھا کہ کیا یہ مثنوی پڑھی جارہی ہے۔ تو انہوں نے انکار کیا کہ نہیں کچھ پرانی چیزیں گانے کے انداز میں پڑھی جارہی ہیں۔ نے کی یہ مخصوص دھن اور سُر یہیں کے لئے مخصوص بتائے گئے۔ یہ قرآت اور نغمہ صرف جمعرات کی رات ہی کو ہوتا ہے۔ اگلے دن جمعہ کی صبح کو ہم نے حاضری دی تو یہ نہ تھا۔ مسجد جو جمعرات کی رات کو بند تھی جمعہ کی صبح دیکھنے کے لئے کھلی ہیں۔

بیرونی ڈیوڑھی میں گھس کر بائیں کو ایک دروازہ ہے جو رات میں بھی بند تھا اور جمعہ کی صبح کو بھی۔ بتایا گیا کہ اس کا نام تلاوت خانہ ہے۔ غالباً حضرت مولاناؒ یہیں زاویہ نشین رہے۔ اور ذکر و تلاوت فرماتے تھے۔ بتایا یونہی گیا مگر اب تصدیق کی کوئی صورت نہیں۔ مزار شریف کے گنبد کے اندر بشمول سماع خانہ اور مسجد، قالین، جھاڑ، فانوس قندیل، کتبات، نقاشی، سب نہایت خوشنما اور دلفریب ہے۔ مزارات پر قیمتی،

کپڑے اور قیمتی کام کی چڑھی ہیں۔ جن پر آیات اور ادعیہ لکھی ہیں۔ حضرت مولاناؒ کے مزار کی چادر پر تحریریں نہایت خوبصورت اور سونے کے تاروں سے اعلیٰ خطاطی میں ہیں۔ مزارات سے محفل کو جانے کیلئے جو اونچا محراب نما دروازہ ہے۔ وہاں جو چیزیں لٹکی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک قندیل بہت اعلیٰ اور قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ شیشے کی ہے۔ اور اس پر کام بہترین کیا ہوا ہے۔ دو زنجیریں لٹکی ہوئی ہیں۔ جن کے درمیان میں گولے ہیں۔ فٹ بال سائز کے۔ یہ زنجیریں اور گولے پتھر کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ بتایا گیا کہ ایک ہی پتھر کو کاٹ کر یہ سب کچھ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح نہ معلوم کسی جانور کے انڈے جابجا لٹکے ہوئے ہیں۔ لیکن ان نوادرات کی حقیقت بتانے والا بھی کوئی نہیں۔

محفل خانے میں یا اس کے سامنے کے وسیع دالان میں جو تبرکات رکھے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ حضرت مولاناؒ کے خرقے تین۔ پیراہن تین۔ جبّے تین لمبی ٹوپیاں تین۔ حضرت سلطان ولدؒ کا جُبّہ۔ واسکٹ، رومال، روئی کی گوڑی۔ رباب۔ دائرہ۔ جھانجھ کئی عدد نَے (بانسری) بہت سی۔ سب پر غالباً نے نوازوں کے نام لکھے ہیں۔ انہی میں ایک تصویر ہے جو بے حد دلچسپ ہے۔ نقاش کا نام نہیں لکھا۔ یہ تصویر محفل کی ہے۔ یعنی فرقہ مولویہ کی محفل سماع۔ آگے پیچھے دو دالان ہیں۔ اگلے دالان میں (دیکھنے والے کے لحاظ سے) دائیں سمت تین آدمی بیٹھے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں بانسریاں ہیں ان کے مقابل دو دف والے بیٹھے ہیں۔ دونوں اطراف میں ان کی پشت پر دو دو آدمی دونوں طرف کھڑے ہیں۔ یہ سماں ہے کہ بانسری والے بانسریاں بجا رہے ہیں اور دف والے دف، اور پیچھے کھڑے ہوئے لوگ گا رہے ہیں پچھلے دالان میں محفل سجی ہوئی ہے۔ مسند نشین مسند پر تشریف فرما ہیں۔ اور سامنے دونوں جانب خاص سامعین ہیں۔ بہت اچھی تصویر ہے۔ دسمبر میں جب حضرت مولاناؒ کے عرس میں شرکت کی تو یہ فرقہ مولویہ کا رقص دیکھا اور تقریباً ایسا ہی پایا جیسا کہ مصور نے تصویر میں دکھایا ہے۔ یہ رقص جو بہت دلچسپ تھا پہلے اکثر ہوتا تھا محفلِ سماع بھی اکثر ہوتی تھی۔ اصلاحات اتاترک کے بعد یہ سب ناجائز قرار دیا گیا۔ عدنان مندریس مرحوم نے ۱۹۵۰ کے بعد صرف

عرس کے دوران ایک ہفتے کے لئے اس کی اجازت دی۔ وہی اب تک جاری ہے۔

مزارات سے ملحق جو کھلا مگر مسقّف حصہ (دالان) ہے۔ اس میں کیسوں میں بہت سے مخطوطات ہیں، جو خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں حضرت مولاناؒ کا دیوانِ کبیر جلد اول و دوم۔ حضرت سلطان ولدؒ کے دست مبارک کا لکھا ہوا مثنوی شریف کا دفتر اول۔ ایک نسخہ مثنوی کا بہت بڑے سائز پر، دفتر اول سے ششم تک مکمل۔ مثنوی کے دو اور نسخے ایک بڑے اور ایک چھوٹے سائز پر۔

مسجد میں بہترین قالینوں کے جا نماز۔ طرح طرح کے قالین ہیں۔ بے حد خوبصورت اور قیمتی۔ متعدد جانماز بکسوں میں بھی رکھے ہیں۔ مولاناؒ کے مزار کا چوبی منقش دروازہ۔ (موجودہ دروازے بھی خوبصورت ہیں اور غالباً چاندی کے ہیں) یہاں بھی بہت سے مخطوطات ہیں۔ قرآن شریف کے چھوٹے بڑے سائز میں بہت سے نسخے ہیں جو اعلیٰ خطاطی کا نمونہ ہیں۔ تفسیر حضرت ابن عباسؓ۔ الکواکب الدّریہ فی مدح خیر البریہؐ۔ خمسہ نظامی۔ دیوان کبیر۔ مثنوی کے دو نسخے۔ دیوانِ حافظ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت ابو عارف چلپیؒ کی بہت بڑی بڑی تسبیحیں۔

مزار پاک کی اس سنگ مرمر کی عمارت کے باہر بہت بڑا صحن ہے۔ اس میں کئی قبے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں کتب خانے تھے (یا اب بھی ہیں) یہ بند تھے۔ اس صحن کے ایک طرف چند کمرے ہیں۔ ان میں بھی نوادرات ہیں۔ ایک کمرے میں پرانے زمانے کے زنانہ اور مردانہ کپڑے رکھے ہیں۔ طرح طرح کی پرانی تصویریں بھی ہیں۔ یہاں تین حجرے بیحد دلچسپ ہیں۔ ایک حجرے میں ایک درویش بیٹھے ہوئے مثنوی شریف پڑھ رہے ہیں۔ سارا حجرہ پرانے زمانے کی طرز پر آراستہ ہے یعنی قالینوں کا فرش۔ ایک طرف سونے کے لئے بستر۔ ایک جگہ سماور اور چائے بنانے کا سامان دوسری طرف اسی طرح کا دوسرا رہائش سے متعلق سامان کتابیں پیالے وغیرہ۔

دوسرا برابر کا حجرہ دیکھئے تو ایک درویش کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ چونکہ قبلہ اسی سمت کو ہے اس لئے حجرے میں داخل ہونے والے کی طرف ان کا منہ ہوتا ہے۔ اچھا قد اور ڈیل ڈول ہے۔ پرانے طرز کی عبا اور لمبی ٹوپی پہنے ہوئے۔ یہ حجرہ بھی اسی طرح رہائشی ساز و سامان سے آراستہ ہے۔

تیسرا حجرہ دیکھئے تو اس میں بانسری کی آواز آرہی ہے۔ سامنے ایک پورے قد کا درویش رقص کر رہا ہے۔ دائیں طرف چھوٹے قد والی مورتیوں کی محفل سجی ہے۔ یہیں کہیں نیچے بانسری کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ نہایت آہستہ اور مدھم سروں میں۔ اس حجرے میں پوری محفل کا نقشہ ہے۔ یعنی درمیان میں ایک بزرگ سیاہ ریش مسند پر تشریف فرما ہیں۔ ان کے برابر میں ایک اور درویش بیٹھے ہیں۔ ان کے قریب کئی اصحاب رقص میں مصروف ہیں۔

یہ تینوں حجرے اور ان کا سامان اور ان حضرات کے پتلے پتلیاں بہت اچھی صنعت کا نمونہ ہیں۔ بلکہ زندہ آدمی کی شکل اور حلیہ ہے۔

یہ ہے خلاصہ مزار مبارک اور اس کے نواح کا۔ خدا ان سب بزرگوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ اور نئی نسل کو ان کا احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بقیہ صفحہ ۲۴۰

اگرچہ نفسیاتی، مارکسی، تأثراتی، جمالیاتی اور دیگر اقسام کی تنقید میں ان کی تنقید کو نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن ان کے مقالات خصوصاً اقبال سے متعلق۔ ان کی کتاب "اقبال اور محبت رسول" کو پڑھ کر ان کے تنقیدی افکار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے ادب اور فن پر تنقید کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں مختلف عنوانات قائم کر کے بصیرت افروز انداز سے عشقِ رسول کی تشریح کی ہے۔ عشق، عشقِ رسول، اطاعتِ رسول، سیرت رسول، انسانِ کامل، قرآن حکیم، ارمغان عقیدت، لغاتِ شوق جیسے موضوعات کو بڑے اچھے انداز سے سمجھایا ہے۔ کہ ادب کا مبتدی بھی اقبال اور محبت رسول کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ انداز ایک فاضل نقاد ہی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ مرحلہ صرف نصابی نقاد ہی طے کر سکتا ہے۔ جس جذبے جس خلوص سے وہ کسی موضوع کو سمجھاتے ہیں، وہ جدید اور قدیم نقاد شاید ہی انجام دے سکیں۔ ایسی ناقدانہ خصوصیات کی بنا پر پروفیسر محمد طاہر فاروقی دورِ جدید میں بھی تنقید کے روشن مینار ہیں۔ جن سے طلبہ کے علاوہ ادب کا مطالعہ کرنے والے بھی ضیا حاصل کر سکتے ہیں۔

کلامِ طاہر

نعت

آپ کے کوچے میں ہو میرا گذر یا مصطفیٰ
میری پیشانی ہو اور وہ سنگِ در یا مصطفیٰ

اس جوارِ قدس میں لِلّٰہ کیجئے باریاب
یا رسول اللہ! یا خیر البشر یا مصطفیٰ

ارمغاں شایانِ دربارِ رسالت کچھ نہیں
ہاں بس اک شرمِ گنہ اک چشمِ تر یا مصطفیٰ

رشحۂ ابرِ کرم کا ایک ہی چھینٹا ملے
میری ظلمت کی بھی ہو جائے سحر یا مصطفیٰ

آپ کا دیدار ہو ایسے کہاں میرے نصیب
ہاں اگر ہو جائے رحمت کی نظر یا مصطفیٰ

بادۂ الفت کا اک ساغر عطا کر دیجئے
ہوں بہت اب تشنہ لب تشنہ جگر یا مصطفیٰ

آپ کے جود و کرم سے ہیں دو عالم فیضیاب
اس طرف بھی ایک رحمت کی نظر یا مصطفیٰ

از رہِ لطف و کرم آپ اپنا دیوانہ کہیں
بس یہ ہو طاہر کی نیت کا ثمر یا مصطفیٰ

الفرہ ۱۹۶۹

غزلیات

(۱)

فغانِ نیم شبی کا سرور باقی ہے — کہ اضطراب دلِ ناصبور باقی ہے
نہ تاب ہے نہ تواں ہے نہ ہوش ہے نہ خرد — ہجوم جلوہ میں کس کو شعور باقی ہے
سنو زمانہ برابر جگا رہا ہے تمہیں — اٹھو کہ اب تو فقط نفخ صور باقی ہے
بہار ہے نہ خزاں کچھ عجیب عالم ہے — خوشی کی یاد کبھی بین السطور باقی ہے
نہ ہوتا پاس جو واعظ کا توبہ کر لیتے — ابھی تو پینے کو جام طہور باقی ہے

کسی کی مست نگاہی کا فیض ہے طاہر
کہ جام دوش کا اب تک سرور باقی ہے

النقرہ ۔ ۱۹۷۰ء

(۲)

آئے گا کب جواب کیا جانیں — وہ یہ دیر و شتاب کیا جانیں
کسی بیکس پہ کیا گذرتی ہے! — آپ عالی جناب کیا جانیں
وہ جو بھر بھر کے دیں تو کیوں نہ پئیں — ہم عذاب و ثواب کیا جانیں
دل کا رکھنا بھی اک عبادت ہے — وہ یہ کارِ ثواب کیا جانیں
سب گرفتارِ خوف و یاس ہیں آج — کیوں ہے یہ اضطراب کیا جانیں

منہ لگی کیسے چھوڑ دیں طاہر؟
ہم خطا و صواب کیا جانیں

النقرہ ۱۹۶۹ء

(۳)

سکّہ تمہارے نام کا کون و مکاں پہ ہے
ہے اِک قدم زمیں پہ تو اِک آسماں پہ ہے
ناہید و ماہ پر تو کبھی کہکشاں پہ ہے
اِنساں کی برتری کا نشاں آسماں پہ ہے
اندازِ گفتگو پہ ہے طرزِ بیاں پہ ہے
تاثیر منحصر نہ فقط داستاں پہ ہے
ایمان پر بن آئی ہے اب جان و دل کے بعد
ایمان ہو قبول یہ اس امتحاں پہ ہے
صدق و یقیں سے ہوتی ہے طے منزلِ حیات
کارِ جہاں نہ خطرۂ سود و زیاں پہ ہے
گلچیں کا اب نہ خوف نہ صیاد کا خطر
احسان بجلیوں کا مرے آشیاں پہ ہے
سالارِ کارواں نے دکھا دی ہیں منزلیں
نے کام حوصلے سے یہ اب کارِ رواں پہ ہے
پابوسیٔ بشر جو ہوئی ہے اسے نصیب
مہتاب کا یونہی تو دماغ آسماں پہ ہے
طاہرؔ جبینِ شوق جھکی، جھک کے رہ گئی
روشن سا اک نشان جو اُس آستاں پہ ہے

الفقرہ
۷ — ۳ — ۱۹۷۰

(۴)

قصۂ دار و رسن سننے نہ سنوانے کی بات
دل کی بازی میں یہ ہے قرباں ہو جانیکی بات
راز الفت ہے سمجھنے کی نہ سمجھانے کی بات
ن سنتا ہے بھلا دنیا میں دیوانے کی بات
گرمیٔ محفل سے تازہ ولولے بیدار ہوں
اپنے رندوں کو سناؤ پھر سے پیمانے کی بات
عذر توبہ کیا کہ ساقی آ گیا ساغر بکف
مان لیتے ہیں کبھی تو جانے پیمانے کی بات
چاک دل چاک جگر منت کش درماں نہیں
گفتگوئے بخیہ ہے بس دل کے بہلانے کی بات
پھر کہاں وہ محفلِ دوشینہ کی سرشاریاں
کون سمجھے گا ہمارے بعد پیمانے کی بات
کوئی کیا جانے نیاز و ناز کی سرگوشیاں
شمع روتی ہی رہی ہے سن کے پروانے کی بات
طاہر افسردہ بزم ناز کے قابل نہیں
بے تکی ہو جیسے شادابی میں ویرانے کی بات

الفقرہ
۱۷-۳-۱۹۷۰

رباعیات

(۱)

دھوکا ہے یہ سب ناز و نیازِ ہستی
ہے دور حقیقت سے مجازِ ہستی
کھل جائے گا ایک دن یہ عقدہ طاہر
ہو جائے گا بے صدا یہ سازِ ہستی
(آگرہ - ۱۹۳۴ء)

(۲)

نیرنگ جہاں کو اک تماشا دیکھا
نقش ہستی حباب آسا دیکھا
میں کیا کہوں تجھ سے مرتے مرتے طاہر
دنیائے دنی میں میں نے کیا کیا دیکھا
(آگرہ - ۱۹۳۴ء)